سہ ماہی

ادبیات

اسلام آباد

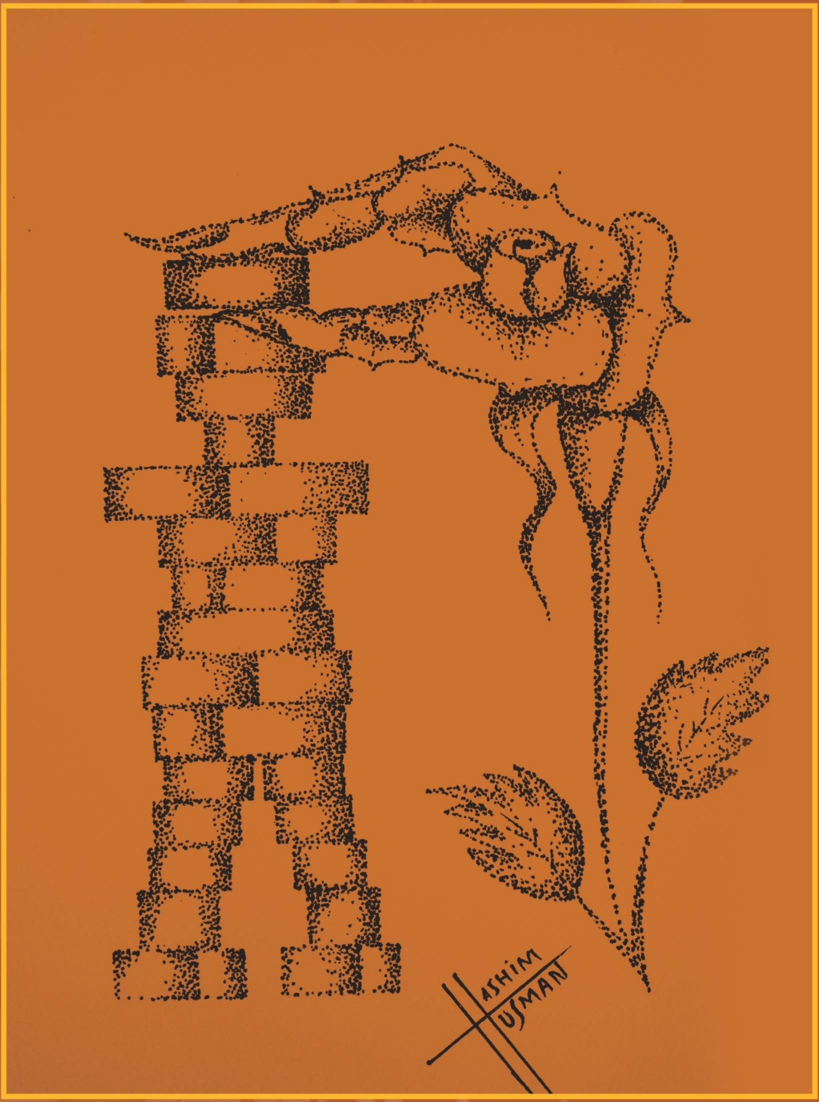
HASHIM
USMAN

اکادمی ادبیات پاکستان

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081

◆

پی ڈی ایف (PDF) کتب حاصل کرنے اور واٹس ایپ گروپ «کتاب کارنر» میں شمولیت کے لیے مندرجہ بالا نمبرز کے واٹس ایپ پہ رابطہ کیجیے۔ شکریہ

سہ ماہی

ادبیات

اسلام آباد

شمارہ نمبر 105، اپریل تا جون 2015

نگران : پروفیسر ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو (تمغۂ امتیاز)
مدیر منتظم : زاہدہ پروین

مدیر اعلیٰ : نگہت سلیم
مدیر : اختر رضا سلیمی

اکادمی ادبیات پاکستان
پطرس بخاری روڈ، سیکٹر ایچ ۔ ایٹ ون، اسلام آباد

مجلسِ مشاورتِ متن

ڈاکٹر توصیف تبسم

ڈاکٹر اقبال آفاقی

محمد حمید شاہد

ڈاکٹر وحید احمد

ضروری گزارشات

- ☆ مجلے میں غیر مطبوعہ تحریریں شامل کی جاتی ہیں جن کی اشاعت پر شکریے کے ساتھ اعزازیہ بھی اہلِ قلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے نگارشات کے ساتھ اپنا پورا نام اور پتہ بھی تحریر کریں۔
- ☆ شاملِ اشاعت نگارشات کے نفسِ مضمون کی تمام تر ذمہ داری لکھنے والوں پر ہے۔ ان کی آرا کو اکادمی ادبیات پاکستان کی آرا نہ سمجھا جائے۔
- ☆ نگارشات اِن پیج فارمیٹ میں بذریعہ ای میل اس ایڈریس پر بھیجی جا سکتی ہیں:

قیمت موجودہ شمارہ: -/100 روپے (اندرون ملک)   40 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
سالانہ (4 شماروں کے لیے) -/400 روپے (اندرون ملک)   160 امریکی ڈالر (بیرون ملک)
(رسالہ اندرون ملک بذریعہ رجسٹری اور بیرون ملک بذریعہ ہوائی ڈاک بھیجا جاتا ہے۔
ڈاک خرچ ادارہ خود ادا کرتا ہے)

طباعت: علی یاسر 051-9269712
سرکولیشن: میر نواز سولنگی 051-9269708

مطبع: NUST پریس، سیکٹر H-12، اسلام آباد

ناشر

اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد

رابطہ: 051-9269721، 051-9269714
Email: nighatsalem.dir.ce.pal@gmail.com
ar.saleemipal@gmail.com
Website: www.pal.gov.pk

فہرست

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو	اداریہ	7

سخن کے باب میں کچھ اہتمام چاہیے ہے (حمد و نعت)

خورشید بیگ میلسوی	گلاب و سرو و سمن سب عطائے ربِّ جلیل	9
ابصار عبد العلی	بنائے کائنات کبریا ہو	10
عزیز احسن	شعرِ عقیدتِ نبیؐ خوب عطا ہوا مجھے	11
علی رضا	زباں کو وصفِ درود و سلام چاہیے ہے	12

تیرا جمالِ رُخ مرے فن کی اساس ہے (غزلیات)

ظفر اقبال	شمار ہوتا ہے یا بے شمار ہوتا ہے	13
جمیل یوسف	کون ہے کس کا گرفتار نہ سمجھا جائے	14
حلیم قریشی	بیج غموں کا بو کر اس نے مجھے نہال کیا	15
صابر ظفر	میں سجدہ ریز اگر خانۂ خدا میں رہا	16
باقی احمد پوری	وہ ستم کر کے پشیماں نہیں ہونے والا	17
عزیز اعجاز	مانا اُسے پسند حریری لباس ہے	18
حسین سحر	میرے لب پر کبھی نغمے نہیں آنے والے	19
طارق نعیم	تم طلسمِ خیال ہو، کیا ہو	20
خالد علیم	ایک سکوتِ چشم و لب، دردِ شکستہ پائی کا	21
سید نواب حیدر نقوی، ڈاکٹر	ہوئے تھے وعدہ و اقرار کیا کیا	22
افضل گوہر	ماہ و انجم گئے جہاں میرے	23
سعید احمد	سورج پہ جیسے وقت کا سایہ سا ہو گیا	24
رفعت اقبال	نجم و مہ و چراغ کو یہ کیا گماں رہا	25
سعید خان	لگے بھی دل، کسی پہلو مگر سکوں بھی نہ ہو	26
عرفان ستار	مجلسِ غم، نہ کوئی بزمِ طرب، کیا کرتے	27
ناصر بشیر	اگر ہجوم نے رستہ دیا تو آؤں گا	28
احمد ادریس	کوئی چہرہ پسِ پردہ تراشا جا چکا تھا	29
اعجاز نعمانی	دل کی گلی سے وہم و گماں سے نکل گیا	30

اظہر عباس	ہوا خزاں کی چلے تو بکھر نہیں جاتا	31
سمیع جمال	ایک چہرہ جو چشمِ خواب میں تھا	32
طاہر نظامی	ہُوا ہے جب سے ترے گھر کا راستہ معلوم	33
منیر فیاض	در و دیوار کو پہچان میں رکھا ہوا ہے	34
امجد معراج	میں اس زمین کو جب آسماں بنا لوں گا	35
نعمان فاروق	خمارِ تشنہ لبی میں یہ کام کر آئے	36

لفظ کی اک لکیر کھینچتا ہوں (نظمیں)

آفتاب اقبال شمیم	پہلی دنیا کا یہ شہر (سڈنی)	37
حسن عباس رضا	آثارِ قدیمہ سے نکلا ہوا ایک نوشتہ	40
علی محمد فرشی	بندہ کی اولاد	41
زاہد مسعود	زمانہ بدل رہا ہے	43
ماہ طلعت زاہدی	ترغیب	45
احمد حسین مجاہد	جواں جسموں کی مردہ چھاؤں میں	46
محمد مشتاق آثم	عرصۂ خواب	47
محمد ظہیر بدر	مائے نی!!	48
نوید صادق	پانی! افوہ پانی	50
عبید بازغ امر	فیس بک	53
حماد نیازی	مجھے کیا چاہیے ہے	54
شبیر نازش	آغازِ صبح	56
منظور حسین کاسفؔ	نقشِ فریادی	57
عمیرہ احمد	مرے دشتِ سخن پرور	59

اک فسانہ ترے عنوان میں رکھا ہوا ہے (افسانے)

محمد الیاس	دونگیاں دی نوکری	61
آغا گل	کالی پت	65
خالد فتح محمد	دل کو دل سے راہ	73
زلیف سید	حکیم صاحب	83
شاہین عباس	ویرے کی پو	91
نجم الدین احمد	فرار	100
جانِ عالم	وارث	113
کرن شفقت	فیصلہ	115

آدم شیر چہرے کی تلاش 123

میں سرگزشتِ سفر آپ ہی سناؤں گا (خودنوشت/خاکے)

ظفر اقبال لاء کالج میں قیام 125
سلمان باسط ناسٹیلجیا 131
محمد عارف سنگم 153

زبانِ کلک و صریرِ خامہ میں بولتا ہوں (تحقیق و تنقید)

اقبال آفاقی، ڈاکٹر اڈورنو کا فلسفہ جمالیات: ایک تنقیدی جائزہ 159
محمد حمید شاہد تخلیقی عمل اور تازگی 179
ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر چھاچھی بولی: لسانی و ادبی جائزہ 183
ڈاکٹر ارشد معراج پنجابی زبان: لہجے اور بولیاں 196
قاسم یعقوب ادب اور اسلوبیات 199

ہمیں کچھ اور ہی قصہ سنایا جا چکا ہے (عالمی ادب)

گبرئیل گارشیا مارکیز/حمزہ حسن شیخ اگست کے بھوت لاطینی امریکن ادب سے 205
ایلس منرو/حمزہ حسن شیخ سُرخ لباس کینیڈین ادب سے 208
اُورحان پامُوک/نجم الدین احمد معروف ہستیاں ترکی ادب سے 220
ازابیل آلیندے/خالد فرہاد دھاریوال مینڈک کا منہ لاطینی امریکن ادب سے 243
سینٹ جان اروائن/محمد اسلم تدفین آئرش ادب سے 249

ستاروں سے بلند تر بنا دیا مجھے (خصوصی گوشہ فروغ فرخ زاد)

فروغ فرخ زاد/پرتو روہیلہ تو آفتاب بن کے چھا گیا 253
فروغ فرخ زاد/پرتو روہیلہ وہ کس کے ساتھ ہے 255
فروغ فرخ زاد/پرتو روہیلہ بعد مرنے کے 258
فروغ فرخ زاد/پرتو روہیلہ آرزو 260
فروغ فرخ زاد/پرتو روہیلہ اے ستارو 262
فروغ فرخ زاد/پرتو روہیلہ آغاز محبت 263
فروغ فرخ زاد/پرتو روہیلہ اعتراف 265

کوئی سنانے کو میں داستاں بنا لوں گا (پاکستانی زبانوں کے تراجم)

سندھی

لیاقت رضوی/شاہد حنائی دو پہروں میں لپٹی بات 267
ارشاد کاظمی/فہیم شناس کاظمی آئی بینک 269

آثم ناتھنشاہی/ابرار ابڑو نظم 270

پنجابی

وارث شاہ/رانا سعید دوشی شکوہ کردن ملکی، پیش چوچک 271
بشریٰ ناز/زاہد مسعود رنگین لفافے میں بند دلاسا 272
حنیف باوا/عامر عبداللہ میں اک پیڑ ہوں 273

پشتو

احمد دین طالب/سلطان فریدی ازل سے یہی اک محبت نہ ہوتی 275
عارف تبسم/سلطان فریدی کشمکش 276
شاہدہ سردار/شاہدہ سردار سُورا 277

بلوچی

اللہ بشک بزدار/واحد بخش بزدار کاروانِ مراد 279
منیر بادینی/شرف شاد ڈھول بتاشوں کا انجام 280
غنی پہوال/غنی پہوال تحفہ 284

سرائیکی

سعید اختر/خورشید ربانی پریت/پھل 286
مخمور قلندری/شہاب صفدر ماما حقو 287
ڈاکٹر گل عباس اعوان/گل عباس اعوان تکمیل 289

براہوی

پروفیسر عبدالرزاق صابر/رمان منصور پالش کرنے والا بچہ 293
امیر الملک مینگل/رمان منصور قطرہ 295

گوجری

ارشد علی، پروفیسر/غلام سرور رانا ماں 297
ارشد علی، پروفیسر/غلام سرور رانا جادوگر 298

ہندکو

محمد حنیف/محمد حنیف جنگل میں 299

☆☆☆☆

اداریہ

ادب کسی بھی معاشرے کا بہترین عکاس ہوتا ہے۔ کسی قوم کی داخلی تاریخ سے آگاہی حاصل کرنی ہو تو اس کے ادب کا مطالعہ کرنا چاہیے کیوں کہ ایک تاریخ دان، کسی خوف، لالچ یا کسی اور مصلحت کے تحت جن واقعات سے صرف نظر کر دیتا ہے وہ ایک ادیب، شاعر اور دانشور کسی اور پیرائے میں آشکار کر دیتا ہے۔ ادبیات کے زیر نظر شمارے میں بھی آپ اپنا ارد گرد بآسانی تلاش کر سکتے ہیں۔

گزشتہ شمارے میں ہم نے ادبیات میں تحقیق و تنقید کے لیے الگ سے ایک حصہ مختص کرنے کا عندیہ دیا تھا، جس میں ایچ ای سی کے قواعد و ضوابط کے مطابق تحقیقی و تنقیدی مقالے شائع کیے جانے تھے تاکہ دیگر تحقیقی مجلوں کی طرح ادبیات بھی ایچ۔ ای۔ سی کی فہرست میں شامل ہو سکے۔ لیکن بعض ادبی حلقوں کی طرف سے یہ رائے سامنے آئی ہے کہ ادبیات سرکاری طور پر شائع ہونے والا واحد ادبی جریدہ ہے جس میں ادبی تخلیقات شائع ہوتی ہیں جب کہ تحقیقی و تنقیدی جریدے کئی یونیورسٹیاں شائع کر رہی ہیں اس لیے اس میں تحقیق و تنقید کے لیے ایک بڑا حصہ مختص کرنے کی صورت میں تخلیقی ادب کے لیے گنجائش مزید کم رہ جائے گی۔ چناں چہ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اس مقصد کے لیے علاحدہ سے ایک جریدے کا اجرا کیا جائے گا جو مکمل طور پر تحقیقی و تنقیدی مقالوں پر مشتمل ہوگا جب کہ ادبیات کی موجودہ صورت برقرار رہے گی۔

موجودہ شمارے میں جہاں حسب روایت؛ غزلیں، نظمیں، افسانے اور مضامین شامل ہیں، وہیں

خودنوشت سوانح عمری کے لیے الگ سے ایک گوشہ مختص کیا گیا ہے۔

ہماری کوشش ہوگی کہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے۔ فارسی کی ممتاز شاعرہ فروغ فرخ زاد کے لیے بھی ہم نے الگ سے ایک گوشہ مختص کیا ہے۔ اس شمارے میں عالمی ادب سے تراجم کے ساتھ ساتھ پاکستانی زبانوں سے تراجم بھی شامل ہیں۔ یوں ادبیات کا یہ شمارہ صرف اردو ادب ہی کا نہیں بل کہ پاکستانی ادب کا نمائندہ جریدہ ہے۔

ہمیں امید ہے آپ کو ہماری یہ کاوش پسند آئے گی۔

ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو

خورشید بیگ میلسوی

حمد

گلاب و سرو سمن سب عطائے ربِّ جلیل
یہ خار زار و چمن سب عطائے ربِّ جلیل

اسی کے دستِ ہُنر کا کمال ہفت افلاک
یہ دشت و کوہ و دمن سب عطائے ربِّ جلیل

یہ عرش و کرسی و لوح و قلم، یہ حرف و بیاں
یہ فکر و فن، یہ سخن سب عطائے ربِّ جلیل

یہ مُشک و عنبر و ریحاں، یہ لولو و مرجاں
عقیق و لعلِ یمن سب عطائے ربِّ جلیل

یہ فاختہ یہ کبوتر یہ باز یہ چڑیاں
یہ عندلیبِ چمن سب عطائے ربِّ جلیل

یہ نطق و لب، یہ شعور و خیال و ذہن و خرد
زبان و قلب و دہن سب عطائے ربِّ جلیل

یہ کہکشائیں، یہ مہتاب و انجم و خورشید
یہ خاک داں یہ گگن سب عطائے ربِّ جلیل

ابصار عبدالعلی

نعت

بِنائے کائناتِ کبریا ہو   یہ حق ہے تمؐ زعیم الانبیا ہو
تمہیؐ تو کائناتِ دینِ حق ہو   تمہیؐ تو مقصدِ ارض و سما ہو
تمہی ہو آسمانِ علم و دانش   تمہیؐ تاجِ امیرالاذکیا ہو
ہدایت، رُشد، تلقیں، وعظ ہو تم   عمل، خیر العمل، خیرالوریٰ ہو
ہے قرآں، نُسخۂ امراضِ آدم   تم اس نسخہ میں تفسیرِ شفا ہو
تمہیؐ انسانیت کا ہو تسلسل   تمہیؐ تو انتہائے ارتقاء ہو
تمہیؐ ہو بندگی کا استعارہ   سراپا عشق، معراجِ وفا ہو
تمہیؐ ہو اعتمادِ ذاتِ مومن   تمہیؐ مومن کے دل میں حوصلہ ہو
تمہیؐ تو اعتبارِ دینِ حق ہو   مصدق، مصطفیؐ ہو مجتبیٰؐ ہو
شجر ہو گلستانِ دینِ حق کا   تمہیؐ دنیا کے پھل کا ذائقہ ہو
نشانِ منزلِ حق بھی تمہیؐ ہو   تمہیؐ زادِ سفر ہو راستہ ہو
جو رستہ خیر کی جانب رواں ہے   اسی رستہ کا تمؐ سیدھا پتا ہو
نہیں دیکھا کبھی گمراہ ہوتے   تمہارےؐ ساتھ جو بندہ چلا ہو
ابد تک روشنی ہی روشنی ہو   ابد تک روشنی کا سلسلہ ہو
جسے محبوب دنیا نے بنایا   خدا کو جو ہے بھائی وہ ادا ہو
یہی پیغام ہے سب کو تمہاراؐ   بھلا کر، تا کہ تیرا بھی بھلا ہو
ضمانت بخششِ مومن کی ہو تمؐ   گنہ گاروں کے حق میں تمؐ دعا ہو
بظاہر تمؐ ہو انساں جیسے ہم ہیں   رسالت اور تقویٰ میں سوا ہو
تمہیؐ تو انتخابِ آخری ہو
تمہیؐ تو ذاتِ اوّل کی رضا ہو

عزیزؔ احسن

نعت

شعرِ عقیدتِ نبیؐ خوب عطا ہوا مجھے
شکر، ہزار شکرِ رب، رزقِ ثنا ملا مجھے
عشقِ مجاز کا طلسم، جلد ہی محو ہو گیا
شوقِ نوشتِ نعت نے ایسا مزا دیا مجھے
صرف مُطاع ہیں نبیؐ ان کے سوا کوئی نہیں
راہِ عمل میں چاہیے آپؐ کا نقشِ پا مجھے
حُبِّ نبیؐ نے کھول دی راہِ نعوت کلک پر
ذکرِ نبیؐ نے کر دیا، درد سے آشنا مجھے
شوکتِ سنجر و سلیم، جچتی نہیں نگاہ میں
عشقِ بلالؓ دے گیا ایسا اک آئنہ مجھے
بے عملی کا ہے مرض، اس سے نجات کے لیے
پیرویِ رسولؐ کی دے دے کوئی دوا مجھے
دعویٔ عشق کا فقط ایک عِیار ہے، عمل
عہدِ صحابۂ نبیؐ درس یہ دے گیا مجھے
جذبۂ خندق و حنین کاش نصیب ہو سکے
طولِ امل کے درد سے چاہیے اب شِفا مجھے
نغمۂ عشقِ مصطفیٰؐ اپنی جگہ عزیزؔ من
بے عملی بنا گئی شیر بساط کا مجھے

☆☆☆☆

علی رضا

نعت

زباں کو وصفِ درود و سلام چاہیے ہے
نظر کو روضۂ خیرالانامؐ چاہیے ہے
اِسی میں راز ہے پنہاں مری فضیلت کا
مجھے غلاموں میں ادنیٰ مقام چاہیے ہے
کچھ اس لیے بھی مدینے کی رہ گزر میں ہوں
کہ مجھ کو لذتِ کیفِ دوام چاہیے ہے
یہ بارگاہِ رسالت ہے، ہر قدم پہ یہاں
نگاہِ شوق بہت احترام چاہیے ہے
وہ جس دیار میں مسکن ہے میرے آقاؐ کا
تمام عمر وہیں تو قیام چاہیے ہے
خدائے لوح و قلم! مدحتِ نبیؐ کے لیے
سخن کے باب میں کچھ اہتمام چاہیے ہے
اُنھی کے کوچے میں کٹ جائے زندگی کہ مجھے
فضائے شہرِ مدینہ مدام چاہیے ہے
نہ چاہیے مجھے دنیا میں مرتبہ کچھ بھی
جو چاہیے تو گداؤں میں نام چاہیے ہے
عجیب کیفِ عبادت ہے اُنؐ کے روضے پر
اُسی فضا میں سجود و قیام چاہیے ہے
جہاں میں بھی مری نسبت رہی ہے ان سے رضا
اسی حوالے سے محشر میں نام چاہیے ہے

ظفر اقبال

شمار ہونا ہے یا بے شمار ہونا ہے
یہی ہمارا نہ ہونا ہزار ہونا ہے
لگی ہوئی ہے جو آنکھوں میں تیری آمد و رفت
ابھی تو دل نے ترا رہگوار ہونا ہے
جہاں جہاں نہیں امکان تیرے آنے کا
وہاں وہاں بھی ترا انتظار ہونا ہے
رُکیں گے کیا ترے دریا کے درمیان میں ہم
کہ آر ہونا ہے یا ہم نے پار ہونا ہے
ابھی تو دل نے اٹھانا ہے اور بھی نقصان
ابھی تو اور بہت کاروبار ہونا ہے
ہمارے خواب نے چلنا ہے کارواں بن کر
ہماری خاک نے آخر غبار ہونا ہے
کبھی تو کرنا پڑے گا ہمارے ساتھ انصاف
کبھی تو آپ نے ایمان دار ہونا ہے
یہ عُمر بیت چکی ہے تو اب کہیں جا کر
زمانہ اپنے لیے سازگار ہونا ہے
ظفؔر کے ہاتھ بھی خالی ہیں اور دل بھی، مگر
اُسی نے آپ کا اُمیدوار ہونا ہے

☆☆☆☆

جمیل یوسف

کون ہے کس کا گرفتار نہ سمجھا جائے
یہی بہتر ہے یہ اسرار نہ سمجھا جائے

میں نے کب دنیا میں آنے کی تمنا کی تھی
مجھ کو دنیا کا طلب گار نہ سمجھا جائے

ساری دنیا کو بدلنا کوئی آسان نہیں
کسی دیوانے کو بے کار نہ سمجھا جائے

اس کو باطن سے سروکار ہے ظاہر سے نہیں
دین کو رونقِ بازار نہ سمجھا جائے

اک یہی بات تو ہے اس میں سمجھنے والی
مجھے کافر اسے دیں دار نہ سمجھا جائے

تیری دنیا میں ترے حسن کا شیدائی ہوں
اے خدا مجھ کو گنہگار نہ سمجھا جائے

نوع انساں کی بڑائی کا تقاضا ہے یہی
رنگ اور نسل کو معیار نہ سمجھا جائے

☆☆☆☆

حلیم قریشی

بیج غموں کا بو کر اُس نے مجھے نہال کیا
گھر خالی تھا اِس دولت سے مالا مال کیا

ہجر کی لمبی بے زاری نے ایک کمال کیا
میری موت سے پہلے اُس نے وصل بحال کیا

ایک تو اُس کا غم ایسا ہے جس کا توڑ نہیں
کچھ دنیا نے اس کا سپنا اور محال کیا

اُس نے جب زُلفیں کھولیں تو شام کے سورج نے
وقت سے پہلے دھول اُڑائی اور زوال کیا

عشق میں اُس کو قید ہماری جب سے ہوئی عزیز
ہم نے دامن تار کیا اور اُس کو جال کیا

میر سے غم آزاد ہوا تو کچی عمر میں تھا
ہم نے جب اُس کو اپنایا شاخ سے ڈال کیا

ایک انوکھے پن کی خاطر ساری عمر حلیم
خود کو اپنی قید میں رکھا اور یہ حال کیا

☆☆☆☆

صابر ظفر

میں سجدہ ریز اگر خانۂ خُدا میں رہا
خُدا گواہ کہ زندانِ ماورا میں رہا

اگر قریبِ رگِ جاں تھا واقعی کوئی
تو کیا وہ ساتھ تھا میرے، مَیں جب خلا میں رہا

کسی کے پاس نہ تھی کوئی سانس میرے لیے
کِھنچا جو طوق تو مَیں جھولتا ہُوا میں رہا

یہ ہست و بُود تھے یکساں تِری جُدائی میں
بس اس قدر مجھے اثبات تھا کہ لا میں رہا

مَیں اُس سے دُور اُسے دیکھتا تھا حسرت سے
مِرا خُدا، مِری چھینی ہوئی دُعا میں رہا

نہ جان پائے ہم اک دوسرے کا حال ظفؔر
مَیں خامشی میں رہا اور وہ صدا میں رہا

☆☆☆☆

باقی احمد پوری

وہ ستم کر کے پشیماں نہیں ہونے والا
سخت کافر ہے مسلماں نہیں ہونے والا

ایک دن کھینچ کے لانا ہی پڑے گا اُس کو
یُوں علاجِ غمِ ہجراں نہیں ہونے والا

اِک دیا شہر میں جلتا ہے اگر تو کیا ہے
اک دیے سے تو چراغاں نہیں ہونے والا

تنگ آیا ہوں بہت عشق و جنوں کے ہاتھوں
اور اب چاک گریباں نہیں ہونے والا

بھول جانے کی میں کوشش تو کروں گا لیکن
کام مشکل ہے یہ آساں نہیں ہونے والا

تیرے آنے سے بہاریں بھی چلی آئیں گی
ورنہ یہ دشت گلستاں نہیں ہونے والا

داغِ دل اپنا ستاروں کی طرح ہے باقیؔ
رات سے پہلے نمایاں نہیں ہونے والا

☆☆☆☆

عزیز اعجاز

مانا اُسے پسند حریری لباس ہے
میں کیا کروں کہ میں نے اُگائی کپاس ہے
خالِ عذار، عارض و رُخسار، چشم و لب
تیرا جمالِ رُخ مرے فن کی اساس ہے
اُس نے کہا کہ دل میں کوئی رہ گئی خلش
میں نے کہا کہ ہاں ترے ملنے کی آس ہے
شاید سمجھ سکے نہ کوئی میری کیفیت
میں مسکرا رہا ہوں مرا دل اُداس ہے
حیراں ہیں سب کہ آج مرے ساتھ تُو نہیں
لوگوں کا اک ہجوم مرے آس پاس ہے
میں بدگماں نہیں ہوں تیرے عہدِ وصل سے
مجھ کو تو آس ہے مرا دل محوِ یاس ہے
فرصت ملے تو دیدہ و دل فرشِ راہ ہیں
تم سے بصد نیاز مرا التماس ہے
جھرمٹ میں چُن کے تُو نے کیا اُس کا انتخاب
گویا عزیزؔ تُو بھی ستارہ شناس ہے

☆☆☆☆

حسین سحر

میرے لب پر کبھی نغمے نہیں آنے والے
زرد شاخوں پہ شگوفے نہیں آنے والے
مدتوں اشک رہے ابر کی صورت دل میں
یونہی آنکھوں میں یہ قطرے نہیں آنے والے
عمر بھر راہ تکا کرتی ہیں خالی آنکھیں
کس لیے لوٹ کے آتے نہیں آنے والے؟
ان ملاقاتوں کے لمحوں کو غنیمت جانو
لوٹ کر پھر تو یہ لمحے نہیں آنے والے
جن کی نظروں میں کشش رکھے نہ آب و دانہ
جال میں ایسے پرندے نہیں آنے والے
بادباں جن کے نہ واقف ہوں ہوا کے رخ سے
ساحلوں پر وہ سفینے نہیں آنے والے
اپنے بازو پہ بھروسا ہمیں کرنا ہوگا
خود بخود ہاتھ خزینے نہیں آنے والے
خود ہی کرنا ہے ہمیں اپنے مسائل کا علاج
آسمانوں سے فرشتے نہیں آنے والے
رات کی رات مسلط ہے سحرؔ تاریکی
صبح کے بعد اندھیرے نہیں آنے والے

☆☆☆☆

طارق نعیم

تم طلسمِ خیال ہو، کیا ہو
کوئی زُہرہ جمال ہو، کیا ہو
آرزو ہو کوئی جو پوری نہ ہو
حسرتِ لازوال ہو، کیا ہو
آئینہ دیکھ دیکھ حیراں ہے
آپ اپنا جمال ہو، کیا ہو
اک پری سی جھلک دکھاتے ہو
خواب ہو یا خیال ہو، کیا ہو
دھیان رہتا ہے کیوں تمہاری طرف
رفت گاہِ خیال ہو، کیا ہو
کھلنے پاتی نہیں ہے کیفیّت
ہجر ہو یا وصال ہو، کیا ہو
حل نہیں ہو رہے ہو تم مجھ سے
کوئی مشکل سوال ہو، کیا ہو
پوچھتے ہیں فرشتے آدمی ہو
آدمی کی مثال ہو، کیا ہو

☆☆☆☆

خالد علیم

ایک سکوتِ چشم و لب، درد شکستہ پائی کا
کتنا طویل ہو گیا، دور تری جدائی کا

تم مرے رُوبرو کبھی آئے تھے یوں کہ جس طرح
رات کے زرد چاند پر داغ، سحر نمائی کا

چلتے ہوئے جو ساتھ ساتھ بھیڑ میں کھو گیا کہیں
پھر نہ پلٹ کے آ سکا ہاتھ میں ہاتھ بھائی کا

عشق شکست کھا گیا شکوہ گزار آنکھ سے
ایک ہی رَو میں کھل گیا بھید جنوں قبائی کا

فرصتِ ہجر کے لیے اتنی شدید ضد کہ بس
یاد ہے میرے ہاتھ کو زور تری کلائی کا

جو بھی ہیں پیچ و خم سو ہوں، مہلتِ یک نفس کے
بار اُٹھائے ذہن پر! دل کی گرہ کشائی کا

یہ ہے تری سرشت اگر، کوئی صلہ طلب نہ کر
خالدِ کم نظر! خموش، وقت گیا بھلائی کا

☆☆☆☆

ڈاکٹر سید نواب حیدر نقوی

ہوئے تھے وعدہ و اقرار کیا کیا
پھر ان پر یار کا اصرار کیا کیا

نہیں دار و رسن کی آزمائش
کو نخلِ غم پہ آیا بار کیا کیا

ہے دل زخمی فریبِ دوستاں سے
بنے ہیں اپنے بھی اغیار کیا کیا

ہوئے تھے خاک ہم اک ہی نظر میں
ہمیں تھی حسرتِ دیدار کیا کیا

کبھی اپنوں کبھی غیروں کی الجھن
رہا دل بہ سرِ پیکار کیا کیا

چلن اس نے نہ بدلا بے رُخی کا
ہوئی تھی یار سے تکرار کیا کیا

وہی احوال گلشن کا ہے راہیؔ
کو روئی نرگس بیمار کیا کیا

☆☆☆☆

افضل گوہر

ماہ و انجم گئے جہاں میرے
ہیں وہیں سارے رفتگاں میرے

خاک سے پوچھ کر بتاؤں گا
خال و خد ہیں کہاں کہاں میرے

میں بھی تیری زمیں کا حصہ ہوں
اب چھلک مجھ پہ آسماں میرے

جیسے تقسیم ہو گیا ہوں میں
تُو بھی بٹ جائے گا مکاں میرے

جنگ تو دوسروں کی تھی گوہرؔ
اور مارے گئے جواں میرے

☆☆☆☆

سعیداحمد

سورج پہ جیسے وقت کا سایہ سا ہو گیا
وہ جو کبھی الاؤ تھا شعلہ سا ہو گیا

چھوٹی سی ایک یاد کا دیپک جلا کہیں
قرب و جوارِ دل میں اندھیرا سا ہو گیا

اب ٹوٹتے ہیں غم تو برتی نہیں یہ آنکھ
کہنے کو زندگی کا سلیقہ سا ہو گیا

اک عمر انعکاسِ تمنّا کا ہے صلہ
آئینہ خود بھی عکسِ تمنّا سا ہو گیا

جھلکی سی دیکھ لی کسی ماضی کے خواب کی
برسوں کے بعد سانس لی زندہ سا ہو گیا

جھڑتے ہیں ساتھ ساتھ جہاں پھول اور خواب
اس شہر سے ہمیں بھی علاقہ سا ہو گیا

☆☆☆☆

رفعت اقبال

نجم و مہ و چراغ کو یہ کیا گماں رہا
سورج تو اپنی موج میں ڈوبا رواں رہا

اک آسماں کی خاک تھی جُز اور کیا کہوں
کس جا بسر کی عُمرِ گزشتہ کہاں رہا

رُخصت کے وقت ضامنی ایسی ہوئی عطا
بے خوفِ دشمناں ہی رہا میں جہاں رہا

کُھلتا نہیں تھا عقدۂ ہستی کسی طرح
جب تک ترا جمال نظر سے نہاں رہا

تصویر کارنس پہ رکھی رہ گئی تری
آباد تیرے عکس سے سارا مکاں رہا

☆☆☆☆

سعیدخان

لگے بھی دل، کسی پہلو مگر سکوں بھی نہ ہو
لہو میں اس قدر آمیزشِ جنوں بھی نہ ہو

کیا ہے جیسے محبت نے دربدر ہم کو
کوئی کسی کی طلب میں خراب یوں بھی نہ ہو

لہو رُتوں میں کہاں سے میں فاختہ کے لیے
وہ شاخ لاؤں کہ جس پر نشانِ خوں بھی نہ ہو

وہ زخم کیا جو کسی جاں کو روشنی بھی نہ دے
وہ رنج کیا جو روایت گرِ جنوں بھی نہ ہو

وصال و ہجر کے نشے بدل کے دیکھ لیا
قرار یوں بھی نہ آئے، قرار یوں بھی نہ ہو

ہمیں تو عشق عبادت کا معجزہ ہے سعیدؔ
عزیزِ جاں ہیں وہ سجدے کہ سرنگوں بھی نہ ہو

☆☆☆☆

عرفان ستار

مجلسِ غم، نہ کوئی بزمِ طرب، کیا کرتے
گھر ہی جا سکتے تھے آوارۂ شب، کیا کرتے
یہ تو اچھا کیا تنہائی کی عادت رکھی
تب اسے چھوڑ دیا ہوتا تو اب کیا کرتے
روشنی، رنگ، مہک طائرِ خوش لحن، صبا
تُو نہ آتا جو چمن میں تو یہ سب کیا کرتے
دل کا غم دل میں لیے لوٹ گئے ہم چپ چاپ
کوئی سنتا ہی نہ تھا شور و شغب کیا کرتے
بات کرنے میں ہمیں کون سی دشواری تھی
اُس کی آنکھوں سے تخاطب تھا سو لب کیا کرتے
کچھ کیا ہوتا تو پھر زعم بھی اچھا لگتا
ہم زیاں کار تھے، اعلانِ نسب کیا کرتے
دیکھ کر تجھ کو سرہانے ترے بیمارِ جنوں
جاں بلب تھے، سو ہوئے آہ بلب، کیا کرتے
تُو نے دیوانوں سے منہ موڑ لیا، ٹھیک کیا
ان کا کچھ ٹھیک نہیں تھا کہ یہ کب کیا کرتے
جو سخن ساز چراتے ہیں مرا طرزِ سخن
ان کا اپنا نہ کوئی طور، نہ ڈھب، کیا کرتے
یہی ہونا تھا جو عرفان ترے ساتھ ہُوا
منکرِ میر بھلا ترا ادب کیا کرتے

ناصر بشیر

اگر ہجوم نے رستہ دیا تو آؤں گا
میں سرگزشتِ سفر، آپ ہی سناؤں گا
سُبک سری میں سہی، نام تو کماؤں گا
میں تیرے واسطے دنیا کے ناز اُٹھاؤں گا
اگر یہ دھوپ ترا جسم چھونے آئے گی
میں بادلوں کو تیری چھت پہ کھینچ لاؤں گا
میں آج آنکھ سے ٹپکا ہوں اور گال پہ ہوں
کل آسمان پہ جاؤں گا، جگمگاؤں گا
میں دیکھ لوں گا کہ ہے کون کون دوست مرا؟
میں جان بوجھ کے تھوڑا سا لڑکھڑاؤں گا
ذرا سی دیر رہوں گا تمہاری محفل میں
پھر اپنے جیسے ہی لوگوں میں لوٹ جاؤں گا
میں چُپکے چُپکے نہ بیچوں گا خونِ دل اپنا
گلی میں نکلوں گا، آواز بھی لگاؤں گا
ذرا سی اور پلاؤ کہ ہوش آئے مجھے
نہیں پیوں گا تو کچھ اور ڈگمگاؤں گا
مرا جنون ہے مجنوں سے کچھ الگ ناصرؔ
سو اپنے واسطے صحرا بھی خود بناؤں گا

☆☆☆☆

احمد ادریس

کوئی چہرہ پسِ پردہ تراشا جا چکا تھا
کہ جو کچھ ہونے والا تھا وہ لکھا جا چکا تھا

حقیقت اور تھی جو بعد میں ہم پر کھلی تھی
ہمیں کچھ اور ہی قصہ سنایا جا چکا تھا

ہمارے فیصلے اندھوں کو سونپے جا چکے تھے
بساطِ عدل کو یکسر لپیٹا جا چکا تھا

ہمیں معتوب کر دینا روایت بن چکی تھی
کوئی نشتر رگ و پے میں اتارا جا چکا تھا

انھیں اِک بار پھر سونپی گئی مسند نشینی
وہی غاصب کہ جن کو آزمایا جا چکا تھا

☆☆☆☆

اعجاز نعمانی

دل کی گلی سے وہم و گماں سے نکل گیا
وہ شخص رفتہ رفتہ یہاں سے نکل گیا

پتھر پہ کھینچی جائے ہے جیسے کوئی لکیر
وہ ہو گیا جو میری زباں سے نکل گیا

اُس غم کا بوجھ ہے مرے سینے پہ آج تک
سوچا تھا میں نے اشکِ رواں سے نکل گیا

دیوار و در سے تو یہی لگتا ہے آج کل
جیسے کوئی شکستہ مکاں سے نکل گیا

خود کو وہاں پہ دیکھ کر آیا ہوں میں ابھی
حیران ہوں میں کیسے کہاں سے نکل گیا

☆☆☆☆

اظہر عباس

ہوا خزاں کی چلے تو بکھر نہیں جانا
کہ زخمِ ہجر کی وحشت سے مر نہیں جانا

کچھ ایسے کام لیے پھر رہے ہیں ساتھ ہمیں
کبھی کبھی تو یہ لگتا ہے گھر نہیں جانا

میں روز اس کی گلی جا کے خوار ہوتا ہوں
یہ روز سوچتا ہوں اب اُدھر نہیں جانا

تمام عمر جو خالی رہا ہے کاسۂ دل
کسی کی ایک نظر سے تو بھر نہیں جانا

میں خود بھی ٹھیک سے سمجھا نہیں ہوں اپنا خواب
سو میرے دوست مرے خواب پر نہیں جانا

☆☆☆☆

سمیع جمال

ایک چہرہ جو چشمِ خواب میں تھا
عکس اس کا ہر اک گلاب میں تھا

سکھ کے سپنے تھے اس کی آنکھوں میں
دکھ تو سارا مرے حساب میں تھا

ہم نفس مجھ سے بے رخی کے بعد
مبتلا خود بھی اک عذاب میں تھا

اک فسانہ جسے کہیں چاہت
نا مکمل ہر اک کتاب میں تھا

نشہ جو اس کی آنکھ میں تھا جمالؔ
وہ بھلا کب کسی شراب میں تھا

☆☆☆☆

طاہر نظامی

ہُوا ہے جب سے ترے گھر کا راستہ معلوم
پھر اس کے بعد مجھے کچھ نہیں رہا معلوم
ہُوا سے برسرِ پیکار جو رہا شب بھر
چراغ بُجھ کے بھی جلتا ہُوا، ہوا معلوم
ابھی ہے کتنا ترے انتظار کا موسم
جو مَیں نے پوچھا تو کہنے لگا، خدا معلوم
وصال کیا ہے، کسے ہجر لوگ کہتے ہیں
مجھے تو ایک سا ہوتا ہے ذائقہ معلوم
اسے بھی لگ گئی آخر ہَوا زمانے کی
اسے بھی ہو گیا معلوم جو تھا، نامعلوم
کسی ستارۂ شب ہی سے پوچھ لیتا ہوں
اسے تو ہوگا مرے چاند کا پتا معلوم
ترے بغیر کیا تیرے قُرب کو محسوس
ترے قریب ہوا ایک فاصلہ معلوم
زمینِ شاؔد میں لکھیں گے کیا غزل طاہؔر
ردیف کی ہے خبر اور نہ قافیہ معلوم

☆☆☆☆

منیر فیاض

در و دیوار کو پہچان میں رکھا ہوا ہے
گھر کا نقشہ کسی امکان میں رکھا ہوا ہے

طاق میں رکھے ہوئے ہیں ترے احساس کے پھول
تیری تصویر کو گلدان میں رکھا ہوا ہے

حجرۂ شب سے نکلتی ہوئی اک ساعت نے
لوٹ آنے کو بھی امکان میں رکھا ہوا ہے

بادِ آوارہ، بھٹکتے ہوئے دو چار خیال
اور کیا میرے شبستان میں رکھا ہوا ہے

اک کہانی مرے کردار سے تعبیر ہوئی
اک فسانہ ترے عنوان میں رکھا ہوا ہے

کوئی تعبیر برابر کی ملے تو جانوں
کب سے اک خواب کو میزان میں رکھا ہوا ہے

ہجر در ہجر بھٹکتے ہوئے پل نے فیاضؔ
خطۂ قرب کو بھی دھیان میں رکھا ہوا ہے

☆☆☆☆

امجد معراج

میں اس زمین کو جب آسماں بنا لوں گا
تو اس وجود کو بھی سائباں بنا لوں گا

تو اپنے گاؤں کی چوپال کو سجا تو سہی
کوئی سنانے کو میں داستاں بنا لوں گا

شبِ سیاہ تری خامشی سے تنگ آ کر
کسی چراغ کی لَو کو زباں بنا لوں گا

میں اپنے جسم پر جتنا بھی انحصار کروں
ذرا سی خاک سے کیا خاک داں بنا لوں گا

میں اپنے شوق کی تکمیل کے لیے امجدؔ
کسی بھی وقت کوئی کہکشاں بنا لوں گا

☆☆☆☆

نعمان فاروق

خمار تشنہ لبی میں یہ کام کر آئے
ہم اپنی پیاس کو دریا کے نام کر آئے

ہمارے لمس کا صندل مہکنے والا ہے
خبر یہ ہم بھی درختوں میں عام کر آئے

اسے گلے سے لگانا تو خواب ٹھہرا ہے
یہی بہت ہے جو اس سے کلام کر آئے

تمہاری یاد کی چھاؤں میں دن گزارا ہے
تمہارے ذکر کے سائے میں شام کر آئے

کچھ اور ہو نہ سکا ہم سے اس جہاں میں مگر
یہی بہت ہے محبت میں نام کر آئے

☆☆☆☆

آفتاب اقبال شمیم

پہلی دنیا کا یہ شہر

(سڈنی)

دھوپ گھڑی پر چلنے والے دن کے
شہر سے آیا ہوں
اور یہاں اس ریت کے سرمارنگ
سے میں
یادوں کی تسبیح پہ اپنی سانسیں گنتا رہتا ہوں
کچھ خوشیاں اپنے پیاروں سے ملنے کی
اور بہت سے غم، جن کی تفسیر کروں تو
آنکھیں بوجھل ہو جائیں
دیکھوں تو کیا کم ہے یہ رُوداد گزرتے لمحے کی
ایک مہذب سناٹے میں
ایک افق آثار سمندر کے ساحل پر
بستے شہر کا کیا کہنا
سڑکوں پر آباد مسلسل ایک صدا
فرّاٹے بھرتی کاروں کی

دائیں بائیں چُپ سادھے فُٹ پاتھوں پر
پیدل چلتی خاموشی
ایک غمِ تنہائی جیسے سارے شہر کو لاحق ہو
اک ٹھہری تصویر
برابر ایک ہی چلتے منظر کی
ان خوش حال و خوش پوشاک گھروں میں
چاہے جو کچھ بھی ہو لیکن
ایسا کیوں ہے
ان کے لانوں دالانوں میں
شور شرارت، رونے دھونے، بھاگم دوڑ
کی آوازیں
لگتا ہے جیسے ہوں لمبی رخصت پر
حیران آنکھ سوالی ہے
بچوں سے کیوں سارا منظر خالی ہے
شاید اک دن آتے جاتے
کچھ آداب شکن بچوں کو اپنے
گھر کے باہر دیکھ سکوں
پہلی دنیا کے اس شہر کا کیا کہنا
بھرے ہوئے اسٹوروں کے
چوکور بڑے بازاروں میں

اشیا کی بہتات، ہر اک شے جیسے کوئی
ماڈل ہو
جس کے چہرے اور بدن کی ہر تفصیل
رقم ہے اُس کے لیبل پر
آنکھ چُراتی بھیڑ رواں ہے
تنہا تنہا یا پھر جوڑے جوڑے میں
گاہک ہی گاہک ہیں ہر سُو
ایک سدھائی اور مہذب سرگوشی کے
آدھے شور میں
اس چوکور بڑے بازار کا دھندا
چلتا رہتا ہے
شہرِ صدا شاید ہے قحط کے عالم میں
اور مجھے اُس دھوپ گھڑی پر
چلنے والے شہر کی بے حد یاد آئی
شاد رہے وہ ٹیکسی والا
جس نے سارے رستے مجھ سے
اپنی شُدھ آواز میں
اپنے گھر کی اور زمانے بھر کی
باتیں کیں

☆☆☆☆

حسن عباس رضا

آثارِ قدیمہ سے نکلا ہوا ایک نوشتہ

ہماری آنکھ میں نوکیلے کانٹے
اور بدن میں زہر کے نیزے ترازو ہو چکے تھے
جب سیہ شب نے گلابی صبح کے غرقاب ہونے کی خبر پر
ہم سے فوری تبصرہ مانگا............!
ہمارے ہونٹ اتنے خشک اور اتنے دریدہ تھے
کہ ہم اک لفظ بھی کہتے
تو ریزہ ریزہ ہو جاتے
قلم ہاتھوں میں کیا لیتے
کہ اپنے ہاتھ پہلے ہی قلم تھے
(کیا سخن کرتے، کہاں لکھتے، کسے لکھتے؟)
سو، اہلِ جاہ نے
جو تبصرہ (جو قتل نامہ) سامنے رکھا
ہم اہلِ صبر نے
خوں رنگ ہونٹوں کی دریدہ مُہر
اس پر ثبت کر دی
اور کیا کرتے!؟؟؟

☆☆☆☆

علی محمد فرشی

ہندہ کی اولاد

دہشت گردو!
اے نامردو!
چھپتے پھروگے، آخر کب تک؟
اپنی وحشت کے جنگل میں

اے ہندہ کے بیٹو!
تم تو اپنی ماں سے بھی
دو چار قدم آگے ہی نکلے
اُس ڈائن نے
ایک کلیجا چیرا تھا
تم نے کتنی ماؤں کے دل
ٹکڑے، ٹکڑے کر ڈالے

میرے وطن کا
بچہ بچہ

رات کو ماں کی لوری سن کر
چپکے چپکے روتا ہے
جنگل کا ہر ایک درندہ
تم پر لعنت بھیج کے سوتا ہے

دہشت گردو!
بچوں کے بارے میں تم نے
پاک نبیؐ کی بات سنی ہے؟
''بچے رو رو کر جب مانگتے ہیں تو
اپنی فرمائش منوا لیتے ہیں''

اے ہندہ کے بیٹو!
گھر گھر روتے بچے
بات اپنی منوا لیں گے
ہر دہشت گرد کی گردن میں
مونج کا پھندا ڈلوا دیں گے

☆☆☆☆

زاہد مسعود

زمانہ بدل رہا ہے

بچوں کو پاس بٹھانے کی رسم ختم ہوئی
جیسے
مین گیٹ کو
رات نو بجے تالا لگائے جانے کی رسم
والدین
دوائی کی آخری خوراک کے منتظر ہیں
مگر
بچوں کا کمپیوٹر کا کام ختم نہیں ہو رہا
تنہائی کی دیوار نے
رات بھر میں کمرے کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے
سیر گاہوں میں لوگ کم کم نظر آنے لگے ہیں
جیسے جامن کے درخت پر پھل
یا پھولوں کے آس پاس تتلیاں
میرے بستر سے
سرکاری ہسپتالوں کے بیڈ زیادہ بارونق ہیں

کہ ان پر
بیک وقت تین تین مریض لٹائے جا رہے ہیں
شاپنگ مال میں لوگ صرف نرخ نامے دیکھتے ہیں
ایک دوسرے کو نہیں
ہجوم کی تنہائی
چھت سے چمٹی ابابیل کی آنکھوں سے بہنے لگی ہے

اب
رات دیر تک ریستورانوں میں آرڈر لینے کی رسم بھی ختم ہوئی
جیسے
بچوں کے ساتھ سونے سے پہلے مکالمہ کرنے کی روایت

☆☆☆☆

ماہ طلعت زاہدی

ترغیب

وقت خوابوں میں جھلملاتا ہے
چاندنی کا فسوں جگاتا ہے
رات کی بھیگتی خموشی میں
آرزوؤں کی دُھن پہ گاتا ہے
کتنا مدھم ہے چاند کا چہرہ
کیسی روشن ہے تیرے پیار کی بات
اور کچھ دیر ہے یہ رات
یہ ساتھ،
مجھ سے کہتا ہے میرا تنہا دل
آؤ۔۔۔ سب بھول کر یہاں کھو جاؤ۔۔۔

☆☆☆☆

احمد حسین مجاہد

جواں جسموں کی مردہ چھاؤں میں

پیڑ سے لٹکے جواں جسموں کی مردہ چھاؤں میں
سوکھے ہوئے چشموں کی عریانی پڑی ہے
ہم خس و خاشاکِ بے مصرف
یہ سب کچھ دیکھتے ہیں/اور چپ ہیں
خار و خس کی راکھ سے
نروان کا دریا نہیں بہتا
چلو مانا/مقدس ہی سہی یہ آگ
لیکن آگ کا سایہ نہیں ہوتا
کہاں جائے کوئی
اب خواہشیں قانون ہیں
بے چہرگی تہذیب ہے
اور کج سرشتی مذہبِ ہر این و آں ہے
دل میں جو آئے وہی آکاش وانی ہے
کہاں جائے کوئی
اب سچ وہی ہے
جو صحائف میں کہیں آیا نہیں ہوتا
فرستادہ رسولوں نے جو فرمایا نہیں ہوتا

☆☆☆☆

محمد مشتاق آثم

عرصۂ خواب

سَت رنگے موسموں کے بادل پر
مَیں دھنک کی مہار کو تھامے
کن شفق رنگ آسمانوں پر
لفظ کی اک لکیر کھینچتا ہوں
تب ازل تا ابد زمانوں تک
کتنا اونچا اُڑائے پھرتا تھا
نیل گوں نشۂ سخن مجھ کو
میری آنکھوں کی پُتلیوں پہ رقم
یاد کے نقش کتنے گہرے تھے
اِک زمانے سے دیکھتا جاؤں
ٹوٹتا ہی نہیں ہے عرصۂ خواب

☆☆☆☆

محمد ظہیر بدر

مائے نی!!

میں خاکِ خام تھا تُو ظرف گر تھی
کہ تیری کوکھ ہی تھی چاک میرا
تجھی نے مجھ کو گِل سے گُل بنایا
سکھایا مجھ کو پاؤں پاؤں چلنا
مری آنکھوں نے تجھ کو دیکھ کر ہی
جہانِ شش جہت کا لطف پایا
تیری ہی لوریوں نے، میری مائے!
مرے گریاں دہن کو لفظ بخشے

مری فہمیدگی اعجاز تیرا
تو ہی آرائش فکر و نظر ہے
تو ہی مشاطہ گیسوئے ہستی
مرا عرفان تو، پہچان تو ہے
مرا ہونا تجھی سے معتبر ہے
مری مائے! یہ سب تیرا ہنر ہے

ترا شہکار ہوں، الحمداللہ!
ترا ہی لمس، لمسِ مطمئنہ
زیارت گاہ تھا تیرا سراپا
ترا احساس میری قبلہ گہ ہے
ہے جینا گر کوئی فن اس جہاں میں
مری مائے!......مہا فنکار تھی تو
سکھایا تو نے ہی مجھ کو کہ کیسے اشک پیتے ہیں
بتایا تو نے ہی جینا پڑے تو کیسے جیتے ہیں!!!

☆☆☆☆

نوید صادق

پانی! افوہ پانی

صبح سویرے اُٹھ بیٹھا ہوں
یہ میرا معمول نہیں ہے
شاید کوئی خواب اندھیرے کمرے میں کُرلایا تھا

ٹیرس پر کچھ چڑیاں شور مچاتی، ہنسی اُڑاتی ہیں
شاید وہ بھی جانتی ہیں
بے کار کی باتیں اور بے ربط فسانے ----
آج بھی خود سے ہار آیا ہوں
رات کو خود سے لڑتا جھگڑتا سویا تھا
تھوڑا تھوڑا یاد ہے، لیکن
نیند کی گولی ---ایک ---نہیں، دو چار اکٹھی
پانی! ...... کوئی پانی دے گا
سانس اُکھڑتی سانس ---
مگر یہ روزانہ کے قصے ہیں
کڑوے کسیلے ذائقے
اور یہ ٹیڑھے میڑھے پیکر یوں ہی ٹوٹے پھوٹے لفظ
اُگلتے رہتے ہیں

گملے میں مرجھاتے پھولوں کے چہروں کو دیکھا ہے؟
صبح سویرے یہ بے چارے پانی چاہتے ہیں
اچھا میں کچھ کرتا ہوں!
لیکن، میرے ہاتھ اور پاؤں
جیسے کسی نے باندھ دیے ہوں

دھوپ! اے دھوپ!
خود اپنے سہارے اِن گلیوں میں
صبح سویرے کوئی کہاں تک جا سکتا ہے
نیند کی کولیوں کی کڑواہٹ ---تھوڑی باقی ہے
اور ہوا میں اُڑتے طائر پوچھتے ہیں
پانی ہوگا؟ پانی!
لیکن میرے بس میں کیا ہے
میں اب اور کہاں تک جا سکتا ہوں!
لے دے کر یہ کمرہ، ٹیرس، کچھ مرجھائے پھول
چند کتابیں جن میں دیمک ہفت افلاک کے قصے
ڈھونڈتی پھرتی ہے
کھانستے کھانستے ----
دو گھنٹے میں اتنے سگریٹ!
پانی! کوئی پانی دے گا!

رنگ برنگے خواب لیے جو لوگ گھروں سے نکلے ہیں
سب جانتے ہیں
تقویم۔۔۔ برائے نام ہی ساتھ نبھاتی ہے
تقدیس کے جھگڑے رستے میں رہ جاتے ہیں
بڑی سڑک کے دونوں جانب ہرے بھرے اشجار توجہ کھینچتے ہیں

پاگل پن میں اک وعدہ کر بیٹھا تھا
میں آؤں گا
شام سے پہلے لوٹ آؤں گا
لیکن۔۔۔۔
سانس اُکھڑتی جاتی ہے
پانی! کوئی پانی دے گا!
دائیں بائیں، آگے پیچھے۔۔۔۔
جھوٹی قسمیں، کچے وعدے،
ہرے بھرے اشجار، پرندے، دھیرے دھیرے چلتی دیمک
رستا دیکھتے رہ جائیں گے!

☆☆☆☆

عبید بازغ امر

فیس بُک

غزال آنکھو مجھے بھی دیکھو
شکارِ تیرِ نظر ہوا ہوں
حنائی ہاتھوں میں کھیلتا ہوں
نگار خانے کے ایک ویران چوکھٹے سے میں جھانکتا ہوں
میں بے نشاں ہوں کتاب چہرے میں اپنا چہرہ تراشتا ہوں
قبائے کاغذ میں الجھا ہوں
برنگِ شیشہ میں آئینہ ہوں
میں ہولے ہولے فضا میں تحلیل ہو رہا ہوں!

نحیف انگلی پہ رقص کرتے ہوئے زمانے کی داستاں ہوں
میں حرفِ کُن میں سمٹ گیا ہوں
کِلک کرو تو
زبانِ کِلک و صریرِ خامہ میں بولتا ہوں
قبول و انکار میں بٹا ہوں
اگر کہو ہاں تو میں تمہارا
نہیں کہو گے تو میں نہیں ہوں

بس ایک پل کے قرار میں ہے ثبات میرا
نگاہِ لطف و کرم تلک ہے دوام میرا

☆☆☆☆

حماد نیازی

مجھے کیا چاہیے ہے

مجھے روشنی چاہیے ہے
بوند، دو بوند، تھوڑی سی روشنی
جس سے میں ایک سورج بنا سکوں
نرم، روشن، آنسوؤں جیسا سورج

نہیں! مجھے چھاؤں چاہیے ہے
ایک قدم، دو قدم، تھوڑی سی چھاؤں
جس کے تلے میں ایک نیند کا بستر بنا سکوں
آرام دہ، نرم، خوابوں سے بھرا بستر

نہیں! مجھے لفظ چاہیے ہیں
دو، تین، بس تھوڑے سے لفظ
جن سے میں ایک نظم بنا سکوں
خوبصورت، با معانی، اور مختصر نظم

نہیں! مجھے سانس چاہیے ہے
ایک گھڑی، دو گھڑی، بس تھوڑی سی سانس

جسے لے کے میں اسکا مزید انتظار کر سکوں
طویل ، بے سود مگر ضروری انتظار

نہیں! مجھے دعائیں چاہیے ہیں
دو، تین، تھوڑی سی دعائیں
جن سے میں اپنی بہشت بنا سکوں
خوبصورت ، ماؤں جیسی ، اداسی بھری بہشت

نہیں! مجھے یہ سب چاہیے ہے
روشنی، چھاؤں، لفظ ، سانس، اور دعائیں
جن سے میں ایک دنیا بنا سکوں
اپنے رنگوں، اپنے خوابوں، اپنے لوگوں جیسی دنیا **(نثری نظم)**

☆☆☆☆

شبیر نازش

آغازِ صبح

روح
سیرِ سماوات کے بعد
تھکن اُتارنے کے لیے
جسم میں انگڑائی لیتی ہے
آنکھوں میں ایک خواب
چھنا کے سے ٹوٹتا ہے
مَیں آنکھیں مَلتا ہُوا ایسے اُٹھتا ہوں
جیسے کوئی روتا ہُوا بچہ
بستر کے چہرے پر پڑی مُتجسس جُھریاں بتاتی ہیں
کتنی لمبی زندگی
کِس حال میں
کتنی جلدی جی چُکا ہوں
وصل کے جام میں
ہجر کا کتنا زہر پی چُکا ہوں
اوہام کا بستر لپیٹتا ہوں
آئینہ سُوجی ہوئی آنکھوں کو حیرت سے تکتا رہ جاتا ہے
مَیں کام پہ چلا جاتا ہوں

(نثری نظم)

منظور حسین کاسف

نقشِ فریادی

سرِ مضمون رنجیدہ
رخِ قرطاس نم دیدہ
قلم افسردہ افسردہ
دھواں بارود کا شہرِ محبت کی فضاؤں میں
بھری وحشت ہواؤں میں
غبار آلود میرے کوچہ و بازار کا منظر
گلابوں کے لہو کے سرخ دھبے شاہراہوں پر
خدا کے نام پر برپا
قیامت بے گناہوں پر
نوائے عندلیباں درد میں ڈوبی
کہ جیسے تیرگی میں ہوں لَویں بجھتے چراغوں کی
لہو انسان کا ارزاں
فصیلِ صبر ہے لرزاں
دعا کے آخری زینے پہ پہنچا
حبس کا سایہ

تنفس کا کڑا دشمن

فرومایہ

کہیں سے رنگِ پیراہن کی خوشبو

لے کے آنچل کی ہوا آئے

کہیں معصوم کلیوں کے چٹخنے کی صدا آئے

صلیبِ واعظاں کی وحشتوں کے زرد موسم کے گزرنے کی نوا آئے

اتر کر آسمانوں سے خدا آئے

خدا آئے!

☆☆☆☆

عمیرہ احمد

مرے دشتِ سخن پرور

مرے دشتِ سخن پرور!
مرے گھر!
تری ویرانیوں کے نام کچھ سطریں۔۔۔۔
کہ اک رم خوردہ آہو کو سنبھالا ہے بڑا تُو نے
کوئی وحشت تھی دیواروں میں جس کو قید رکھا ہے
ترے ہی کچھ جفا پیشہ مکینوں کی عنایت ہے
یہ آئینِ زباں بندی۔۔۔۔

اسی گھر میں مکان و لا مکاں سے ماورا بھی ایک بستی ہے
کبھی جب تازیانے تن پہ ٹوٹے ہیں ملامت کے
اسی دیوار و در کے سائے میں سورج نکل آئے
کبھی سیماب تن بڑھیا
سخن کا سونا تھامے چاند کا زینہ اتر کر آ گئی ہے
یہیں اک دل زدہ فنکار نے چھپ کر
کسی نادیدہ سامع کو صدا دی ہے

انہی دیوار و در کے سائے میں اک آسماں بھی ہے
یہیں اک بحرِ خوش رفتار
اک جوئے رواں بھی ہے
صلائے عام بھی اٹھی اسی در سے
مرے دشتِ سخن پرور!
مگر کوئی نہیں آیا
---تری ویرانیوں کے نام کچھ سطریں----
مرے گھر!
کہ اک رم خوردہ آہو کے جنوں کا میزباں ہے تُو
محافظ ہے تو اک جوئے رواں کے زادِ وحشت کا
اثاثہ ہائے فن کے تاجور!
دشتِ سخن پرور!
مرے گھر!

☆☆☆☆

محمد الیاس

دوٹکیاں دی نوکری

پورے خاندان میں ہی نہیں، ساری برادری اور چھوٹے سے شہر کے کئی حلقوں میں بھی عظیم احمد کی طویل جدوجہد کا چرچا ہونے لگا۔ اس کی بیوی آصفہ کے بھی گن گائے گئے کہ ایسی مثالی شریکِ حیات قسمت والوں کو ملتی ہے، جس نے بڑے حوصلے اور صبر سے میاں کا ساتھ نبھایا۔ جدائی کا طویل عرصہ کاٹا۔ سعودی ریال کی صورت میں آنے والی خاوند کی کمائی کا وافر حصہ، دل میں ملال لائے بغیر دیوروں، نندوں اور ساس سسر پر خرچ کرتی رہی۔ سربراہِ کنبہ نے ماسوائے بچے پیدا کرنے کے زندگی بھر کسی کام میں دلچسپی لی اور نہ ہی ڈھنگ کے روزگار سے لگا۔ بڑھاپے میں ساری ذمہ داریوں کا بوجھ بڑے بیٹے عظیم کے کندھوں پر ڈال کر بے چنت ہو کے بیٹھ رہا۔ ایم اے کا امتحان دیتے ہی بائیس سال کی عمر میں آصفہ اس گھر کی بہو بنی اور پورے سترہ برس اپنے شوہر کے چھوٹے بہن بھائیوں کو پڑھانے، بیاہنے اور اپنے پیروں پر کھڑا کرنے میں صرف کر دیئے۔ شادی کے شروع کا ایک آدھ برس بڑا رومانی رہا۔ دونوں کو ایک دوسرے کی جدائی ڈسنے لگتی۔ عظیم کی پہلی ملازمت لاہور میں تھی جہاں سے وہ ہفتہ وار چھٹی سے پہلی رات کو گھر آ جاتا اور دوسری رات کا تین چوتھائی سوتے جاگتے گزار کر سحری کو سفر پر نکل کھڑا ہوتا۔ بیوی اتنی سی جدائی پر بھی گایا کرتی: تیری دوٹکیاں دی نوکری، میرا لاکھوں کا ساون ...... لیکن باپ نے ایک ہی رٹ لگائے رکھی: ''اِس تنخواہ پر گزارہ نہیں ہو سکتا ...... عظیم بیٹا! کوئی خیال کرو، ہوش کے ناخن لو۔ چھوٹے بہن بھائیوں کا سوچو ...... نکلو اس ملک سے اور باہر جاؤ ......''

عظیم سعودی عرب چلا گیا اور باپ کے سارے خواب پورے ہو گئے۔ وراثت میں ملے ہوئے تقریباً اڑھائی کنال قطعۂ اراضی پر کبھی نیم دیہاتی نیم شہری طرز کا سادہ اور مختصر سا گھر بنا ہوا تھا، جس کی چار دیواری بھی ڈھنگ کی نہ تھی۔ تارکینِ وطن کا کمایا ہوا زرِ مبادلہ آنے سے صرف اسی گھرانے کی حالت ہی نہ بدلی بلکہ شہر بھی پھیل گیا اور مضافات کا یہ پلاٹ پوش ایریا کا حصہ بن گیا۔ لبِ سڑک کمرشل پلازہ، اس کے پیچھے باہم متصل پر آسائش چار رہائشی یونٹ اور دائیں ہاتھ گلی چھوڑ کر قطار میں چار ہی کمرے مع غسل خانے، ملازموں کے لیے تعمیر کروائے گئے تھے۔ گلی صرف رہائشی عمارت اور سرونٹ کوارٹرز کے درمیان روشنی اور ہوا کے لیے رکھی گئی تھی۔

سربراہِ کنبہ، بیٹے کی کمائی سے زیادہ اپنے آبائی پلاٹ کے غیر معمولی حد تک قیمتی ہو جانے پر فخر کرنے لگا تھا۔ آصفہ نے چند ایک بار دبے لفظوں میں شوہر کو سمجھایا تھا کہ جس زمین پر وہ بے دریغ ذاتی کمائی خرچ کر رہا

ہے، ساری اولاد کی مشترکہ ہے۔ میاں نے کان نہ دھرا تو بیوی نے سمجھ لیا کہ اس کا فرض صرف خدمت کرنا اور خاموشی سے قربانی دیے جانا ہے۔ ساس سسر نے باقی بہوئیں بھی ایسی ڈھونڈ نکالیں، جو کینیڈا اور امریکہ کی شہریت رکھتی تھیں۔ بیٹیوں کے رشتے کرتے ہوئے میاں بیوی نے ایسا کڑا انتخاب کیا کہ بہو دنگ رہ گئی۔ پہلی ترجیح یہ کہ لڑکے کے والدین اس کو اعلیٰ تعلیم دلانے اور کروڑوں کی جائیداد ورثے میں چھوڑنے کے بعد آسودۂ خاک ہو چکے ہوں۔ اول تو لڑکا اکلوتا ہو۔ خدانخواستہ اگر کوئی بہن بھائی ہو بھی تو کسی دوسرے برِاعظم کے ترقی یافتہ ملک کا قانونی شہری ہونے کے علاوہ اتنا مصروف ہو کہ نیک تمناؤں کے ساتھ قیمتی تحائف ارسال کر کے شادی میں شرکت سے معذرت کر لے۔

اپنے بھائی کے لیے آصفہ کو اپنی سب سے چھوٹی نند شازیہ بہت اچھی لگی لیکن ساس نے بڑی خوش اسلوبی سے ٹال دیا۔ وہ سمجھ گئی کہ میرے میکے کے افرادِ کنبہ کی تعداد زیادہ ہے اور دو چھوٹی بہنیں ابھی کنواری بیٹھی ہیں۔ گویا ساس سسر کے کڑے معیار پر رشتہ پورا نہ اترا لہٰذا گزشتہ ماہ اس کو یوں دھوم دھام سے رخصت کیا کہ تمام رشتہ دار اور دوست احباب حسنِ انتخاب کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ گھر افرادِ کنبہ سے خالی ہوتا گیا۔ ساس سسر پر جوانی کا دور لوٹ آیا اور وہ منجھلے دونوں بیٹوں سے ملنے شمالی امریکہ کے دورے پر نکل گئے۔ آصفہ نے چند ایک بار شوہر سے فون پر بات کرتے ہوئے کہا کہ وہ اب گھر لوٹ آئے۔ دونوں بیٹے جوان ہو رہے ہیں۔ انہیں لیپ ٹاپ، ٹیبلٹ اور موبائل فون سے بڑھ کر کوئی رشتہ یا چیز عزیز نہیں۔ اوپر اپنے کمروں میں گھسے، نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ میاں نے جواب دیا کہ اب اپنی اولاد کی باری آئی ہے، صرف ایک دو سال اور پردیس کاٹ لوں ......

شازیہ کی شادی سے دو مہینے پہلے گھر کی مرمت اور رنگ روغن کرانے کی غرض سے جس کاریگر کو کام پر لگایا، اُس کا انٹرویو بڑا دلچسپ رہا۔ اتا پتا پوچھنے پر شناختی کارڈ دکھاتے ہوئے بڑے انکسار سے میٹھے رسیلے لہجے میں بولا: ''باجی جی! یہ میرا اصلی کارڈ ضمانت کے طور پر پاس رکھیں۔ پتا یہ ہے: سرفراز احمد ولد ریاض احمد، چک نمبر چالی پُچو کناوالی، تحصیل و ضلع منڈی بہاؤالدین''۔

''چک چالی پُچو کناوالی'' جیسے عجیب و غریب الفاظ سن کر آصفہ کو ہنسی آ گئی۔ کارڈ ہاتھ میں لے کر پڑھا۔ اس پر واقعی چک نمبر 40 پُچو کناوالی لکھا ہوا تھا۔ اجرت پوچھنے پر کہنے لگا: باجی جی! ٹھیکہ کر لیں، چاہے دیہاڑی پر لگائیں۔ جو آپ کے وارے میں ہو۔ ضرورت مند ہوں، انکار نہیں کروں گا۔ مزدوری میں کبھی نخرہ نہیں کیا۔ رنگ روغن کے علاوہ اور بھی جو خدمت ہو، ہتھ بندھے غلام کی طرح حاضر ہوں۔ ایک عرض اور ہے۔ پردیسی ہوں، کوئی ٹھور ٹھکانا نہیں ...... یہ آپ کے سرونٹ کوارٹر خالی ہیں۔ جب تک آپ کا کام ختم نہیں ہوتا، رہنے کو دے دیں۔ یا جب تک ملازم نہیں آتے، مجھے اس میں رہنے دیں۔ تھوڑا بہت کرایہ بھی بے شک میری مزدوری سے کاٹ لینا۔ فی الحال میرے پاس روٹی کے پیسے بھی نہیں۔ احسان فراموشی اور نمک حرامی میرے خون میں شامل ہی نہیں ہوئی۔''

سترہ اٹھارہ سال کی طویل عملی زندگی میں آصفہ کو ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑا اور پھر اتنا بڑا تعمیراتی کام بھی کرایا۔ ایسا باتونی اور دلچسپ گفتگو کرنے والا مزدور یا کاریگر اس سے پہلے برابر نہ آیا۔ حیرت زدہ ہوئی۔ سرونٹ کوارٹر میں رہائش دینے میں ایک فائدہ بھی نظر آیا کہ کام ادھورا چھوڑ کر بھاگنے کا امکان کم ہو جائے گا۔ یوں ہی مزید بات چیت کرنے کی غرض سے اس کی تعلیمی قابلیت کے بارے میں پوچھ بیٹھی۔ وہ جھٹ بول پڑا:

”باجی جی! میٹرک پاس ہوں۔ اچھا اتھلیٹ رہا۔ والی بال، فٹبال اور خاص کر کبڈی کا۔ کسی بھی اچھے کالج میں اتھلیٹ ہونے کی بنیاد پر داخلہ مل سکتا تھا لیکن گھر کی مجبوری بن گئی۔ ویسے اور بھی کئی ہنر آتے ہیں۔ چھوٹی موٹی پائپ فٹنگ، بکلینکی، الیکٹرسٹی، گزارے لائق ٹیپ پلستر ......“

آصفہ کی ہنسی نکل گئی۔ وہ قدرے کھسیانا ہو کر مسکرایا اور بولا: ”غرض مند دیوانہ ہوتا ہے۔ کچھ زیادہ ہی بول گیا۔ ویسے مہارت صرف پینٹر کے کام میں حاصل ہے۔ باقی کے ہنر اتنے ہی سمجھتا ہوں کہ ضرورت پڑنے پر کسی کے پیچھے بھاگنا نہ پڑے۔۔۔ یعنی آپ یہ سمجھ لیں کہ Jack of all but master of none ویسے پینٹنگ میں ماسٹر ہوں۔“

سرفراز نے ایک مہینے میں پورا گھر چمکا دیا۔ دن میں بارہ بارہ گھنٹے کام کرتا رہا۔ واقعی اتھلیٹ ثابت ہوا۔ پچیس چھبیس سالہ کسرتی بدن والا جوان تھکنے میں ہی نہ آتا۔ ناشتا کر کے شروع ہوتا، دوپہر کو کھانے کا وقفہ کرتا اور رات جب اہلِ خانہ کھانے کے لیے آواز دیتے تو ہاتھ روکتا۔ اِس عرصہ میں اُس نے گھر میں کئی طرح کے مرمتی کام کیے۔ بجلی کے خراب سوئچ ساکٹ بدل دیئے اور قطرے ٹپکاتی ٹونٹیاں ٹھیک کر دیں۔ شادی کے موقع پر یوں بھاگ بھاگ کر ہر کام کیا جیسے گھر کا اہم فرد ہو۔ اُس نے صحیح معنوں میں اپنی اہمیت ثابت کر دی۔ رنگ و روغن کا کام ختم ہونے پر جب حساب ہوا تو کہنے لگا: ”باجی جی! یہ صحن میں جو موٹر سائیکل کھڑی ناکارہ ہو چکی ہے، اگر مناسب پیسے لے کر مجھے دے دیں تو میں خود ہی آہستہ آہستہ نئے پرزے ڈال کر ٹھیک کر لوں گا......“

بہو نے ایک نظر سسر کی طرف دیکھا۔ بوڑھا شخص بے بہا کامیابیوں پر ان دِنوں بڑی اُونچی ہواؤں میں تھا۔ بول پڑا: ”دے دو بیٹی! اس نے بڑی خدمت کی ہے۔ حلالی بچے سے کباڑی کے مال کا کیا لینا ہے۔“ پاس بیٹھے چھوٹے پوتے نے اپنا موبائل فون دیتے ہوئے کہا: ”یہ تم لے لو۔ میرا نیا آ گیا ہے۔ کیا یاد کرو گے۔ تم ہمارے اتنے کام آتے ہو۔“

ڈیڑھ مہینے میں سرفراز نے بائیک نہ صرف چالو کر لی بلکہ کین لا کر خود ہی سرخ رنگ اسپرے کر کے نئی جیسی بنا لی۔ کمرہ خالی کرنے کو کسی نے نہ کہا۔ بڑی خوش دلی سے گھر کے بہت سارے کام کر دیتا۔ اس کے رہائشی کمرے میں ان لوگوں کا دیا ہوا تھوڑا سا فرنیچر، ضرورت کی کچھ اشیا اور پہننے کو کپڑے جمع ہو گئے۔ سب لوگوں کے چلے جانے پر جب کنبہ صرف تین افراد تک محدود ہو گیا تو چند ایک بار آصفہ کی طبیعت ناساز ہونے پر

سرفراز نے کچن سنبھالے رکھا۔ چائے اور پراٹھے، سادہ روٹی اور سالن بہت اچھا بنا لیا کرتا۔

صرف ایک مسئلہ کھڑا ہو گیا، جس نے آصفہ کا سکون تباہ کر دیا۔ اتفاق سے ایک روز اس نے گیسٹ بیڈ کی کھڑکی کا پردہ ذرا سا کھسکا کر گلی کے پار سرفراز کے کمرے کی کھڑکی پر نگاہ ڈال لی تھی۔ وہ کام والے کپڑے اتار رہا تھا۔ فوراً پیچھے ہٹ گئی لیکن تجسس اُمڈ آیا۔ اس طرف اندھیرا تھا اور سرفراز کے کمرے میں مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مختصر سامان سے آراستہ صاف ستھرے کمرے میں صرف بستر کے ایک حصے پر روشنی پڑ رہی تھی۔ سرفراز نے بلب کے اردگرد سفید کارڈ بورڈ کا مخروطی شیڈ لگا رکھا تھا۔ وہ گلی کا داخلی دروازہ اندر سے بند کر لیا کرتا تھا۔ آصفہ اپنے اوپر پورا جبر کرنے کے باوجود دوبارہ جھانکنے سے خود کو باز نہ رکھ سکی۔ اب اس کی نظروں کے سامنے دھندلی روشنی میں زیادہ سے زیادہ دس بارہ فٹ کے فاصلے پر ہندی دیومالائی شاہکار مجسمہ پوری آب و تاب سے سارے اسرار کھولے کھڑا تھا۔

آصفہ کے سر میں ہر وقت ہلکا درد رہنے لگا اور بدن میں تپش محسوس ہوا کرتی۔ جوں ہی بائیک گلی میں آ کر بند ہوتی، وہ اپنے آپ کو روک نہ پاتی اور گیسٹ بیڈ کی طرف دوڑ پڑتی۔ سرفراز صبح کام پر جانے سے پہلے بھی صاف لباس اتار کر رنگ والے کپڑے پہنتا۔ آصفہ اتنی بے بس ہوئی کہ ایسا کوئی بھی موقع ضائع نہ جانے دیتی۔ وہ سمجھ نہ پائی کہ مجسمہ کھڑکی کے سامنے بغیر اوٹ آڑ کے، اسی رُخ ایستادہ کیوں ہوا رہتا ہے۔

راتوں کی نیند برباد ہو گئی۔ عجیب عجیب خواب آنے لگے۔ کھجراہو اور اجنتا الورا کی غاروں میں تو کبھی مندروں میں گھومتی رہتی۔

دن بھر وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی۔ گھنگور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ صرف ایک بار بے اختیار لبوں پر وہی گیت آ گیا، جو شادی کے شروع دنوں میں گایا کرتی تھی: ''تیری دو ٹکیاں دی نوکری......'' لیکن شوہر کا چہرہ تصور میں آتے ہی بے زاری اور نفرت کی بلند لہر اچھل کر آئی۔ ''کاغذی خصم'' کہہ کر ہوا میں خیالی تھوک پھینکی۔ سر درد کی گولیاں لیں اور ماتھا کس کر باندھ لیا۔ عشاء کے بعد موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ موسم خراب ہونے کی وجہ سے سرفراز کام پر نہیں گیا تھا۔ شام کو کچن میں رہا اور تینوں کو کھلا پلا کر صحن کے راستے بغلی دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ وہ جب تک سامنے رہا، اس کے بدن پر لباس ہونے کے باوجود نظر نہ آیا۔ آصفہ کا سر چکراتا رہا۔ سونے کا خیال آتے ہی رُخ گیسٹ بیڈ کی طرف ہو گیا۔

خواب آور گولیاں لینے سے نیند جلد آ گئی مگر رات کے پچھلے پہر چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ خوف سے گلا خشک ہو رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی شو جی کے چرنوں میں بیٹھی تھی۔ درشن کے لوبھی نیناں نے مہادیو کے بھید کھلتے دیکھے۔ سُدھ بُدھ ہی گنوا بیٹھی۔ خبر ہی نہ ہوئی کہ کب ......اور کنیا گھائل ہو گئی۔

اسی لمحے کھڑکی میں سے دبی دبی آواز سنائی دی: ''باجی جی! آپ اکیلے میں ڈر گئی ہیں۔ ذرا صحن والا دروازہ کھولیں۔'' اس نے کپکپاتی ہوئی دھیمی آواز میں اتنا ہی کہا: ''کھلا ہوا ہے۔''

آغا گل

کالی پت

ڈاکٹر سلیم سے میری ملاقات اتفاقاً ہی ہوئی۔ میری والدہ ہسپتال میں داخل تھیں سلیم زندگی کے آخری ایام ڈاکٹرز میس میں کاٹ رہا تھا۔ تھا امیر گھرانے کا، سوچا کہ مرنے سے پہلے کوئی نیکی کا کام کرتا جائے، اس نے میس جاری کر دیا۔ اکثر ڈاکٹر اس کے قرض دار رہتے۔ وہ بل کا تقاضا بھی نہ کرتا۔ اسے جانے کیا بیماری تھی کہ پھول کر کپا ہو گیا تھا۔ فلم شعلے والے امجد خان کی مانند پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ تھا تو گورا چٹا، قد بھی لمبا تھا مگر حالات نے اسے لافنگ بدھا جیسا گول مٹول بنا دیا تھا۔ کہتے ہیں عینک کا جو آخری نمبر ہوتا ہے وہی لگائے رہتا ورنہ تو پاس کھڑی بھینس بھی اسے دکھائی نہ دیتی۔ والدہ جو صحت یاب ہو کر گھر آئیں تو میرا میس بل لینے سے انکار کرتے ہوئے سلیم نے بتایا کہ وہ دوستوں سے بل نہیں لیتا۔ اس نے گنیش جی جیسا بڑا سا سر ہلاتے ہوئے اپنا رویہ واضح کر دیا۔ وہ ایک بے ضرر سا انسان دوست نا کام ڈاکٹر تھا۔ اس کے کمرے میں بھارتی گیتوں کا انمول خزانہ تھا۔ جسے وہ رات بھر سنتا رہتا اور سر دھنتا رہتا۔ اس کے کمرے میں جانے کا شرف کسی کسی کو ہی حاصل ہوتا۔ ورنہ وہ اندر سے بھی ہانک لگاتا کہ نہیں مل سکتا۔ احباب نے ہی خفیہ طور پر راز افشا کیا تھا کہ زمانۂ طالب علمی میں کسی انارکلی سے دھانسو عشق لڑایا تھا جو نا کام رہا۔ جانے کون سا اکبر بادشاہ انارکلی کو لے کر چلتا بنا۔ شیخو کا دل ٹوٹ گیا۔ ترک موالات ترک دنیا کر کے ڈاکٹرز میس کے ہی ایک کمرے میں خود ساختہ قید تنہائی اور جلا وطنی اختیار کر لی۔ ماہ بہ ماہ اس کے اکاؤنٹ میں ایک بھاری رقم بھائی بھجوا دیا کرتے، بھائیوں سے وہ کبھی نہ ملتا۔ کوئی ملنے بھی آتا تو ایسی بے اعتنائی اختیار کرتا کہ چند ماہ کے لیے وہ غائب ہی ہو جاتا۔ میں بھی نایاب گیتوں کی چاٹ میں اس کے ہاں جایا کرتا۔ وہ نت نئے کھانے بھی میرے لیے بنوایا کرتا۔ دفتر میں دن بھر دل جلانے کے بعد شام میں دو اڑھائی گھنٹے شیخو کے ساتھ گزارنے سے اگلے روز جینے اور ملازمت کا حوصلہ برقرار رہتا۔ جعلی ڈگریوں والے ان پڑھ وزیر، ایجنسیوں کے پروردہ سیاسی لیڈر افسروں کو آنکھیں دکھاتے، جبری رخصت پہ گھر بھجوا دیتے یا او ایس ڈی لگوا دیتے۔ افسروں کے چلتے میٹر بند ہوتے تو وہ بھی تلملانے لگتے۔ ورنہ تو تنخواہ وصول کرتے ہوئے چھٹی پہ رہنا ایک خوشگوار تجربہ ہے۔ ڈاکٹر سلیم جسے پیٹھ پیچھے دوست شیخو کہا کرتے کو ایک ہی عشق نے مار ڈالا ورنہ تو لوگ بہت سے عشق کرتے ہیں۔ عشق ہی تو دل کا مشغلہ ہے،

ورنہ جس ملک کے کارپرداز مزاروں سے ڈرتے ہوں کتابوں سے خوف زدہ ہوں، جہاں مزار مسمار کر دیے جائیں اور دکانوں سے کتابیں اٹھالی جائیں، وہاں زندگی بسر کرنا دشوار ہے۔ اس خوف کے عالم میں مؤذن اذان دیتا ہے تو دیتا رہے۔ بھلا کوئی وہاں کیا کرے جہاں صرف عشق کرنے اور وضو بنانے کی ہی آزادی ہو وہاں شیخو کا اندازِ فکر مجھے تو پسند آیا۔ باوجود دوستی کے جو روز بروز گہری ہوتی گئی شیخو انارکلی کے بارے میں بالکل خاموش ہی رہتا۔ میں داستانوں اور اساطیری حوالوں سے محبت کے بارے میں کچھ بولتا بھی تو وہ جمع خانی کرنے لگتا۔ بالکل انجان بن کر اپنے بنگالی خانساماں کی تعریف کرنے لگتا۔ جو اعلیٰ مچھلی اور لذیذ کباب بنایا کرتا۔

شیخو نے ایک روز مجھے بتلایا کہ اب اس کا چل چلاؤ قریب ہے۔ اس کا ہارٹ فیل ہو چکا ہے۔ اڈیما بھی ہے۔ وہ لیٹ کر نہیں سو سکتا ورنہ پھیپھڑوں میں پانی بھرنے لگتا ہے۔ ساری ساری رات وہ ٹیک لگائی گزار دیتا ہے۔ پاس کے کمرے میں ہی ہمارا دوست ڈاکٹر اشوک رہتا تھا۔ جو سرِ شام پینے پلانے لگتا۔ اس کے کمرے سے قہقہے بلند ہوتے رہتے۔ اس کے دوست پی پلا کر جھومتے جھامتے لڑکھڑاتے گھروں کی راہ لیتے اور کبھی کبھار تو ادھر اُدھر گاڑیاں بھی مار دیتے۔ اشوک بعض اوقات ٹُن ہو کر ہمارے ہاں چلا آتا۔ بقول شیخو، من کا اچھا تھا اسے کمرے میں آنے کی اجازت مل جایا کرتی۔ اشوک بھی شیخو کا گرویدہ تھا۔ شیخو کو شراب سے سخت چڑ تھی مگر وہ اپنی ناپسندیدگی کا کبھی اظہار نہ کرتا۔ اس رات بھی جب سخت رنجیدہ گفتگو ہو رہی تھی، میری آنکھیں بھر آئیں۔ شیخو جیسے دوست کو کھو دینا تکلیف دہ ہوتا۔ اس کی عمر تو زیادہ نہ تھی شاید پچاس برس کا رہا ہوگا مگر بیماریوں اور جسمانی حالت کے سبب فرعون رے مسسز اول کا ہم مکتب دکھائی دیتا۔

اس رات جانے کیا کیفیت تھی کہ اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ مجھے اس کی ایک وصیت پوری کرنا ہوگی۔ میں تو ہچکچایا مگر اشوک نے جو جھومتا چلا آیا تھا مجھے مجبور کیا کہ میں وعدہ کرلوں۔ سلیم کا دل نہ توڑوں۔ مجھے وعدہ کرتے ہی بن پڑی۔ اس نے ایک خاکی ڈبہ دیا کہ اسے میں اس کے سینے پہ رکھ کر ہی دفن کرواؤں۔ میری بھی جان میں جان آئی کسی کورے لٹھے یا مشہدی رومال میں لپیٹ کر میں اس کے بھائیوں سے وصیت کے بارے میں کہتا تو وہ غم کے عالم میں کوئی مذہبی کتاب سمجھ کر سلیم کے سینے پہ رکھنے کی اجازت دے ہی دیتے۔

میں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے وعدہ کرلیا جس پہ سلیم مطمئن ہو گیا اور اشوک بھی کِھل اُٹھا۔ جھٹ مجھے گلے سے لگالیا۔ پینے سے محبت بڑھ جاتی ہے۔ جوش نے سچ کہا تھا کہ سرکار خود شہریوں کو اچھی اور سستی شراب مہیا کرے۔ اشوک راز دان تھا اس نے بتلایا کہ اس ڈبے میں انارکلی کی تصویر ہی ہوگی۔ سلیم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بہت اکیلا اکیلا محسوس ہوتا ہے۔ دل خالی خالی رہتا ہے، پھر بھی مجھے قربت کا احساس رہے گا یوں ہزاروں برس وہ میرے ساتھ رہے گی۔''

اشوک نے لوہا گرم دیکھ کر ہتھوڑا مارا۔

''اتنا قریبی دوست ہے، اسے تو بتلا دو راز اُگلنے سے دل ہلکا ہوتا ہے۔ بچی دیکھو کیسے Confection Box میں بول کر دل ہلکا کر لیتے ہیں۔''

سلیم چند لمحے متذبذب رہا''ہاں اب تو شاید یہ ایک ہی ماہ کی بات رہ چکی ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ مجھ سے بہتر کون جانے کہ زندگی کتنے دن رہ گئی ہے۔''میں نے تردید کرنے یا حوصلہ دلانے کی بات نہ کی۔ میں یہ راز جاننا چاہتا تھا۔ سلیم قدرے توقف کے بعد بول پڑا''صنوبر کے جنگلوں میں ہمارا گاؤں ہے۔ مگر ہم نے برساتی ندیوں اور پہاڑیوں سے زمین چھین چھین کر باغات بنا لیے جس کے باعث علاقے میں آسودگی آ گئی۔ میرے ہی گاؤں کی لڑکی جو دور کی رشتہ دار بھی تھی مجھ سے محبت کرنے لگی۔ ہماری محبت احترام کے رشتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے پروان چڑھتی رہی۔ ہم نے کبھی ایک دوسرے کا ہاتھ تک نہ تھاما۔ وہ میرے لیے اپنے ہاتھوں سے گلی بناتی، کبھی مشہدی رومال تحفہ دیتی۔ ہماری محبت کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ پھر مجھے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ ہماری ایک زمین جو دور کے پہاڑوں میں صدیوں سے ویران پڑی تھی کوئلہ اگلنے لگی۔ جس کے باعث ہم اچانک ہی امیر ہو گئے۔ میں نے شہر کی ماڈرن لڑکیاں دیکھیں، ڈائننگ ٹیبل پر چھری کانٹے سے کھانے والی لڑکیاں۔ چغتائی آرٹ کی مانند نازک اندام لڑکیاں تو ایک ہی برس میں زرعونہ کی اہمیت جاتی رہی۔ اس کا نام زرعونہ تھا۔ اسے نئے طور طریقے نہیں آتے تھے۔ انگریزی نہیں بول سکتی تھی۔ فیشن تو وہ جانتی ہی نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ کسی امیر کبیر گھرانے کی شہری لڑکی سے شادی بدرجہا بہتر رہے گی۔ ہاں وہ مجھے زرعونہ جیسی وارفتہ محبت تو نہیں دے سکے گی مگر دنیا میں ترقی محبت سے تو نہیں ہوتی۔ دنیا بھر میں بندوقوں کی زرداروں کی حکومت ہے۔ مجھے اس طبقہ میں شامل ہونا تھا۔ میں زرعونہ کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ میں نے طویل بے اعتنائی سے کام لیا اور جب وہ بہت ہی مایوس ہو گئی تو میں نے اسے بتا دیا کہ میں بڑا آدمی بننے جا رہا ہوں۔ میری زندگی میں اب اس کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ بہت روئی، بہت آنسو بہائے مگر میں شہر کی رنگینیوں میں کھویا رہا۔ پھر مجھے دل کا دورہ پڑا تو بستر پہ سوچنے کا موقع ملا۔ مجھے بیماریوں نے آ گھیرا۔ دوائیوں کے سائیڈ ایفیکٹس نے مار ڈالا۔ میں تقریباً اپاہج ہو گیا تو کسی طور اپنے گاؤں پہنچا۔ وہاں مجھ پہ دوسرا ہارٹ اٹیک ہوا جو شاید جذباتی تھا۔ زرعونہ کی شادی ہو گئی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ کراچی جا چکی تھی۔ گاؤں سائیں سائیں کر رہا تھا۔ صنوبر کے جنگل رو رہے تھے۔ زرعونہ کا گھر دیکھ کر دل ڈوبنے لگتا۔ اب اس گاؤں میں رہنا

دشوار تھا۔ میں واپس ہسپتال چلا آیا۔ مگر مریض بن کر۔ بستر سے لگا رہتا اور زرعونہ کی یہ تصویر فریم میں لگالی۔ اسی سے باتیں کرتا رہتا۔ پھر میں نے سوچا کہ مرنا تو مقدر ہے کیوں نہ کوئی نیکی کا کام کر جاؤں۔ بیماری کے باوجود ڈاکٹروں کے لیے اپنے ہی اخراجات سے میس چلانے لگا۔ ڈاکٹروں کو ذہنی آسودگی ہوئی۔ ورنہ تو وہ اردگرد کے ہوٹلوں میں جانے کیا کچھ کھایا کرتے تھے۔

سلیم چپ ہو رہا۔ سے سسکیاں لیتا رہا۔ اشوک نے سکوت توڑا۔ ''تمھیں شوق تو ہوگا ایک بار زرعونہ سے ملا جائے۔''

سلیم کو اقرار کرتے ہی بن پڑی۔ ''ہاں دل چاہتا تو بہت ہے مگر یہ ناممکن ہے۔ کراچی میں ہمارے لوگوں پہ حملے ہونے لگے۔ ان کے ہوٹل جلائے جانے لگے۔ تو اس کا شوہر امریکہ چلا گیا۔ امریکہ کا نام سن کر میں مایوس ہو گیا مگر اشوک تو ٹُن تھا۔ دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ تم جسے ممکن کہو، وہی ممکن ہو جاتا ہے۔

ماحول بہت غمگین اور فضا بہت بوجھل ہو چکی تھی۔ ہم دونوں اجازت لے کر چل دیے۔ سلیم بیٹھے بیٹھے ہاتھ ملایا کرتا تھا۔ اٹھنے کا یارا نہ تھا۔ اٹھنا بیٹھنا اس کے لیے ایک صبر آزما مرحلہ ہوا کرتا۔

راہداری میں اشوک نے مجھ سے وعدہ لیا کہ کل میں سرِ شام چلا آؤں۔ وہ ایک اہم بات مجھے بتلائے گا جس سے سلیم کو فائدہ پہنچے گا۔ وعدے کے مطابق میں سرِ شام اشوک کے ہاں جا پہنچا۔ اس کے دوست نہیں آئے تھے مگر وہ بوتل کھولے بیٹھا تھا۔ ''میری باتیں غور سے سنو! پکا ہندو ہونے کا مطلب ہے کہ باقی دنیا کی تمام حقیقتوں سے انکار کیا جائے اور پکا مسیحی ہونے کا بھی یہی اصول ہے کہ دنیا بھر کے تمام عقیدوں سے منہ موڑ لیا جائے۔'' اشوک کی زبان سے ایسے فلسفیانہ خیالات کے اظہار سے میں گرتے گرتے بچا۔ ''یہ وہسکی ہے یا کہ عقل و دانش گھول کر پی رہے ہو۔ خیر آگے کہو۔''

اشوک نے سر ہلایا۔ ''ہندو جوگی دھونی رماتے ہیں، جسے چھ کہتے ہیں۔ درۂ بولان کے اندر ایک چھ تھا جسے تم لوگ کھجور کا ایک درخت کہنے لگے۔ وہاں تو درجنوں درخت ہیں۔ چھ تو تم ایک ہی درخت کو کہتے ہو۔ انگریزوں کے ملازم بلوچستان آئے تو انھوں نے اپنے تلفظ اختیار کر لیے۔ سیوی کو سبّی۔ ثوراب کو سوراب زندگہ (پن چکی) کو زندرہ اور کالی پت کو خلیفت بنا دیا۔''

اشوک کی عالمانہ گفتگو سے میں بہت متاثر ہوا ''بہت اچھے! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے صاحبِ علم ہو۔ مگر اس کا ڈاکٹر سلیم سے کیا تعلق بنتا ہے۔ میں کہاں سے لاؤں زرعونہ۔ سلیم نے اس کا دل توڑ دیا۔ اس کی محبت کی توہین کی۔ اس کے پاؤں جا پکڑوں تو بھی نہیں آئے گی۔ عورت کی ضد بہت بری ہوتی ہے۔ راج ہٹ۔ بال ہٹ۔ تریا ہٹ۔''

اشوک نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا ''پوری بات سنو ہزاروں برس سے کالی دیوی کے دو مندر ہیں بلوچستان میں۔ ایک شہر اس کے نام پہ قلات کہلایا اور سلیم کے علاقے کا پہاڑ کالی پت کہلایا۔ اس بلند پہاڑ پہ کالی دیوی کا مندر ہے۔ اس کے سیوک ایک کاسہ لیے پھرتے ہیں جس میں دو سیر گیہوں آتا ہے۔ اس کے سیوک صرف گیہوں کی روٹی کھاتے اور اپنا کاسہ بڑھا کر سوال کرتے۔ کالی پت! یعنی یہ پت کالی کا ہے اس میں دو سیر گیہوں کا دان دو۔ پھر وہ اسی بلند و بالا پہاڑ پہ چڑھتے ہوئے کالی ماں کے مندر میں چلے آتے اور اپنی پوجا پاٹ کرتے۔ لوگ اس پہاڑ کو بھی ان سیوکوں کے باعث کالی پت کہنے لگے۔ جب وسط ایشیا کے مسلمان حملہ آور ہونے لگے تو محمود غزنوی نے بامیان کے ڈیڑھ سو فٹ بلند بتوں سے نظریں چرائیں اور سومناتھ پہ حملہ کر دیا۔ مقامی آبادی نے مندر کو جو غار کے اندر تھا۔ پتھروں، خودرو جھاڑیوں اور جنگلی درختوں سے یوں چھپا دیا کہ چند سو برس گزرنے کے بعد ایک ہی خاندان کو نسل در نسل اس غار کا علم رہا جس کا دہانہ چھپا دیا گیا تھا۔ باقی دنیا لاعلم رہ گئی۔''

ڈاکٹر اشوک کی محویت، سنجیدگی اور لہجے کی سچائی کے باعث میں خاموش ہی رہا کیونکہ وہ ایک روانی میں بولے جا رہا تھا۔ اس کے بیان میں صداقت سی محسوس ہوتی۔ ''اگر تم کالی پت یعنی خلیفت جاؤ جس کا راستہ ہمارا ایک خاندانی راز ہے تو دیوی سلیم کے مرنے سے پہلے اس کی ملاقات زرعونہ سے کرا دے گی۔ مجھے یقین ہے کہ تم راز کو راز ہی رکھو گے اور یہ راز بھی میں محض ڈاکٹر سلیم کے لیے افشا کرنا چاہتا ہوں کیونکہ وہ ستوگنی ہے۔''

میں نے سوچنے کے لیے وقت لیا۔ یہ ایک دلچسپ تجربہ تھا۔ مجھے ایک قدیم ترین مندر کا علم ہو جاتا جو کہ دنیا والوں کی نظروں سے پوشیدہ تھا اور اگر واقعی کوئی کمال ہو جاتا جس کی مجھے قطعاً امید نہ تھی تو ڈاکٹر سلیم کو کس قدر خوشی ملتی۔ زیر تعلیم، ہاؤس جاب کرنے والوں کے میس کو کس لگن اور خلوص سے چلا رہا تھا۔ مجھے تو وہ تھامس بیکٹ اور مدر ٹریسا جیسا عظیم انسان لگتا۔ جس کی خاطر میں اس اقدام کے لیے تیار ہو گیا۔ اشوک نے بتلایا کہ کالی گھاٹ مندر کولکتہ، قلات اور کالی پت میں ہیں۔ یہ دیوی موت اور وقت کا مظہر ہے۔ مگر ماں بھی ہے۔ اپنے اٹھاراں ہاتھوں سے مدد کرتی ہے۔ بہتر دن سوموار، بدھ اور ہفتہ ہیں، کوئی اس کے چرنوں پہ پھول چڑھائے، بکرے کی بلی دے تو کام ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ سب کچھ داستان جیسا لگا مگر سلیم کی خاطر ایک تجربے میں کیا حرج تھا۔ اشوک نے یہ حلف بھی لیا کہ میں نہ تو مندر کی بات کسی کو بتاؤں گا اور نہ ہی کبھی راستہ بتلاؤں گا۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ اشوک کو مجھ پہ بھروسہ تھا۔ ہمارے اولین وزیر قانون جوگندناتھ منڈل نے جن انسان دشمن زیادتیوں کے باعث احتجاجاً استعفیٰ دیا تھا، ان میں اب کہیں زیادہ اضافہ ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کے اغوا اور لڑکیوں سے زبردستی شادی روز کا معمول تھا۔ ایسے میں اشوک کی ہم سے ہمدردی اور بھروسہ ایک اعزاز سے کم

نہ تھا۔

مندر کا ایک راستہ اغبر گ سے تھا اور دوسرا زیارت سے گزر کر ژ ژری سے۔ وہ مجھے نسبتاً آسان لگا کیوں کہ اغبر گ کا راستہ پیدل کا تھا۔ پہاڑی دراڑوں اور برساتی ندی نالوں سے گزرنا پڑتا۔ جبکہ زیارت اور پھر ژ ژری تک ایک اچھی سڑک تھی جس سے میری جیپ بہ آسانی گزر جاتی۔ میں احتیاطاً کولت 44 میگنم اور کلاشنکوف کے علاوہ پھولوں کے ہار ساتھ لیتا گیا۔ ژ ژری سے دو پگڈنڈیاں کالی پت کی چوٹی پہ جاتی ہیں۔ میں نے یہاں بھی نسبتاً کم چڑھائی والی پگڈنڈی اختیار کی۔ شام کے قریب میں غار کے دہانے تک پہنچ گیا۔ اس بلندی پہ جو دس ہزار فٹ سے کم نہ تھی۔ چند ایک جھونپڑیاں تھیں۔ جن کے مکین صدیوں سے غار کے دہانے کی حفاظت کرتے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر اشوک سے حاصل کردہ قدیم ہار دکھایا تو وہ رام ہو گئے اور غار کے اندر لے گئے، جو کسی طور نظر نہیں آتی تھی۔ یہاں کالی دیوی کا ایک بہت بڑا بت سیاہ پتھر کو تراش کے بنایا گیا تھا۔ غار میں بڑے بڑے پتھریلے طاق روشن تھے۔ جنہیں ہزاروں برس سے جانے کہاں سے تیل مل رہا تھا۔ شاید اسی پہاڑ کا تیل کسی طور پہ رِس رِس کر آ رہا تھا۔ اس غار میں ایک خوفناک سناٹا تھا اور کالی ماں کی مورتی کے سامنے جاتے ہوئے تو میں بے حد خوفزدہ ہو گیا۔ میں نے سپھک کے بعد پھول چڑھائے، بوتل قدموں میں پھوڑی۔ اشوک کے الفاظ دہرائے باقی دیوی دیوتا تو شا کاہاری ہے۔ جبکہ کالی ماں تو بَلی بھی مانگتی ہے۔ میں الٹے قدموں غار سے باہر چلا آیا۔ پہاڑی وادیوں پہ گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہوائیں سائیں سائیں کر رہی تھیں۔ فضا میں شمشوب کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی غرضیکہ نہایت ہی خوفناک منظر تھا۔ غار کے باہر پتھروں کے حجرے تھے جن میں ان جانے اور ریاسل قدیم لباس میں ملبوس پُراسرار انداز میں تپیا کر رہے تھے۔ وہاں کمروں میں آتش دان روشن تھے۔ مشعلوں سے لرزتا ماحول نہایت بھیانک لگ رہا تھا۔ میں نے اشوک کا پُراسرار ہار دکھایا تو تعظیماً ڈنڈوت کرنے لگے۔ مجھے بہت حیرت ہوئی جواباً میں نے بھی دل پہ داہنا ہاتھ رکھا اور جھک سا گیا۔ سارا ماحول پُراسرار اور حیرت انگیز تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے میں راجہ دشیت کے دور میں چلا آیا ہوں۔ یا چندر گپت موریہ کے عہد میں جس نے یونانیوں سے یہ علاقہ بزور شمشیر چھین لیا تھا۔ ادب آداب کے بعد میں ان سنگی حجروں سے باہر چلا آیا۔ دھواں لوبان کی خوشبو مشعلیں جلنے سے پیدا ہونے والی حرارت غرضیکہ ایک ملا جلا تاثر دیومالائی تھا۔

باہر نکل کر میں نے بوٹ پہنے۔ پہاڑوں میں بھیڑیوں کی آوازیں خاصی قریب محسوس ہو رہی تھیں۔ جن کے مقابل میرے میزبانوں کے کتے نکل آئے تھے۔ بھونک بھونک کر وہ بھیڑیوں کو اپنی موجودگی سے خبردار کر رہے تھے۔ ہوا کے تیز و طرار جھونکے اس پہ مستزاد۔ میرے میزبانوں کا گزر بسر بھیڑ بکریوں پہ تھا۔

پابند صوم وصلوٰۃ تھے۔ سادہ سی زندگی بسر کرتے اور کسی اجنبی کو اپنی حدود میں داخل نہ ہونے دیتے۔ کم کم گفتگو کرتے۔ اگلی صبح ان کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہوا۔ پگڈنڈیوں سے جو خاصی دشوار گزار تھیں محتاط انداز میں چلنا پڑا۔ ایک ذرا سی غلطی اندھیری عمیق گہرائیوں میں گرا دیتی۔ رات کے ہیبت ناک ماحول کا اثر دل پہ طاری رہا۔ جیپ محفوظ تھی۔ ایک انگڑائی سی لے کر جاگ اٹھی۔

واپسی پہ میں اشوک سے ملا، اس کا ہار لوٹا دیا۔ وہ بہت مطمئن سا لگ رہا تھا۔ واقعات اس نے کرید کرید کر پوچھے۔ میں نے بتلایا کہ داخل ہوتے ہی گھنٹہ بجا کر جے ماں کالی کہا تھا تو وہ خوش ہوا۔ چٹکی بجا کر بولا شینخو کا کام بن گیا۔

شینخو کی حالت بگڑ رہی تھی مگر اس نے مصمم ارادہ کر رکھا تھا کہ وارڈ کے بستر میں مرنے کی بجائے وہ مناڈے اور ہیمنت کمار سنتے ہوئے جان دے گا۔ درد کی شدت اس کے چہرے پہ سمٹ آئی مگر وہ گیت ہی سنتا رہا۔ شہر خاصہ گرم تھا۔ ہسپتال گرمی سے پھنک رہا تھا۔ جلتے ہوئے پہاڑوں سے بادِ سموم کے جھکڑ اسی پیالہ نما وادی میں در آئے۔ بہت عرصہ ہوا بادل یہاں کا رُخ نہیں کر رہے تھے۔ لوگ باگ کہتے کہ ہم جو ایٹمی طاقت بنے ہیں، یہ اسی کی ناطاقتی ہے، نہ بارش نہ پانی۔ ایٹمی ہتھیار والے العطش العطش پکار رہے تھے۔ ہر طرف قحط سا پڑ گیا تھا۔ یوں بھوکوں مرنے سے تو بہتر ہوتا کہ ایٹم بم کو ہی پاپڑ کی مانند چبانے لگتے۔ صوبے بھر کی فضا پہ عزیزِ مصر کے خواب والی Al Nino طاری تھی۔ یہ گرم ساکت ہوائیں بادل نہ بننے دیتیں اور گماں تھا کہ سات سوکھی سڑی بھینسیں جنہیں دیکھا تو عزیزِ مصر نے کہا تھا وہ اس کی مصری بیوی آسناتھ کے پاس جانے کی بجائے ہمارے ہی پاس چلی آئی ہوں۔

سات برس کا قحط ہمارا مقدر بن چکا تھا۔ آڑتی میں بھی قحط پڑ گیا تھا۔ لاشیں گرنے لگی تھیں۔ ایک ایسی ہی مسموم سہ پہر میں جبکہ لال آسمان آگ برسا رہا تھا۔ مجھے اشوک کا فون آیا بالکل مختصر سا۔ مگر دل دہلا دینے والا ''شینخو کی طبیعت خراب ہے جلدی سے چلے آؤ۔'' میرا ماتھا ٹھنکا اور باہر بھاگا۔ وہ اشوک کے ساتھ پارکنگ میں نکل آیا اور ایک بینچ پہ آ بیٹھا۔ خانساماں اور ملازم حواس باختہ دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر اشوک نے اطمینان کا سانس لیا۔ شینخو نے بھی مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ کئی روز سے اس نے کپڑے نہیں بدلے تھے۔ اسی ہیئت کذائی میں ہی باہر چلا آیا تھا۔ باہر روشنی میں چلے آنے کے سبب ان کے داغ دھبے شکنیں زیادہ ہی نمایاں تھیں۔ سوجے ہوئے پیروں میں ہوائی چپل۔ اس کی حالت دیکھ کر بہت ہی دکھ ہوا۔ ہم نے چائے لانے کو کہا۔ اور پھر وہیں بینچوں پہ چائے کے مگ تھام لیے۔ درختوں کی چھاؤں بھلی لگ رہی تھی۔ اچانک ہمارے مقابل پارکنگ میں سیاہ رنگ کی چمکتی دمکتی کراؤن ٹلکسل کار آن رُکی۔ یوں لگتا تھا کوئی سربراہِ مملکت

بی پی چیک کرانے چلا آیا ہو۔ کار کا ڈرائیور دائیں بائیں نگاہ دوڑاتا ہمارے پاس چلا آیا۔ اور مؤدبانہ انداز میں ڈاکٹر سلیم کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے شیخو کی جانب اشارہ کر کے بتلایا کہ یہی ڈاکٹر سلیم ہیں۔ کیونکہ شیخو بولنے کے قابل نہ تھا۔ جانے کیسے چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ مؤدب سا ڈرائیور کار کے پاس پلٹا اور اس نے پچھلا دروازہ کھولا اور گفتگو کی جو ہم سن نہ پائے۔ معاً کار سے ایک بے انتہا خوبصورت اور پروقار خاتون ایک شان دلربائی سے چلتی ہوئی ہمارے پاس چلی آئی۔

جیسے کرشن بھگوان نے اپنے سارے روپ ارجن کو ایک ساتھ ہی دکھائے ہوں۔ ہم دم بخود رہ گئے۔ دھوپ کا قیمتی چشمہ اس کی آنکھوں پہ تھا۔ جس کے آسمانی شیشوں سے اس کی قیامت خیز ہوش ربا آنکھیں جھانک رہی تھیں۔ میکبتھ کو اس قدر حیرت تو Great Birnam Wood کو اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر نہیں ہوئی ہوگی۔ جتنی کہ مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ اشوک اور میں احتراماً کھڑے ہو گئے۔ مگ بدستور ہمارے ہاتھ میں رہے۔ وہ شیخو کے پاس آئی۔

"ڈاکٹر سلیم مجھے پہچانا" اس کے لہجے میں آگ تھی، طنز تھا۔ شیخو نے سر نفی میں ہلایا۔ اور موٹے موٹے سیاہ شیشوں والی عینک سے متعجب ہو کر اسے دیکھا۔ پہلے تو اس خاتون کی آنکھوں میں کاٹ تھی۔ لہجے میں فخر تھا۔ ایک احساسِ برتری تھا مگر شیخو کی حالت دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا۔ آواز بھی گلوگیر ہو گئی۔ جیسے رو ہی دے گی۔ "مجھے پہچانا سلیم" اس نے امریکن لہجے کی انگریزی میں دوبارہ سوال دہرایا۔ پھر وہ خود ہی بول پڑی "تمہارے گاؤں کی ایک غریب اَن پڑھ لڑکی تم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ یاد ہے وہ لڑکی؟" سلیم تڑپ اٹھا "ہاں زرعونہ! کہاں ہے وہ؟" وہ خاتون آنسو پی کر بولی "میں ہی ہوں وہ زرعونہ۔" ایک قیامت گزر گئی۔ آنسو روکنے کی کوشش میں پروقار انداز میں پلٹی اور کار میں جا بیٹھی۔ ادھر کار مڑی ادھر ایک چھناکا ہوا، سلیم کے ہاتھوں سے مگ گر کر ریزہ ریزہ ہو گیا۔ سر ڈھلک گیا تھا۔ "سنبھالو اشوک!" میں لپکا مگر اشوک نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے جذباتی ہونے سے روکا۔ "اس جنم سے مکتی مل گئی ہے۔ آخری خواہش بھی پوری ہو گئی۔ تم کالی پت جانے کی فکر کرو۔ بکرا تم لیتے جانا بوتل میں دے دوں گا۔

☆☆☆☆

خالد فتح محمد

دل کو دل سے راہ

جیل روڈ پر ٹریفک پانی کی طرح بہتا جاتا تھا اور ہم دونوں کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے؛ وہ مشتعل اور میں سمجھوتا کرنے کو تیار۔ ایسا جھگڑا پہلی بار نہیں ہوا تھا لیکن مجھے لگا کہ اِس بار وہ زیادہ ہی سنجیدہ تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ہمیشہ قرب کی اپنائیت ہوتی تھی اور آج وہی آنکھیں اجنبیت اور بے گانگی کا عکس لیے ہوئے تھیں۔ میں اُسے کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا تھا لیکن اپنانے کا فیصلہ بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو اتنی تفصیل سے جانتے تھے کہ شاید اِس قرب سے اپنی اپنی جگہ دونوں خائف تھے۔ رکشا اُس کا منتظر تھا۔ مجھے کچھ کہنا مناسب لگا:

’’اِس طرح بگڑ کے مت جاؤ۔‘‘ میں بے یقینی سے کہہ پایا۔

’’کیوں؟ ہمیں ملا ہی کیا ہے!‘‘ پیشتر اِس کے کہ میں کوئی جواب دوں، وہ رکشے میں بیٹھ گئی۔ اُس نے میری طرف نہیں دیکھا، مجھے لگا وہ میری طرف دیکھنے سے خائف ہے؛ اور رکشہ چل پڑا۔

ہم جیل روڈ پر ایک پرانے بنگلے میں رہتے تھے۔ یہ بنگلہ ہندوستان میں انگریزوں کی سہولت کے تحت اپنائے گئے، ہسپانوی طرزِ تعمیر سے ملتے جلتے نقشے والا تھا جس میں تمام گھر کے گرد برامدہ تھا۔ دیواریں بھی خاصی چوڑی تھیں۔ محرابوں والے پورچ کے بعد سرسبز لان تھا جس کے پیچھے باڑ اور پھر حفاظتی دیوار! اِس دیوار پر بوگن ولا کی بیلیں اِس طرح چڑھائی گئی تھیں کہ وہ سڑک کی طرف زمین کو چھو رہی تھیں اور اُن پر سفید، سرخ اور کہیں کہیں زرد رنگ کے پھولوں کی بھرمار تھی؛ اِسے بیلوں والی کوٹھی بھی کہا جاتا تھا۔ یہ وہ دن تھے جب جمالیات ہر سوچ پر حاوی تھیں اور پھر بتدریج معاشیات، جمالیات پر حاوی ہونے لگیں اور ڈیڈی نے اردگرد وجود پاتی کاروں کی مارکیٹ کا حصہ بننے کا فیصلہ کرلیا جو امی کی مرضی اور احتجاج کو نظر انداز کرتے ہوئے کیا گیا۔ وہ اپنے تئیں ترقی کی راہ پر چل پڑے تھے۔ آدھا لان شو رومز میں تبدیل ہو گیا اور کار مارکیٹ کی کھڑکیاں ہمارے گھر کی طرف کھلتی تھیں اور ہم موٹی دیواروں والے بنگلے کے کمروں کے سیلن زدہ اندھیروں میں مقید ہو گئے۔

پھوپھو شمشاد اور ڈیڈی کے دادا چچا زاد تھے۔ وہ کبھی کبھار ہمارے گھر آتیں اور ڈیڈی اُن کے ساتھ مل کر دور نزدیک کے رشتہ داروں کا کھوج شروع کر دیتے۔ ڈیڈی اپنی ڈائری گود میں رکھے ہوتے اور اُن کے ہاتھ

میں پڑھنے والا چشمہ ہوتا۔ پھوپھو شمشاد کے ساتھ باتوں میں کوئی نئی اطلاع ملتی تو چشمہ لگا کر لکھ لیتے یا اگر پھوپھو کی درستی کرنی ہوتی تو ڈائری کھول لیتے۔ وہ جب آتیں تو امی اور میں تھوڑی دیر اُن کے پاس بیٹھتے اور جب اُن دونوں میں سے کوئی کہتا: ''مجھے نادر خاں کے متعلق نئی اطلاع ملی ہے!'' تو ہم وہاں سے اُٹھ جاتے۔ پھوپھو کے ساتھ اُن کی بیٹی بھی ہوتی جو مجھ سے چار برس چھوٹی تھی۔ میں نے روبینہ کی طرف کبھی توجہ نہیں دی تھی۔ میں اُن دنوں میں ایم اے کا طالبِ علم تھا اور میری نظر لڑکیوں کے جسموں کے خطوط کو پڑھنے لگی تھی۔ ایک دن میں نے اُسی نظر سے روبینہ کو دیکھا۔ اُس کا سانولا سا چہرہ، چھوٹی اور ترچھی آنکھیں بے تاثر تھیں اور اُس کا بدن بھی بے رس سا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے خاصی مایوسی ہوئی۔ وہ گود میں ہاتھ رکھے بیٹھی دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو کھرچتی رہتی اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے ہاتھ دیکھ لیتی۔ مجھے اُس کی یہ مسلسل حرکت کوئی ذہنی اور نفسیاتی ناہمواری لگی۔ مجھے اُس پر ترس آیا۔

پھوپھو شمشاد نے ایک دم آنا جانا بند کر دیا اور سننے میں آیا کہ وہ شدید علیل ہیں؛ اتنی شدید کہ زندہ رہنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں۔ ہمارے گھر میں اُن کا اکثر ذکر رہتا اور والد اُنھیں بہت دکھی لہجے میں یاد کرتے۔ گھر کا ماحول اچانک بوجھل سا ہو جاتا اور ہم سب اُن کی جلد صحت یابی کے لیے دعا گو ہو جاتے۔ ایک دن ڈیڈی نے مجھے بلا کر پونچھ روڈ پر پھوپھو شمشاد کے گھر جانے کا کہا اور ڈائری کھول کر اُن کے گھر کا نقشہ اتنی تفصیل سے سمجھایا کہ میں اپنی سوزوکی میں کسی دقت کے بغیر اُن کے گھر پہنچ گیا۔ وہ جب مجھے اتنی باریکی سے راستہ سمجھا رہے تھے تو میں اپنے آپ کو نیکر قمیص میں ملبوس اُس بچے کی طرح محسوس کرتا جس کا سکول سڑک کے پار ہونے کے باوجود ڈیڈی وہاں پہنچنے کا راستہ روز سمجھاتے۔ میں پھوپھو شمشاد کے گھر اُس اندھے کی طرح پہنچا جس نے اپنی منزل تک قدم ناپے ہوتے ہیں۔ میں نے ہدایات کے مطابق ایک کیک بھی لے کے جانا تھا اور مجھے کوفی کیک بہت پسند تھا۔ میں نے جب بھی کہیں کیک لے کے جانا ہوتا تو کوفی کیک ہی لے کے جاتا۔ عموماً گھر والے اُس کیک کو بھی پیش کرتے اور میں اُن کا پیش کیا ہوا ایک ٹکڑا کھاتا اور دوسرا اپنی مرضی سے اُٹھا لیتا۔

باہر سڑک پر کافی شور تھا اور میرا خیال تھا کہ یہ شور اندر گھر میں بھی پہنچ رہا ہوگا۔ میں نے کیک ایک ہاتھ میں تھامے لمبی گھنٹی دی اور اُکتا دینے والے وقفے کے بعد دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میرے سامنے روبینہ کھڑی تھی اور یہ یقیناً وہ روبینہ نہیں تھی جسے میں نے آخری مرتبہ دو برس پہلے دیکھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اُس کا متجسس چہرہ کھل اُٹھا۔ اُس کے گالوں پر خوشی کی سرخی اور آنکھوں میں اپنائیت کی چمک پھیل گئی۔ وہ سرخی اور چمک وہاں قائم رہی اور مجھے لگا کہ میرے سامنے ایک تصویر ہے جس کے تاثر میں تبدیلی نہیں آ سکتی۔ اُس کے بدن کی کساوٹ دیکھ کر میرے ذہن میں بشیر مرزا کے nude گھوم گئے اور میں نے اپنے تصور میں اُس کے کسے ہوئے بدن کو nude میں بھی دیکھ لیا۔

وہ تصویر کی طرح مجھے دیکھے جا رہی تھی!

میں تھوڑا سا حرکت میں آیا تو اُسے اپنے آپ کا احساس ہوا۔ اُس نے ایک طرف کو ہٹتے ہوئے میرے لیے راستہ چھوڑا اور میں اندر داخل ہو گیا۔ پھوپھو شمشاد پلنگ کے ساتھ ٹیک لگائے پریشانی کے ساتھ آنے والے کے انتظار میں تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی اُن کے چہرے پر سکون بھری مسکراہٹ پھیل گئی۔

"آؤ بیٹا، آؤ! تم لوگ ہی تو میرے لیے فکرمند ہو۔ میرا اور ہے کون؟" اُن کی آواز بھاری ہو گئی۔ مجھے اُن کی آنکھوں میں آنسو تو نظر نہیں آئے لیکن میں اُن کی خشک آنکھوں میں خاموش آنسوؤں کا دریا دیکھ سکتا تھا۔ اُنھوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور میں نے اپنا سر اُن کے ہاتھ کے آگے جھکا دیا۔

"بیٹھو بیٹا!" اُنھوں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں کونے میں پڑی تپائی پر کیک رکھ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ روبینہ، ہمارے گھر کی طرح، یہاں بھی ایک کونے میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ اُس کا دائیں ہاتھ کا انگوٹھا دوسرے ہاتھ کی انگلیاں کھرچنے کے بجائے ہتھیلی میں تھامے موبائل فون سے کھیل رہا تھا۔ میں نے بھی احتیاطاً اپنی چھاتی والی جیب میں رکھے موبائل فون کو محسوس کیا۔

"کیسی ہیں پھوپھو آپ؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ مجھے کسی بھی مریض کا حال پوچھنا ایک احمقانہ سی کارروائی لگا کرتا تھا اور میرے لیے حال پوچھنے سے کسی لڑکی سے بے تکلف بات کرنا ایک آسان مرحلہ تھا۔

"کیا بتاؤں احمد بیٹا! مجھے تو لگا کہ بلاوا آ گیا ہے۔ پھر میں نے منت بھری درخواست کی کہ تھوڑا رُک جائیں، میری ابھی،" اُنھوں نے پہلے روبینہ اور پھر میری طرف دیکھا۔ مجھے یہ اُس کے لیے ایک اشارہ اور اپنے لیے پیغام لگا۔ "کچھ ذمے داریاں ہیں جنھیں پورا کر لوں تو چلی آؤں گی۔" وہ ایک بھاری سی ہنسی ہنسیں۔ اُن کے مایوسی بھرے لہجے سے میں کچھ پریشان ہوا، میں نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اُنھیں دیکھتا رہا۔

"امی!" روبینہ کی آواز سے میں چونک گیا۔ میں نے اُسے کبھی بولنے کے لیے بات کرتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ مجھے اُس کی آواز میں کسی حد تک درشتی کا احساس ہوا۔ میں اُس کے بات جاری رکھنے کے انتظار میں اُسے دیکھتا رہا۔ "وہ جب بلائیں تو پھر جانا ہی پڑتا ہے۔" اُس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ مجھے اُس کی ہنسی میں بے تکلفی کا عکس نظر آیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ ہنستی ہی جائے۔ "آپ ایسی باتیں نہ سوچا کریں۔"

"تم بھی ٹھیک کہتی ہو لیکن سوچوں کیسے نا۔" اُن کے چہرے کا تاثر یک دم تبدیل ہو گیا، "ہم روز کی ہوئی باتیں ہی کرتے جائیں گے یا احمد بیٹے کی خاطر بھی کریں گے؟" اب وہ اپنائیت سے مسکرا رہی تھیں۔ روبینہ موبائل فون سے کھیلنا ترک کر کے اُسی وقت اُٹھی اور کیک اُٹھا کے کمرے سے باہر چلی گئی۔ میں کوفی کیک کے ٹکڑے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ جوس کا ایک چھوٹا مگر فینسی سا گلاس لیے آ گئی۔ میں نے گلاس لیا

اور جوس پینا شروع کر دیا۔ ابھی جوس ختم نہیں کیا تھا کہ وہ چائے کے دو پیالے اور کچھ کھانے کے لیے بھی لے آئی۔ مجھے مایوسی ہوئی کہ وہ چائے کے ساتھ کیک نہیں لائی تھی۔ پھوپھو شمشاد کی باتیں دل چسپ تو تھیں لیکن میں جلد اُکتا گیا۔ میں روبینہ کے ساتھ دروازے کے پاس کچھ دیر کھڑے ہونا چاہتا تھا۔ چائے ختم ہوتے ہی میں نے اجازت لیے بغیر اُن کے سامنے سر جھکا دیا اور اُنھوں نے دعاؤں کے ساتھ مجھے الوداع کیا۔

باہر نکلنے سے پہلے میں اچانک رکا جیسے کچھ یاد آ گیا ہو۔

”میرا موبائل فون نمبر لے لو اور مجھے مس کال کرو۔“ میں نے اپنی بے اعتمادی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

روبینہ نے تیزی کے ساتھ پلکیں جھپکیں جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ ”بتائیں!“

”زیرو تھری زیرو سکس، ڈبل سکس فور ٹو ایٹ فور سکس۔“

”اب کال کرو۔“ میں نے کہا۔ میرے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ باہر کافی شور تھا جس کا مجھے احساس نہیں ہوا، اُس وقت میرے اندر اتنا شور تھا کہ مجھے کچھ سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ ہم اُسی طرح خاموش کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر میں ایک دم باہر نکل گیا۔

میں اُسی دن روبینہ کو ایس ایم ایس کرنا چاہتا تھا لیکن بار بار یہ خیال آتا کہ اتنی جلدی مناسب نہیں۔ اُس نے اگر اپنا نمبر مجھے دیا ہے تو اِسی لیے دیا ہے کہ ہم قریب ہو جائیں، میری جلد بازی شاید میرے مجموعی تاثر پر اثر انداز ہو۔ مجھے چند دِن انتظار کرنا ہی واجب لگا، یہ بھی میرے ذہن میں آیا کہ شاید وہ بھی میرے پیغام کی منتظر ہو اِس لیے میں نے اُسے انتظار کرانا بھی مناسب سمجھا۔ میری حالت تنور پر اُس بھوکے والی تھی جس کی باری نہیں آ رہی ہو۔ میں نے اُس سے رابطہ کرنے کا کوئی ٹائم ٹیبل تو طے نہیں کیا تھا لیکن مجھے رات کا وقت سب سے مناسب لگا جب ہم بغیر کسی رکاوٹ کے جیسی چاہیں chat کر سکتے تھے۔ میں ایک خواب یا خوش فہمی میں گم تھا کہ ہم اِس رِشتے میں نئے لطف دریافت کریں گے۔ ایک رات میں نے اُسے ”ہیلو“ کا پیغام بھیج دیا اور پھر سکرین کے چمکنے کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے جوابی پیغام موصول نہیں ہوا۔ میں سمجھا کہ شاید وہ بات کرنا نہیں چاہتی یا کسی طرح میرا نمبر اُس سے ڈیلیٹ ہو گیا ہے اور یا اب وہ مجھے انتظار کروا رہی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اُسے یاددہانی کا پیغام بھیجوں یا اپنی عزتِ نفس محفوظ رکھوں کہ سکرین اچانک روشن ہو گئی اور اُس کا جوابی ”ہیلو“ موصول ہو گیا۔

ہم chat کے طویل سفر پر چل نکلے جس کا آغاز معمول کے حال احوال پوچھنے سے ہوا۔ شروع میں مجھے یہ ایک مشکل سفر لگا کیوں کہ میں روبینہ کے مزاج سے واقف نہیں تھا۔ میں نے اُسے کبھی کم از کم ضرورت کے علاوہ بات کرتے نہیں سنا تھا اور اگر میں کوئی ایسی بات کہہ یا پوچھ یا تقاضا کر لوں جو اُس کے مزاج کے منافی ہو تو اُس کا کیا ردِعمل ہوگا؟ لیکن میں نہایت ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ اُس طرف بڑھتا رہا جس طرف میں

جانا چاہتا تھا اور روبینہ کا تعاون میرا حوصلہ بھی بڑھاتا رہا۔ ہم نے مرحلہ وار چلتے ہوئے تکلف کے تمام پردے ہٹا دیے۔

پھوپھو شمشاد اب ہمارے گھر آنے لگی تھیں اور ڈیڈی کے ساتھ اُن کی طویل ملاقاتیں شروع ہو گئیں۔ میں ہمیشہ کی طرح کچھ دیر وہاں بیٹھتا اور پھر اُکتاہٹ کا شکار ہو کے یا اُکتاہٹ سے بچنے کے لیے وہاں سے اُٹھ جاتا۔ روبینہ اپنے معمول کی جگہ پر بیٹھی موبائل فون سے کھیلتی رہتی اور میں اپنے کمرے یا برآمدے کے کسی پرسکون حصے میں بیٹھ کے اُس کے ساتھ گپ لگاتا۔ مجھے اُس کے صبر، حوصلے اور ہمت کی داد دینا پڑتی کہ وہ کئی گھنٹے، بغیر ہلے، اُسی جگہ پر بیٹھی رہتی۔ مجھے بعض اوقات محسوس ہوتا کہ وہ کسی گہرے راز کی حفاظت کے لیے اُس کمرے سے باہر نہیں جاتی۔ میں کبھی اُس کی احتیاط یا عدم دل چسپی کے رویے سے اُکتا بھی جاتا۔ اب میں چاہ رہا تھا کہ جو ہم سکرین پر لکھ کر کرتے ہیں وہ کسی طور عملی طور پر دہرایا بھی جائے۔

ایک دن امی گھر پر نہیں تھیں اور وہ والد کی لائبریری میں پھوپھو شمشاد اور والد کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں احتیاطاً وہاں نہیں گیا اور اپنے کمرے سے پیغام بھیجا کہ پانچ منٹ کے لیے وہ مجھے ملنے میرے کمرے میں آئے۔ مجھے اُس کے جوابی پیغام سے حیرت ہوئی کہ اُس نے میرا کمرہ نہیں دیکھا ہوا تھا۔ اِس سے پہلے وہ ہمارے تنہائی میں ملنے کے میرے کئی پیغام نظر انداز کر چکی تھی۔ میں نے اُسے لائبریری سے باہر آنے کا کہا اور اپنے کمرے سے نکل کر اُس کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اعتماد سے چلتی ہوئی پورچ کی طرف کھلنے والے بڑے دروازے کی طرف آئی۔ وہ اتنی پُراعتماد تھی کہ مجھے گھبرائی ہوئی لگی۔ اُس کی گھبراہٹ چال کے بجائے ارد گرد دیکھنے میں تھی اور پھر مجھے دیکھتے ہی وہ شرمیلی سی مسکراہٹ مسکرائی۔ جب سے ہم نے موبائل پر جنسی chat شروع کی تھی یہ ہماری اکیلے میں ہونے والی پہلی ملاقات تھی۔ اُس کے تمام فقرے میرے ذہن میں گھوم گئے اور یقیناً میرا لکھا ہوا بھی اُس کے دماغ کی سکرین پر جھلملا گیا ہوگا۔ میں بھی ایک طرح سے ہلکی سی جھجک کا شکار تھا۔

میں اپنے کمرے کی طرف چل پڑا اور وہ میرے پیچھے آتی گئی، اتنا پیچھے کہ اُس دوپہر وہ سب دہرایا گیا جو ہم سکرین پر لفظوں کے ذریعے لکھتے تھے۔ اور پھر یہ ہمارا معمول بن گیا۔ ہمارے تعلقات، تنہائی میں ہونے والی ملاقات تک اچھے رہتے اور پھر وہ ایک دم دور ہو جاتی۔ وہ گناہ اور ثواب کے ایسے گرداب میں پھنس جاتی جو اُسے پچھتاوے کے چکر دیتا رہتا۔ شروع میں مَیں اُسے منانے کی کوشش کرتا اور لگاتار اُسے، اپنے خیال میں، دل چسپی سے بھرے پیغام بھیجتا رہتا لیکن اُس کی طرف سے مکمل خاموشی ہوتی۔ پھر ایک دن اُس کا بظاہر غیر اہم لیکن نہایت گہرا “ہیلو” کا پیغام سکرین پر رقص کر جاتا اور ہم ایک شرمیلے سے تکلف سے بے تکلفانہ قرب کے سفر پر چل نکلتے اور یہ اُس وقت ختم ہوتا جب ہماری تنہائی میں ملاقات ہو جاتی۔

اب جب وہ دور ہوتی تو میں بھی خاموشی اختیار کر جاتا!

وہ کئی بار اشارتاً مجھے بتاتی کہ پھوپھو شمشاد اُس کے لیے رشتے دیکھ رہی ہیں۔ جب وہ یہ بتا رہی ہوتی تو مجھے اُس کا چہرہ بے تاثر لگتا؛ ایسے محسوس ہوتا کہ مجھے ٹوہ رہی ہے۔ وہ وقت ایک طرح سے میرے لیے خاصا کٹھن ہوتا۔ کیا وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی؟ یقیناً! کیا میں بھی اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا؟ میرے پاس اِس کا جواب نہیں تھا لیکن شادی نہ کرنے کا جواز ضرور تھا۔ ڈیڈی ہمیشہ کہا کرتے کہ اُن کی شادی پینتیس سال کی عمر میں ہوئی تھی جو ایک آدمی کی شادی کی صحیح عمر ہے اور پھر وہ ہنس کر اضافہ کرتے کہ وہ مجھے پانچ برس کی گنجائش دے رہے ہیں اور میں کسی بھی قیمت پر پانچ سال سے پہلے شادی کا نہ سوچوں۔ اُن کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اُنھیں راضی کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ کبھی سوچتا کہ میں روبینہ سے شادی نہیں کرنا چاہتا لیکن یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اُس کی شادی کسی اور کے ساتھ ہو! میں اُس کے ساتھ ایسے ہی زندگی گزارنا چاہتا تھا؟ میں ایسے کیوں سوچتا تھا؟ ایسے تو نہیں کہ وہ مجھے پسند تھی؟ میری پسند سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کیا میرے والدین ایک معمولی حیثیت کی لڑکی سے میری شادی کردیں گے؟ میرے والد کی یہ سوچ نہیں لیکن امی ضرور بغاوت کریں گی۔

ہم نامحسوسانہ طریقے سے ایک دل چسپ خطرناک اور کٹھن سفر طے کر رہے تھے۔ ہم نے اپنے اپنے بدن کی زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں گفتگو تو نہیں کی تھی لیکن میں محسوس کرتا تھا کہ اپنی سوچوں کی گہرائی میں ہمارے اندر ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی بھی تھی۔ میں نے روبینہ کو اُس کے بدن کے علاوہ جاننے کا فیصلہ کیا۔ میں اُسے کبھی کسی trendy ریستوراں میں کھانے کے لیے لے جاتا، کبھی ہم تصویروں اور پھولوں کی نمائش یا کسی فیشن شو میں پہنچ جاتے۔ میں اُسے غیر اہم سی خریداری کراتا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہمارے نئے رشتے سے مطمئن اور خوش ہے۔ جب کبھی اکیلے ہونے کا موقع ملتا تو وہ عارضی طور پر دور بھی نہ ہوتی۔ وہ ایک حساس اور پیار کرنے والی لڑکی تھی اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میری محبت میں گرفتار ہے۔ جب مجھے یہ احساس ہوا تو ایک عجیب قسم کی سرشاری نے میرے اندر میٹھی میٹھی سی انگڑائی لینا شروع کردی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ عورت کو جیتنا اتنا سکون پرور ہوتا ہے۔ وہ مجھے صرف اپنی لگنے لگی۔

ایک سہ پہر ہم کمرے میں بند تھے۔ میں صوفے پر لیٹا ہوا تھا اور وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھی تھی۔ ہم کافی دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔

”تمھیں ایک بات بتانی ہے۔“ اُس نے جب بھی کچھ بتانا ہوتا تو میں پریشان ہو جاتا؛ مجھے فوراً اُس کی شادی کا دھڑکا لگ جاتا۔ اُس دن بھی ایسے ہی ہوا۔ میں خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا۔ ”یہ بات تمھارے ڈیڈی اور میری امی کے متعلق ہے۔“ وہ جھجکتے ہوئے شرمندہ سا ہنسی۔ میں کسی حد تک پریشان بھی ہوا لیکن تجسس غالب رہا۔ میں نے کوشش کی کہ میرے چہرے پر کوئی تاثر نہ آئے۔ ”اِن کا بہت قریبی اور گہرا تعلق رہا ہے؛ اتنا

گہرا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔'' مجھے لگا کہ کوئی اژدھا مجھے جکڑ کے میری ہڈیاں توڑ رہا ہے۔ ''وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے؛ شاید اب بھی کرتے ہوں۔'' میں پریشانی کی حالت میں سے گزر کے منطق اور دلیل کے قریب ہو گیا تھا۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو؟ بعض اوقات دیکھے اور محسوس کیے میں فرق ہوتا ہے۔ جو تم دیکھتی ہو شاید ویسے نہ ہو۔''

وہ تھوڑا سا مسکرائی۔ اُس کی مسکراہٹ میں ایک برتری تھی۔ ''احمد صاحب!'' وہ ہنسی۔ اُس نے کبھی میرا نام نہیں لیا تھا۔ مجھے یہ دل چسپ لگا۔ ''امی اور میں انگلی کے گوشت اور ناخنوں کی طرح ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو سب کچھ بتاتے ہیں۔'' اگر وہ آپس میں تمام معاملات کی ساجھے داری کرتی ہیں تو کیا روبینہ نے اپنی ماں کو ہمارے تعلق کا بھی بتایا ہے؟ شاید یہ سوال میرے چہرے پر بھی آ گیا ہو۔ ''میں نے ہم دونوں کے متعلق نہیں بتایا ہے۔ تم مطمئن رہو۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''دونوں شادی کرنا چاہتے تھے لیکن کچھ ایسے حالات بنے کہ اُن کا شادی کرنا ممکن نہیں تھا۔''

''ممکن کیوں نہیں تھا؟ ہم لوگ قریبی رشتے دار بھی تھے۔'' میں بھی شاید دل چسپی لینے لگا تھا۔

''بہت ساری وجوہات تھیں جن میں معاشی اور سماجی عدم برابری کو دخل تھا۔ وہ اپنے حالات کے ہاتھوں مجبور تھے، اُنھوں نے آخری دم تک ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہوا تھا اور ایک دِن دونوں نے چند دوستوں کی موجودگی میں نکاح کر لیا۔'' مجھے لگا کہ میں خواب کی کیفیت میں ہوں۔ میں نے روبینہ کا چہرہ دیکھا کہ وہ کوئی مذاق تو نہیں کر رہی؟ اُس کے چہرے پر سنجیدگی تھی اور وہ میری طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔

''تم میری.....''

''میں تمھاری آدھی یا پوری بہن نہیں ہوں۔'' روبینہ کی آواز میں طنز تھا۔ ''اُنھوں نے شادی تو کر لی لیکن اِس کا کسی طرح اعلان نہیں کر سکے۔ وہ چھپ چھپا کر ملتے رہے، کہیں اکٹھے رات گزار لی اور کہیں دوپہر۔ انھی دنوں میں امی کی میرے ابو کے ساتھ شادی طے پا گئی۔ تمھارے ڈیڈی کے ساتھ شادی کا فیصلہ ایک باغیانہ قدم تھا اور اب وہی فیصلہ امی کو بزدل بنا گیا اور وہ اپنے والدین کو انکار نہ کر سکیں اور اُن کی شادی ہو گئی۔'' میں نے پھر روبینہ کی طرف دیکھا۔ وہ سنجیدہ تھی اور مجھے اُس کی بات پر شک کرنا مناسب نہیں لگا۔ میں بے یقینی کے ساتھ اُس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اِس بار وہ اپنے انگوٹھے کو انگلیوں پر رگڑ رہی تھی۔ ''امی نے میرے ابو کے ساتھ زندگی گزارنا شروع کر دی لیکن تمھارے والد کے ساتھ ملنا یا تعلق ختم نہیں کیا۔ امی کے دو خاوند تھے جن کے ساتھ وہ رشتہ رکھے ہوئے تھیں۔ تمھارے ڈیڈی کے ساتھ اُنھیں محبت تھی اور میرے والد کے ساتھ ہمدردی اور وہ دونوں کو ایک عرصے تک اُن کا حق دیتی رہیں۔ امی کے دو خاوند تھے لیکن ابھی تک اُن کی اولاد نہیں تھی جو اُن کے لیے پریشانی کا سبب تھا۔'' میں نے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا۔ فضائی آلودگی کے باوجود دھوپ

میں چمک تھی۔ میں خاموش بیٹھا اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ ‘‘تمھارے ڈیڈی کے ساتھ محبت، ہمدردی میں تبدیل ہو گئی اور امی کو اُن کی شادی کی فکر لاحق ہو گئی۔ وہ اُنھیں گھلتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ اُن کی کوششوں سے تمھارے ڈیڈی نہ صرف شادی کے لیے رضامند ہوئے، اُنھوں نے شادی کر لی اور اگلے سال تم پیدا ہو گئے۔’’ میں نے جلدی سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ ‘‘امی کی دعائیں آخر کار رنگ لے آئیں اور ایک طویل عرصے کے بعد میں پیدا ہو گئی۔’’ اُس کے قہقہے میں تازگی تھی۔ ‘‘ابو کی صحت خراب رہنے لگی تھی اور میری ولدیت بھی امی اور تمھارے ڈیڈی کے لیے پریشانی کی وجہ تھی۔ گو یہ قدرے مہنگا عمل تھا لیکن تمھارے ڈیڈی نے میرا ڈی این اے کروایا۔ میں ابو کی بیٹی تھی۔ میری پیدائش کے جلد بعد ابو فوت ہو گئے۔ امی کے اتنے ذرائع نہیں تھے کہ ایک باعزت زندگی گزار سکیں۔ تمھارے ڈیڈی اب تک ہمیں سپورٹ کر رہے ہیں۔’’ روبینہ کی آنکھوں میں آنسو تھے، میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ خوشی کے آنسو تھے یا نجات کے۔ وہ رو رہی تھی لیکن اُس کے چہرے پر سکون تھا، بارش میں دھل کر فضا صاف ہو رہی تھی۔ میں صوفے سے اُٹھ کر اُس کی کرسی کے سامنے قالین پر بیٹھ گیا۔ میں نے اُس کے پاؤں پکڑ کر اُنھیں سہلانا شروع کر دیا، روبینہ روئے جا رہی تھی۔ میں نے جھک کے اُس کے پاؤں کو چوما، اُس نے مجھے منع نہیں کیا۔ میں نے اُس کا پاؤں ماتھے سے لگا کے آنکھوں سے لگایا اور پھر چوما۔ میرے لیے وقت تھم گیا تھا، میں اُس کا پاؤں تھامے اُسی طرح بیٹھا رہا۔ وہ جو بوجھ اُٹھائے پھر رہی تھی شاید اچانک اُتر گیا تھا، وہ آزاد ہو گئی تھی۔ میرے اندر اُس کے لیے جذبات کا دریا موجوں پر آ گیا۔ میں نے پھر اُس کا پاؤں آنکھوں سے لگایا تو اُس نے آہستہ سے اپنا پیر کھینچ لیا۔ اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ خالی نظر سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح میں اُس کی خالی نظر سے پریشان ہو گیا اور صوفے پر بیٹھ کے ٹیک لگا کے آنکھیں بند کر لیں۔ میں شاید سو گیا تھا یا شاید روبینہ سو گئی تھی یا شاید ہم دونوں ہی سو گئے تھے، میں آنکھیں بند کر کے نیم دراز رہا۔

‘‘میں نے ایک بات کہنی ہے۔’’ میں اپنے خواب سے باہر آ گیا۔ مجھے اُس کا یہ لاتعلق سا لہجہ ہمیشہ پریشان کر دیا کرتا تھا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا، اُس کا چہرہ بے تاثر لیکن آنکھیں شدت لیے ہوئے تھیں۔

‘‘ہمیشہ کی طرح پریشان ہو گئے؟’’ اُس نے خشک سی آواز میں کہا۔

میں نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

‘‘امی ہر روز کسی نہ کسی رشتے پر میرے ساتھ بات کرتی ہیں۔ میں کب تک انکار کر سکتی ہوں۔’’ وہ خاموش ہو گئی۔ میں بھی چاہتا تھا کہ وہ خاموش رہے۔ تھوڑی دیر پہلے اُس نے اپنی امی اور ڈیڈی کے متعلق جو بتایا تھا اُس کے انجذاب کا ابھی تک عمل شروع نہیں ہوا تھا۔ میں شاید ابھی تک سکتے کی کیفیت میں تھا۔ کیا پھوپھو شمشاد کے ایک وقت میں دو خاوند تھے؟ یہ بات ابھی تک منظرِ عام پر کیوں نہیں آئی؟ ڈیڈی کی بھی دو

بیویاں تھیں؛ امی کو دوسری کے بارے میں قطعاً علم نہیں تھا لیکن......! میں نے روبینہ کی طرف دیکھا، وہ معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ شاید میرے چہرے پر میرے خیالات کی فلم چل رہی تھی اور وہاں ہر سین اُس کا دیکھا ہوا تھا۔ جو میں سوچ رہا تھا وہ جانتی تھی کہ میں اِس کے علاوہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔

''میں ہاں کر دوں؟'' یہ پہلی مرتبہ تھی کہ اُس نے حامی بھرنے کی اجازت چاہی ہو۔ کیا وہ مجھ پر دباؤ ڈال رہی تھی؟ مجھے لگا بھی اور نہیں بھی لگا۔

''نہیں!'' میں نے قدرے بے یقینی سے کہا۔

''پھر اپنے ڈیڈی کو بھیجو یا خود بات کرو۔''

''ابھی نہیں!'' میری آواز کمزور تھی۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ بھی آیا۔ روبینہ نے شاید میری فیصلہ کرنے کی طاقت ختم کر دی تھی۔

''ابھی کیوں نہیں؟'' اُس نے اپنا ڈوپٹہ درست کیا۔

''جب وقت آیا تو سب ہو جائے گا۔'' میں نے اُسے اُٹھنے سے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اور اگر وقت نہ آیا تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔'' اُس نے اُٹھ کر اپنا جھولا کندھے سے لٹکا لیا تھا۔ میں نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، مجھے محسوس ہوا کہ یہ محض ایک رسمی سا عمل تھا جسے وہ بھی سمجھ گئی اور باہر کی طرف چل پڑی۔

میں سڑک پر کھڑا ٹریفک کی بے قابو رفتار کو دیکھتا رہا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ روبینہ اب نہیں آئے گی اور ضرورت تھی کہ میں کوئی فیصلہ کروں۔ جو اُس نے بتایا وہ میرے لیے ایک ناقابلِ یقین حقیقت تھی۔ اُس نے مجھے سب بتا کر اپنی ماں، ڈیڈی اور اپنا بوجھ میرے کندھوں پر بھی ڈال دیا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ اِس بھار نے میرے کندھے بھی جھکا دیے تھے۔ ڈیڈی شاید اِس لیے ہر وقت خوش رہتے تھے کہ وہ اِس بوجھ سے تھک نہ جائیں اور اُنھوں نے اِسے اُٹھائے رکھنے کا یہی حل نکالا تھا اور وہ ہر طرح اپنا فرض نبھا رہے تھے۔ کیا میں باقی کی اپنی عمر اِسے اپنی چھاتی کے اندر چھپا سکوں گا ؟

میں روبینہ کے ساتھ شادی کر لوں؟ ایک طرح سے ہم شادی شدہ ہی تھے۔ وہ اپنا آپ مجھے دے چکی تھی اور میں بھی جسمانی طور پر اُسے قبول کر چکا تھا۔ اگر اُس کی ماں بیک وقت دو خاوندوں کے ساتھ زندگی گزار سکتی تھی تو روبینہ میرے ساتھ بغیر شادی کے زندگی کیوں نہیں گزار سکتی؟ اِس خیال کے آتے ہی میں کچھ پُر اُمید ہوا اور پریشان بھی۔ روبینہ ہمیشہ گناہ اور ثواب کے بھنور میں پھنسی رہتی تھی تو میرے ساتھ بغیر شادی کے زندگی گزارتے ہوئے کیا اتنا بوجھ اُٹھا سکے گی؟ قطعاً نہیں!

میں گھر کی طرف چل پڑا اور چاہنے لگا کہ امی اور ڈیڈی آ جائیں تا کہ میں اکیلا نہ رہوں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ اُن کے آنے میں ابھی کافی وقت پڑا ہے۔ روبینہ اور مجھ میں جسمانی موافقت بھی تھی جو ایک خوش گوار

زندگی کی ضمانت ہوتی ہے۔ شادی ایک اچانک پن لاتی ہے جو روبینہ کے ساتھ شادی میں مجھے نہیں ملے گا، ہم اُس دور میں سے گزر چکے تھے۔ کیا اچانک پن کے لیے ہی شادی کی جاتی ہے.....؟

میں اپنے کمرے میں آ گیا؛ وہاں ابھی تک روبینہ کے کلون اور بدن کی ترشی لیے ہوئے میٹھی سی خوشبو موجود تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ سونگھا، اُس میں سے اُس کے پاؤں کے پسینے اور جوتے کی ملی جلی بو آ رہی تھی جس سے مجھے ایک طرح کا سکون ملا۔

میں نے صوفے پر نیم دراز ہو کر اُس خالی کرسی کی طرف دیکھا جہاں روبینہ بیٹھی ہوئی تھی۔ کیا کوئی اور لڑکی اِس کرسی پر روبینہ کی جگہ لے سکے گی؟ یا اُس لڑکی کے بیٹھنے کے باوجود یہ خالی ہی رہے گی؟ میں روبینہ سے اظہار کیے بغیر اُس کو ذہنی طور پر اتنا قبول کر چکا تھا کہ کوئی اور لڑکی شاید مسہری کو بھی نہ بھر سکے! اور یہ اتنا بڑا تجربہ تھا جو صرف ڈیڈی ہی کر سکتے تھے اور یا پھوپھو شمشاد! کیا میں ہر ایسے موقع پر ڈیڈی اور پھوپھو شمشاد کو ایسے ہی یاد کروں گا؟

مجھے عجیب طرح کا بوجھل پن محسوس ہوا؛ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میں شاید روبینہ کے ساتھ شادی نہ کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا یا کسی ایسے عذر کا متلاشی تھا کہ شادی کر سکوں! وہ مجھے دھمکی دے کر گئی تھی؛ کیا وہ میرے بغیر زندگی گزار لے گی؟ وہ بے پناہ حوصلے اور قوتِ ارادی کی مالک تھی اِسی لیے وہ گھنٹوں پھوپھو شمشاد اور ڈیڈی کی غیر دلچسپ باتیں سُن سکتی تھی! ایسے تو نہیں کہ وہ اُن کے سامنے.....! میں ایک دم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اچانک اپنے آپ کو پسینے میں تر پایا۔ مجھے اُس پر ترس میں ڈوبا ہوا شدت کا پیار آیا۔ میں نے سانس لینے کے لیے جب اپنی اضطرابی کیفیت کی گہرائی میں سے سر باہر نکالا تو کمرے میں خود کو غیر محفوظ پایا۔ میں نے تیزی سے اپنی چھاتی والی جیب میں سے موبائل نکال کے اُس پر پیغام لکھا: میں آ رہا ہوں!

send کا بٹن دباتے ہی میرا بوجھل پن جاتا رہا اور میں نے اپنے ہاتھ پر اُس کے پسینے اور جوتے کی بو کو ایک لمبی سانس لے کے سونگھا۔

☆☆☆☆

زیف سید

حکیم صاحب

ایک دن حکیم نذیر محمد اپنے مستقل گاہک کرم دین کو ٹیکا لگانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اس نے شور کی آوازیں سنیں۔ وہ ٹپکتا ہوا ٹیکا ہاتھ میں لیے باہر نکل کر آیا تو دیکھا کہ اس کے مطب سے ملحق مسجد کے احاطے کی دیواریں ڈھائی جا رہی ہیں اور مسجد کے پیچھے والے کھیت میں بنیادیں کھد رہی ہیں۔ مسجد میں خاصی چہل پہل تھی اور ڈیڑھ درجن کے لگ بھگ مزدور اور مستری کام میں مصروف تھے۔ حکیم کو یاد آیا کہ مسجد کا ملا باقی چندہ برائے تعمیرِ مسجد کی پرچیاں لے کر کئی بار اس کے پاس آیا تھا لیکن حکیم نے ہر بار کاروبار میں مندی کا سدا بہار عذر پیش کر کے اسے ٹال دیا تھا۔

کرم دین نے اپنے بائیں بازو کی آستین اوپر کی۔ اس کے محنت کش بازو پر آڑی ترچھی نیلی رگیں یوں لپٹی ہوئی تھیں جیسے درخت کے تنے پر بیلیں لپٹی ہوں۔ حکیم نے پینسلین کے ٹیکے کی سوئی نیلی رگیں بچا کر گوشت میں پیوست کرتے ہوئے اپنی بھاری آواز میں ٹھہر ٹھہر کر کہا: 'لگتا ہے ملا نے بڑا مال جمع کر لیا ہے کہ اب آسمان کو ٹھوکریں مارتا پھر رہا ہے۔'

نذیر محمد ویسے تو طبِ یونانی کا حکیم تھا لیکن ضرورت پڑنے پر اسے ایلوپیتھک ادویات استعمال کرنے سے عار نہیں تھا۔ وہ سخت مریضوں کو کونین اور پیراسٹامول وغیرہ کی گولیوں کا سفوف بنا کر دیا کرتا تھا، اور اگر پھر بھی افاقہ نہ ہو تو پینسلین کا ٹیکا لگانے سے دریغ نہیں کرتا تھا۔ کرم دین کا بخار پہاڑی کھٹمل کی طرح ڈھیٹ تھا اس لیے حکیم نے آخری حربہ آزمانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

حکیم عام طور پر دکان کے باہر بازوؤں والی کرسی پر دھنس کر بیٹھا رہتا تھا اور ہر آنے جانے والے سے علیک سلیک کرتا اور حال احوال پوچھتا رہتا تھا۔ معلوم نہیں حکیم پھیل گیا تھا یا کرسی سکڑ گئی تھی کہ اسے کرسی میں فٹ ہوتے ہوئے دقت ہوتی تھی، اور جب وہ اٹھنے لگتا تو کرسی اس سے پہلے اٹھ کھڑی ہوتی تھی۔

سردیوں میں اس کے بدن پر موٹا چارخانے والا کھیس ہوتا تھا، جب کہ ہر موسم میں سر پر بھورے رنگ کی قراقلی ٹوپی، جو کناروں سے اس قدر ادھڑ چکی تھی کہ لگتا تھا اس قراقلی کے لیے کھال دینے سے قبل میمنے کی بھیڑیوں سے واسطہ رہا تھا۔ دوا خانے کے اندر لکڑی کے ایک شیلف میں شربت کی رنگ برنگی شیشیاں، جڑی بوٹیوں کے مرتبان، ہاضمے کے چورن اور ٹکیاں دھری ہوئی تھیں۔

حکیم کی دکان بازار کے آخری سرے پر واقع تھی۔ یہ چھوٹا بازار وادی کے بیچوں چوک کے ارد گرد جمع کے نشان کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ شمال کے پہاڑوں کو جانے والی سڑک جنوب میں بڑے قصبے سے ہو کر آتی تھی، جب کہ شرقاً غرباً سڑک چند میل دور دیہات میں جا کر ختم ہو جاتی تھی۔ بازار کے مغرب میں کالا ڈھاک پہاڑ کی بے ڈھنگے اونٹ کی کوہان جیسی چوٹیاں تھیں، اور تین طرف اونچی نیچی پہاڑیوں کے سلسلے تھے جن کے اندر تنگ وادیاں اور درے سانپوں کی مانند لہراتے ہوئے دور تک چلے گئے تھے۔

بازار کے مرکزی چوک کے گرد کریانے اور منیاری کی دکانیں تھیں۔ جہاں سے چڑھائی شروع ہوتی تھی وہاں ایک بیکری تھی جس میں قریشی اینڈ سنز لوگوں کو آٹے میں چینی گھول کر کیک پیسٹریوں کے نام پر بیچا کرتے تھے۔

بیکری سے ملحق رحمان نائی کی دکان تھی۔ گورا چٹا گھنگریالے بالوں والا رحمان حال ہی میں کہیں سے ایک گھومنے والی کرسی لے کر آیا تھا، جس کے بعد اس نے اپنا نرخ آٹھ آنے بڑھا دیا تھا۔ آس پاس کی وادیوں میں اور بھی نائی تھے لیکن رحمان اپنے آپ کو ان سب سے برتر سمجھتا تھا۔ اس کے پاس کوکا کولا کی ایک بوتل تھی جس کے اوپر اس نے سپرے بنا کر لگایا تھا۔ وہ بال بناتے وقت سر پر، اور شیو کرنے سے پہلے اور بعد میں اس بوتل سے لوگوں کے منھ پر پانی کا چھڑکاؤ کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس کی بوتل سے نکلنے والی پھوار ریشمی رومال کی طرح ملائم ہے۔ اس کا دعوئی تھا کہ یہاں سے لے کر گلگت تک کسی نائی کے پاس اس قدر مہین اور نفیس پھوار والی بوتل نہیں ہے۔

رحمان کی دکان کے بعد حکیم کے مطب کے بالمقابل 'دھنک فوٹو سٹوڈیو' تھا۔ سٹوڈیو کے باہر ایرانی گلوکارہ گوگوش کی بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی جس کے رنگ مدھم پڑ گئے تھے۔ نامور فن کارہ نے سر پر فوجیوں کی سبز ٹوپی اوڑھ رکھی تھی جس کے اندر سے اس کے بالوں کی سنہری آبشار نکل کر دونوں کندھوں پر بے محابا پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ہونٹ شرارت آمیز انداز سے سکوڑے ہوئے تھے جیسے اس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو لیکن اسے قطعاً پروا نہ ہو۔ سٹوڈیو کے دبلے پتلے مالک کے بارے میں لوگوں کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا نام عزیز ہے اور وہ کہیں پنجاب کے میدانوں سے آیا ہے۔ اس کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا تھا وہ قتل کر کے یہاں روپوش ہو گیا ہے، کسی کا خیال تھا کہ اس کی بیوی گھر سے بھاگ گئی تھی اور وہ کسی کو منھ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا اس لیے ان پہاڑوں میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ہر وقت سلگتا ہوا کے ٹو سگریٹ پکڑا ہوتا۔ یہ الگ بات کہ وہ کش کم ہی لگاتا تھا، اور سگریٹ راکھ بن بن کر جھڑتا رہتا تھا۔ وہ سٹوڈیو ہی میں سوتا تھا اور بازار کے دکانداروں اور دوسرے لوگوں سے صرف ضرورت پڑنے ہی پر گفتگو کیا کرتا تھا۔

چند ہی دنوں میں مُلا باقی نے مزدوروں کے سر پر کھڑے ہو کر دیواریں بلند کروانا شروع کر دیں۔ اکثر مزدوروں کو اس نے نیک کام میں حصہ ڈالنے اور صدقہ جاریہ وغیرہ کے وعظ کر کے مفت کام کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ حکیم کو یہ ملا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ دبلا پتلا دراز قد اور تیز تیز باتیں کرنے والا ملا اسے ان سیلزمینوں کی یاد

دلاتا تھا جو اس کے پاس مختلف کارخانوں کی بنی ہوئی یونانی ادویات لے کر آتے تھے۔ یہ سیلزمین ہر نئی دوا کی تعریفوں کے پل باندھ کر اسے یوں حکیم کو بیچ جاتے جیسے ان کی ایجاد سے اب دنیا سے تمام بیماریوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جب یہ دوا حکیم کے مریضوں پر لیبل پر لکھے ہوئے مژدہ ہائے جانفزا کے مطابق عمل نہیں کرتی تھیں تو حکیم ان سیلزمینوں کو بے نقط کی سناتا تھا، لیکن وہ اس کے منھ سے جھڑنے والے پھولوں کو نظرانداز کر کے اپنے چرمی بیگ سے ایک نئی شربت کی بوتل نکال کر یوں ڈرامائی طریقے سے میز پر رکھ دیتے تھے جیسے سرکس کے مداری نے اپنا سب سے بڑا آئٹم پیش کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔

ملا کے ساتھ حکیم کی مخاصمت کی ایک دنیاوی وجہ بھی تھی، اور وہ یہ کہ ملا حکیم کے گاہک توڑ کر بقول حکیم کے اس کے پیٹ پر لات مارتا تھا۔ ایسے کئی مریض جنھیں اصولی طور پر حکیم کے پاس آنا چاہیے تھا، ملا راستے ہی میں اچک لیتا تھا اور دم درود، جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں سے ان کا علاج کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ مریض سے اپنے لیے کوئی فیس وصول نہیں کرتا تھا البتہ چندہ برائے مسجد و مدرسہ کی درخواست کر کے اس کی جیب سے کچھ نہ کچھ نکلوا لیا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان معمولی امراض کی کیا اوقات کیا ہے، قرآن کے الفاظ میں اتنی تاثیر ہے کہ وہ پہاڑ کو بھی اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں۔

اگر کوئی مریض ملا کے علاج سے مایوس ہو کر حکیم کے پاس آتا تھا تو وہ اس پر برس پڑتا تھا: ’اور جاؤ ان عطائیوں کے پاس۔ وہ ”چھف“ کر کے تمھیں ایسا بھلا چنگا کر دیں گے جیسے کبھی بیمار ہوئے ہی نہیں تھے۔ اب مرض بگڑ گیا ہے تو گرتے پڑتے میرے پاس آ گئے ہو۔ کل کو تمھیں کچھ ہوا تو میں مفت میں بدنام ہوں گا کہ حکیم کے علاج سے مرا۔ میں کیا کروں، میں مریض کو ٹھیک کر سکتا ہوں، مردے کو زندہ نہیں کر سکتا!‘

ایک مہینے کے اندر اندر مدرسے کی چھت پر لینٹر ڈالنے کی نوبت آ گئی، جس میں پورے بازار کے دکان داروں اور گاہکوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہوٹل سے مفت کھانا اور چائے آتی رہی جب کہ قریشی اینڈ سنز نے پیسٹریوں کے کنستر کا منھ کھول دیا۔

مدرسے کو پھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جلد ہی اس میں نہ صرف آس پاس کے دیہات سے بلکہ دوسری وادیوں کے طالب علم بھی آ کر پڑھنے لگے۔ دور کے طلبہ بازار کے پیچھے واقع گاؤں میں گھوم پھر کر دو وقت کھانا اکٹھا کرتے تھے اور رات کو مسجد ہی میں پڑ رہتے تھے۔ ملا نے طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر دو اور مولوی بھی رکھ لیے جو بچوں کو قرآن، ناظرہ، حدیث اور فقہ کی تعلیم دینے لگے۔

اسی دوران بیکری والے قریشی اینڈ سنز کا منجھلا لڑکا سعودی عرب سے چھٹیوں پر آیا۔ مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے ملا نے اسے قائل کر لیا کہ وہ واپس جا کر کسی شیخ سے مدرسے کے بڑھتے ہوئے اخراجات کا مقابلہ کرنے کے لیے رقم فراہم کرے۔

اعظم کو ابھی واپس گئے دو مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ ملا کے نام دس ہزار روپے کا منی آرڈر آ گیا۔ اس

کے بعد تو جیسے پرنالہ کھل گیا، ہر دو تین ماہ بعد سعودیہ سے رقم آ جاتی اور مدرسے کی رونق اور طلبہ کی تعداد اسی تناسب سے بڑھ جاتی۔ اب یہ مدرسہ 'جامعۃ الفاروق' کہلانے لگا۔

رفتہ رفتہ دوسری تحصیلوں اور ضلعوں سے بھی طلبہ جامعۃ الفاروق کا رخ کرنے لگے، جہاں انھیں مفت رہائش فراہم کی جاتی تھی۔ کچھ دنوں بعد مدرسے کے اندر اپنا باورچی خانہ بھی تیار ہو گیا جس میں دو وقت کا کھانا پکنے لگا اور طلبہ کو گھر گھر کھانا مانگنے کی حاجت نہ رہی۔ مدرسے کا ہاسٹل تعمیر کرنے کے لیے دکانوں کے پیچھے کے کھیت خرید لیے گئے۔ ایک دو سال بعد ملا خود رمضان میں مکے اور مدینے کا چکر لگانے لگا جہاں ہر سال عمرے کی سعادت کے ساتھ ساتھ ہزاروں ریال بھی مہیا ہو جاتے۔ اب ملا باقی نے اپنے آپ کو مولانا عبدالباقی ہزاروی کہلوانا شروع کر دیا، اور ساتھ ہی ساتھ ایک سفید رنگ کی کار بھی خرید لی جس پر اس کے لڑکے دن بھر ادھر ادھر گھومتے تھے۔ جب بھی یہ کار حکیم کی دکان کے آگے سے زن کر کے گزرتی، وہ زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے ملا کی پشتوں کو یاد کرتا تھا۔

قصبے سے دو میل دور شرقی وادی میں تین گھر بریلوی مولویوں کے بھی تھے۔ یہ ملا باقی کے چچا زاد بھائی تھے۔ ان کے والد کراچی میں کسی بریلوی مدرسے سے فارغ التحصیل ہو کر آئے تھے، اور ان کے علم و فضل کی داستانیں مشہور تھیں۔ انھوں نے گاؤں کے کئی گھروں کو اپنے مسلک پر پکا کر لیا تھا۔ ایک بار ان کا اپنے بھائی یعنی ملا باقی کے والد سے نور و بشر کے مسئلے پر بڑا زوردار مناظرہ ہوا۔ حکیم خود تو اس مناظرے کے وقت موجود نہیں تھا لیکن اسے لوگوں نے بتایا کہ جلد ہی بات علمی دلائل و براہین سے نکل کر ذاتیات تک جا پہنچی اور دونوں بھائیوں میں ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی۔ اس کے بعد سے دونوں خاندانوں میں آنا جانا اور بات چیت بند تھی۔

دو تین ہی برس گزرے ہوں گے کہ سڑک کے اس طرف دھنک فوٹو سٹوڈیو کے پیچھے والی زمین ملا باقی کے عم زاد مولوی چشتی نے خرید لی اور اس پر مسجد اور مدرسے کی بنیادیں کھدنا شروع ہو گئیں۔ چند مہینوں کے اندر وہاں بریلوی عقیدے کا مدرسہ قائم ہو گیا۔ سڑک پر دھنک فوٹو سٹوڈیو کے پہلو میں بڑا گیٹ بن گیا جس پر 'دارالعلوم چشتیہ انوارِ مدینہ' کا جہازی سائز کا محراب دار بورڈ بھی لگا دیا گیا، جس کے عین اوپر مسجدِ نبوی کا سبز گنبد بنایا گیا تھا۔ بورڈ کے دائیں بائیں خطِ ثلث میں سنگِ مرمر کی تختیوں پر یا اللہ اور یا محمد کے طغرے آویزاں کر دیے گئے۔

مولوی چشتی ایک ایسی چیز لے کر آیا جو اس سے پہلے وادی کے لوگوں نے نہیں دیکھی تھی۔ یہ تھا لاؤڈ سپیکر۔ اس پر مولوی چشتی اور ان کے شاگرد دن رات نعتیں اور درود پڑھتے رہتے۔ عید میلاد کے دنوں میں تو ان کے جوش و جذبے کا عالم جداگانہ ہوتا۔ ان کا وجد آفریں ذکر مدرسہ جامعۃ الفاروق کی دیواروں سے طوفانی موجوں کی طرح بار بار ٹکراتا۔

اس کے جواب میں جامعۃ الفاروق والوں نے مسجد کی چھت پر چھ بے حد طاقتور لاؤڈ سپیکر لگا دیے جن کے

ساتھ بیٹری بھی منسلک تھی۔ چنانچہ جب بجلی نہ ہوتی تب بھی وہاں سے اذان کی صدا بلند ہو کر آس پاس کی وادیوں کو مرتعش کرتی ہوئی کالا ڈھاکہ کی ترائیوں تک میں یوں گونجا کرتی کہ جنگلی مرغ پھڑا مار کر اڑ جایا کرتے تھے۔

جامع الفاروق میں اذان کے وقت حکیم فقیر محمد کے مطب کی عجیب حالت ہوتی۔ مسجد سے ملحق شربتِ توتِ سیاہ، خمیرہ گاؤزبان اور جوارشِ جالینوس کی شیشیوں سے سجا ہوا شیلف کپکپی کے مریض کی طرح تھراتا تھا۔

اس اذان کے جواب میں دارالعلوم چشتیہ والے بھی زور وشور سے اپنا ورد نئے جذبِ ایمانی سے شروع کر دیتے۔ اس دوران تمام بازار میں کاروبارِ زندگی معطل ہو کر رہ جاتا۔ مولا داد کبابیے کے ہاتھوں میں مسالہ لگے قیمے کی ٹکیہ دھری کی دھری رہ جاتی، دھنک فوٹو سٹوڈیو کا مالک عزیز کیمرے سے نظریں ہٹا کر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو جاتا، اور تصویر کھنچوانے والے سٹول پر اسی پوز میں جما رہتا جس کی اسے عزیز نے ہدایت کی تھی۔ دکانوں میں دکان دار ترازو دوبارہ نیچے رکھ دیتے۔ ایسا لگتا جیسے کسی نے وی سی آر پہ ‘پاز’ کا بٹن دبا دیا ہو۔

طلبہ کی تعداد بڑھتی گئی۔ ان کے لیے مدرسوں کے عقب میں زمینیں خرید کر یا مالکان سے بطورِ عطیہ وصول کر کے نئے ہال اور ہاسٹل تعمیر کیے جانے لگے۔ ان ہاسٹلوں میں رہنے والے طلبا اکثر ٹولیوں کی شکل میں بازاروں میں گھومتے نظر آتے تھے۔ دونوں مدرسوں میں مختلف نصاب پڑھائے جاتے تھے، لیکن ان کے طلبہ کی شکلیں اور حلیے یکساں تھے۔ سروں پر جالی دار ٹوپیاں، کندھوں پر دھاری دار کپڑے والا صافہ اور منھ پر استرے یا قینچی سے بے نیاز مختلف شکلوں اور نمونوں والی ڈاڑھیاں۔ مختلف عمروں والے یہ طلبا اکثر پندرہ بیس کے گروہوں میں نکلا کرتے تھے اور بازار سے گزر کر ندی کے پل تک جا کر واپس آتے تھے۔

حکیم شروع شروع میں بازار میں نوجوانوں کی اس ریل پیل کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔ اس نے برسوں کی ریاضت سے مریض پھانسنے کے ایک مجرب نسخے کی مشق بہم پہنچائی تھی۔ وہ اپنی دکان سے باہر کرسی پر بیٹھے ہوئے سڑک پر چلتے ہوئے کسی نوجوان کو تاڑتا تھا اور پھر اسے آواز دے کر دکان کے اندر بلا لیتا اور بینچ پر بٹھا لیتا تھا۔ پھر رازدارانہ انداز میں کہتا: ‘بیٹا میں نے تو تمھاری چال ہی سے سمجھ لیا تھا کہ تم اپنی جوانی کو اپنے ہی ہاتھوں برباد کر رہے ہو۔ دیکھو تمھاری آنکھوں کے نیچے وقت سے بہت پہلے ہی حلقے پڑ گئے ہیں۔ بیٹھتے وقت تمھاری آنکھوں میں سایہ سا آ گیا تھا۔ اسی لیے تو تم جان بھی نہیں پکڑ رہے۔ اس عمر میں تمھیں چنار کے درخت کی طرح سربلند ہونا چاہیے تھا لیکن تم تو آندھی کی زد میں آئی ہوئی ککڑی کی بیل کی مانند لگ رہے ہو۔ اگر خدانہ کرے خدانہ کرے یہی حال رہا تو دو تین سال کے اندر اندر یہ جوانی یوں ضائع ہو کر رہ جائے گی جیسے تڑخے ہوئے مٹکے کا پانی رس رس کر ختم ہو جاتا ہے۔’

اس دوران وہ نوجوان بری طرح گڑبڑا جاتا اور اس کی بولنے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت یوں سلب ہو جاتی جیسے کسی نے اس کے ہاتھ میں موت کا پروانہ تھما دیا ہو۔ حکیم لوہا گرم دیکھ کر متوحش مریض کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر یا بازو پر تھپکی دے کر آخری چوٹ لگاتا: ‘یار تم تو پریشان ہی ہو گئے۔ ارے بھئی، گھبرانے کی کوئی بات

نہیں، موت کے سوا کون سا مرض ہے جس کا طب یونانی میں شافی و کافی علاج موجود نہیں۔ تمھیں کوئی مسئلہ نہیں، صرف جگر میں تھوڑی گرمی ہے۔ میرے پاس وہ نسخہ ہے جو راجے مہاراجے استعمال کیا کرتے تھے۔ یہ جگر کو یوں ٹھنڈا کر دے گا جیسے کسی نے انگاروں پر بالٹی بھر پانی انڈیل دیا ہو۔‘

پھر وہ شیلف میں سے سفوف کے مرتبان اٹھاتا، درازیں کھول کر ان میں پڑے گرد آلود ڈبوں سے عجیب شکل و رنگت کی جڑیاں نکالتا اور انھیں آمیز کر کے پڑیاں مریض کے ہاتھ میں تھما دیتا اور اس سے منھ مانگی قیمت وصول کر لیتا۔

شروع شروع میں بازار میں نوجوانوں کی فوج ظفر موج دیکھ کر حکیم کی باچھیں کانوں تک کھل جاتی تھیں اور وہ کرسی پر یوں جم کر بیٹھ جاتا جیسے مچھلی کا شکاری پانی میں کانٹا ڈال کر انتظار کرتا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ حکیم کو تجربے سے معلوم ہوا تھا کہ اس کا مذکورہ بالا نسخہ صرف اکیلے دکیلے نوجوان پر چلتا تھا، جب کہ یہاں یہ عالم تھا کہ ان طلبہ کی ڈیڑھ درجن سے کم کی فوج باہر نکلتی ہی نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ حکیم نے اس طرف سے امید ہی توڑ دی۔

یہ طلبہ عام طور پر کسی سے تعرض نہیں کرتے تھے اور بازار میں نظریں جھکائے ہوئے چلتے تھے۔ لیکن ایک بار ان کی بس کے کنڈکٹر سے لڑائی ہو گئی تو بارہ پندرہ طلبہ نے مل کر اڈے کے کئی کنڈکٹروں اور ڈرائیوروں کو اکٹھے پیٹ ڈالا۔ اس کے بعد سے بازار والے ان سے عزت و احترام سے پیش آنے لگے۔ سڑک کی جس طرف ان کا گروہ آتا دکھائی دیتا، راہگیر سڑک پار کر کے دوسری طرف ہو جاتے۔ دکان دار ان کو چیزیں بازار کے نرخ سے سستی فروخت کرنے لگے۔

ایک دن دھنک فوٹو سٹوڈیو کا مالک عزیز ڈومیسائل کے لیے ایک لڑکے کی تصویر کھینچ رہا تھا کہ دکان کے باہر کچھ شور سنائی دیا۔ وہ باہر نکلا تو دیکھا کہ مدرسے کے طلبہ کپڑے کے چیتھڑے کو سیاہی میں بھگو بھگو کر گوگوش کی تصویر پر پھیر رہے ہیں۔ معلوم نہیں یہ چشتیہ کے طلبہ تھے یا الفاروق کے، مگر عزیز کے آنے پر انھوں نے اس کی طرف سر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں اور اپنی کارروائی مکمل کرنے کے بعد لتھڑا ہوا چیتھڑا دیوار کے نیچے پھینک کر چلتے بنے۔

عزیز سگریٹ انگلیوں میں تھامے کھڑا دیکھتا رہا۔ اس کے منھ سے ایک لفظ تک نہیں نکلا۔

طلبہ کبھی کبابیے کی دکان سے سیروں کباب لے جاتے، کبھی شربت والے کی ریڑھی کے آگے کھڑے ہو کر گلاس کے گلاس غٹ غٹ انڈیل جاتے۔ ایک دو بار دونوں مدرسوں کے طلبہ میں بیچ بازار کسی بات پر جھڑپ ہو گئی، لیکن خیریت گزری کہ مولانا عبدالباقی وہاں سے گزر رہے تھے، انھوں نے اپنے طلبہ کو دو ہنٹر مار کر وہاں سے بھگا دیا۔

ایک دو ہفتے بعد چند طلبہ خط بنوانے کے لیے رحمان نائی کی دکان پر گئے۔ وہاں رحمان اور اس کا پٹھا دونوں شیو بنا رہے تھے۔ طلبہ نے سلطان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن یہ منظر دیکھ کر ناک سکوڑ کر دکان سے اس طرح الٹے قدموں واپس ہو گئے جیسے وہاں کسی جانور کی سڑی ہوئی لاش رکھی ہو۔ جاتے جاتے ان میں سے ایک نے

دروازہ اتنے زور سے بند کیا کہ کرسی کے سامنے لکڑی کے کاؤنٹر پر رکھی پانی کی بوتل زمین پر گر کر چکنا چور ہو گئی۔

سلطان نے اس دن کے بعد سے شیو بنانا چھوڑ دیا۔

ایک دن حکیم اپنے مطب کے باہر حسبِ معمول کرسی میں دھنسا مریضوں کے انتظار میں بیٹھا تھا کہ شمالی سڑک سے ایک نرالا کارواں بازار میں داخل ہوا۔ بیس پچیس لوگوں پر مشتمل ایک ٹولی کے آگے چار ہٹے کٹے مردوں نے کندھوں پر ایک ڈولی اٹھا رکھی تھی۔ پیچھے پیچھے ایک شخص ڈھولک بجاتا اور دو بین بجاتے ہوئے چلے آ رہے تھے جب کہ بقیہ لوگ ناچتے اور دھمال ڈالتے بازار کی حدود میں داخل ہوئے۔ دکان دار اور گاہک دکانوں سے باہر نکل نکل کر انھیں دیکھنے لگے۔ راہگیر چلتے چلتے رک گئے۔ معلوم ہوا کہ یہ سائیں دستگیر شاہ سرکار عرف زندہ پیر اور ان کے مرید ہیں، جو مضافاتی دیہات میں اپنے مریدوں کو دیدار کی سعادت بخشنے کے بعد اب واپس جا رہے ہیں۔

مولوی چشتی نے خاص طور پر مدرسے سے باہر آ کر پیر کا استقبال کیا اور انھیں اپنے حجرے میں لے گیا۔ پیر صاحب نے تو کچھ کھایا پیا نہیں لیکن مرید مولوی کی فیاضی سے جی بھر کر فیضیاب ہوئے۔

حکیم مریضوں سے مایوس ہو کر گھر جانے کی سوچ رہا تھا کہ پیر کا قافلہ مدرسے سے نکل آیا۔ مریدوں نے سہارا دے کر نحیف و نزار پیر صاحب کو ڈولی میں سوار کرایا۔ ڈھولک والے نے تھاپ دینا شروع کر دی، اور بین والوں نے ایک پرجوش دھن چھیڑ دی۔ جونہی یہ پارٹی الفاروق کے آگے سے گزرنے لگی تو مدرسے کا مہیب پھاٹک اچانک چرچراتا ہوا کھلا اور ڈنڈوں اور لاٹھیوں سے لیس طلبہ نے نعرۂ تکبیر بلند کر کے مریدوں پر اندھا دھند لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں۔ مریدوں نے اپنے پیر کے گرد گھیرا ڈال دیا، لیکن خالی ہاتھوں سے لاٹھیوں کی یلغار کا مقابلہ کہاں تک کرتے۔ کسی کے سر پر چوٹ لگی تو وہ بھل بھل بہتا خون روکنے کے لیے زخم کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گیا، کسی کا بازو ٹوٹ کر لٹکنے لگا۔

طلبہ نے لاٹھیوں کے وار کر کر کے ڈولی کے اوپر آرائشی محراب بھی توڑ پھوڑ دی۔ ایک ڈنڈا پیر صاحب کے بھی لگا اور وہ بے ہوش ہو گئے۔

دارالعلوم چشتیہ کے طلبہ کو پتا چلا تو وہ بھی جو چیز ہاتھ میں آئی لیے دوڑے دوڑے آئے اور بازار میں گھمسان کا رن شروع ہو گیا۔

حکیم پہلے تو مبہوت ہو کر سارا منظر دیکھتا رہا لیکن جب پتھر اور اینٹیں برسنے لگیں تو وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور پھرتی سے دکان کے اندر جانے کی کوشش کی تو کرسی بھی ساتھ ہی چلی آئی اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے کو گر پڑا۔ اس نے بڑی مشکل سے کمر ہلا ہلا کر اپنے آپ کو کرسی کی قید سے آزاد کیا تو کمر میں وہ ٹیس اٹھی کہ اس کے ماتھے پر ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے۔ جیسے تیسے رینگ کر وہ مطب کے اندر پہنچا اور دروازہ بند کر دیا۔

ایک طالب نے مسجد کے باہر لگی سنگِ مرمر کی اس تختی پر لاٹھی کے وار کر کے توڑ ڈالا۔

معلوم نہیں شرارتاً یا اتفاقاً ایک اینٹ کا ٹکڑا دھنک فوٹو سٹوڈیو کے دروازے کا شیشہ توڑ کر اندر جا گرا۔ عزیز اور اس کا قیمتی پولورائیڈ کیمرا بال بال اس کی زد سے بچے۔

تھوڑی دیر کے بعد مولانا عبدالباقی باہر نکلے اور بلند آواز سے اپنے طلبہ کو واپس مدرسے کے اندر جانے کا حکم دینے لگے۔ مولوی چشتی اور دوسرے اساتذہ نے اپنے طلبہ کو قابو کیا اور یہ معرکہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ پیر صاحب اور ان کے مریدوں کو پندرہ میل دور بڑے قصبے کے ہسپتال پہنچایا گیا لیکن خیریت گزری کہ پیر صاحب کو زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ البتہ تین مرید ہفتوں تک بازو گلے میں لٹکائے پھرے۔

اگلے دن دھنک فوٹو سٹوڈیو پر تالا پڑا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ عزیز منہ اندھیرے ہی اسباب لاد کر کسی سے ملے بغیر اور کچھ بتائے بغیر چلا گیا ہے۔ وہ گوگوش کی مسخ شدہ تصویر بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ صرف دھنک فوٹو سٹوڈیو کا ست رنگا بورڈ لٹکا رہ گیا۔

حکیم کی ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کو خاصا نقصان پہنچا تھا۔ وہ گردن بھی ہلاتا تو کمر کی دمچی تک گویا بجلی کا کرنٹ دوڑ جاتا۔ اس دوران ایک ہلکے ہلکے بخار نے اسے گرم شال کی طرح ڈھک لیا۔ حکیم نے اپنے کئی نسخے آزما لیے، ہر طرح کے تیل سے مالشیں کروائیں، حتیٰ کہ اپنے بیٹے سے ٹیکہ بھی لگوا لیا، لیکن پھر بھی اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں ڈیڑھ ماہ لگ گئے۔

کوئی دو ڈھائی مہینے بعد حکیم دوبارہ بازار گیا تو یہ دیکھ کر بھونچکا رہ گیا کہ دھنک فوٹو سٹوڈیو ڈھایا جا چکا ہے اور اس کے پیچھے کھیتوں میں ایک اور عمارت کی دیواریں اٹھائی جا رہی ہیں۔ فوٹو سٹوڈیو کی جگہ ایک بڑا گیٹ تعمیر ہو چکا ہے، جس کے اوپر سبز رنگ کے بورڈ پر سفید حروف میں لکھا ہوا ہے:

جامع مسجد بیت الحمد وقف و مدرسہ بنین و بنات (مسلک فلاں)۔

حکیم وہیں سے گاؤں لوٹ گیا۔

☆☆☆☆

شاہین عباس

ویرے کی پَو

گلی میں یکے بعد دیگرے قہقہوں نے زور پکڑا تو وہ سمجھا کہ عبادت میں خلل کی یہی شکل باقی رہ گئی تھی جس کا ظہور ہو چکا ہے......شکل کیا تھی، بس چربی چڑی کی دہاڑ چنگھاڑ تھی......موت کی سی تیزی سے اپنے ہی چرموں کو چیرتی اور گھر گھر میں اُترتی سویر کے راستے میں چھوکی شاہ کے ڈُبو کی بھوں بھوں سے بھی کہیں زیادہ ہولناک! اُس کی اُنگلی سورۃ فجر پر اُس جگہ رُک گئی کہ آخری چار آیات ابھی پڑھنا باقی تھیں۔ وہ دراندازی کی دُم پکڑ کر گھوم گیا اور جیسے تیسے سات چکر کاٹ لیے۔ پھر دائرے کو بے سدھ بڑھاتا گیا اور دونوں ایڑیوں پر گھومتا میاں جی تسبیح والے کی درگاہ سے جا ٹکرایا۔ میاں جی خلافِ معمول آج اپنی گدی پر رونق افروز نہیں تھے۔

اِکا دُکا آوازیں تو ویرے کی بیٹھک میں کب سے آ رہی تھیں۔ مگر کوئی تھا کہ جو اِس ’’ہی ہی ہا ہا‘‘ کی پالن بھی کر رہا تھا مگر دِکھائی دینے والوں میں شامل تھا نہ بجھائی دینے والوں میں؛ ‘اُسے تو بس سنا ہی جا سکتا تھا‘ نماز کے دوران میں اور دو نمازوں کے وقفوں میں۔ پھر بھی ایسا کم کم ہوا کہ پوری کی پوری نماز کئی کئی بار ٹوٹ ٹوٹ کر جُڑتی رہی ہو اور صبح شام کے خلا میں تحلیل تکبیریں کیا اور تلبیے کیا، بوند بوند لہو کے مانند چھت پر چھما چھم برسنے لگے ہوں۔ مگر آج ایسا ہونے جا رہا تھا......ایسا ہونے میں ڈبو کی دھیرج کا دخل تو تھا ہی مگر کچھ اور کارن بھی تھا۔ سج سج چکر دیتے، چکر باز کھلواڑ کا مردِ میدان ڈبو، گلی کے ایک ایک مکان، مکان کے ایک ایک فرد کا حساب دان تھا۔ اَندر باہر کی جیبوں میں سب جُوا چُھتا، جیسے اُسی کو دِکھا دِکھا کے بچایا لٹایا جاتا ہو۔ اُدھر الحمد کا لکھا جانا تھا کہ یہ لوگ آنا شروع ہو گئے۔ پتھر کو کاٹ کاٹ کر رکھ دیتے، یوں جیسے ہر ہر ضربت پر تاریخ کو اُس کی اُوقات یاد دِلاتے ہوں۔

’’حرام زادی، تجھے تو کوئی جننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہم نے اپنی بیویوں سے شہوت کو چھپائے رکھا...... قصداً ایسا کیا۔ اُنھیں دھوکا دیا کہ ہم تو ہیں ہی ایسے نامرد اور وہ دھوکا کھاتی رہیں۔ ریڑھ میں پس اَنداز رات سے ہم نے تمھیں جنم دیا حالانکہ ہم آدمی کا بچہ بھی پیدا کر سکتے تھے......شاباش شاباش مار کھائے جاؤ! اِدھر لاؤ سر......یہ ٹھونگا آج کا، یہ کل کا اور یہ پرسوں کا!‘‘

چھوکی شاہ نے اپنے کتورے کی غضب تربیت کر رکھی تھی۔ قمری مہینوں کا کیلنڈر اُسے زبانی یاد کرا دیا تھا۔ پاکٹ سائز جنتری دِکھا دِکھا کر خاص اور عام دنوں کا فرق بتاتا رہا تھا۔ عید اور عزا کے مابین لکیر کھینچ کر دو

الگ الگ خانے بنا دیے تھے کہ آخر ہے تو جانور، وقت بے وقت آنے جانے میں آسانی رہے۔ جننے رونے کے سُر آپس میں ٹکرائیں نہیں۔ نجس کی وفاداری بھی قائم رہے اور اُستاد کی اُستادی پر بھی کوئی حرف نہ آئے۔ صرف ہاتھ اٹھیں اور وہ بھی ''واہ وا اور سبحان اللہ' سبحان اللہ' کہتے ہوئے:

'' سیّد بادشاہوں کا پالتو ہے۔ جان سے بھی چلا گیا تو مرضی نہیں کرے گا۔ ہنسایا تو ہنسے گا' رُلایا تو روئے گا۔ اِدھر مالک فاقے سے اُدھر اِس پر بھی کھانا پینا حرام۔ عصر کے وقت ہی سب کے ساتھ فاقہ کشائی کرے گا' ایک ہی اشارے پر' ایک ہی نبیل پر!''

چھوکی سویرے سویرے ڈبّو کے گلے میں پڑی زنجیر کو چھنکاتا ڈیوڑھی سے باہر آجاتا۔ ڈبّو نئی کے تین پائیدان اترتے ہی چاروں طرف گردن گھما گھما کر یوں دیکھنے لگ جاتا جیسے رات بھر ڈیوڑھی میں بند رہنے سے باہر آسمان بدل گیا ہو' زمین اور کی اور ہو گئی ہو اور گلی کے رہنے والے اُسے بھول گئے ہوں کہ یہاں کبھی کوئی ڈبّو بھی ہوا کرتا تھا۔ وہ ایک طرح سے اُنھیں یاد دلانے کے لیے گردن کو دائرہ وار گھما رہا ہوتا:

''میں گیا کہیں نہیں تھا' یہیں تھا' یہیں رہوں گا!''

چھوکی شاہ اُسے ویرے کی کھڑکی کے ساتھ باندھ دیتا۔ کھڑکی کی ایک سلاخ تو جیسے ڈبّو کے نام ہی کر دی گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ عید شبرات کی خوشبو تو اُسے کوسوں دُور ہی سے آجاتی تھی۔ ابھی سوجی میدے کو مرتبانوں سے نکال کر دھوپ میں پھیلایا ہی جاتا کہ وہ بھانپ لیتا' آگے کس تیوہار کا نمبر لگ چکا ہے؛ کس چولھے میں کتنا بالن ڈلے گا؛ اور کس کڑاہی میں کتنا تیل؛ کس کے ہاتھ کی پوڑی چپٹا سا پاپڑ بن کر رہ جائے گی اور کس کی پھول کر پھلکا بنی سارے شریکے پر سبقت لے جائے گی۔

''پوڑی بیلنے پر تھوڑی بیلتے ہیں۔ یہ تو بس تالیاں پیٹنے کا کھیل ہے۔ گھماؤ' تاؤ پر سے نگاہ ہٹی نہیں کہ بات بگڑی نہیں ...... کڑاہی میں کھولتا تیل کھلاڑیوں کے سواگت کے لیے ہے بی بی' تیرے جیسی اناڑیوں کے لیے نہیں!''

زیلے سمجھ جاتی کہ ڈبّو کو بتول کی پوڑی پسند آئی ہے' اُس کی نہیں۔ اُسے تو جیسے سال کے بارہ مہینوں کا انسانوں سے بھی زیادہ انتظار رہتا کہ ہر مہینے میں اُس کے پاس کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے ہوتا' جیسے گلے میں لٹکتی زنجیر' زنجیر نہ ہو' زنبیل ہو' زنبیل میں حکم نامے ہوتے' جن کی زبان صرف وہی سمجھ سکتا' کوئی اور نہیں' اُستاد بھی نہیں۔ چھوٹی عید کے بعد بڑی عید کے چاند کا تو وہ ہر آتے جاتے کے پاؤں چاٹ چاٹ کر پوچھتا:

''چھوٹی قربانی کریں گے یا بڑی میں حصہ ڈالیں گے؟''

ذیقعد اُنتیس کا ہوتا تو وہ ایسے ہی خوش ہوتا جیسے گلی کے لوگ رمضان کے اُنتیس روزے ہونے پر جھوم اُٹھتے تھے۔ اگر کبھی تیسواں روزہ بھی ہو جاتا تو تراویح پر ہی چہ مگوئیاں شروع ہو جاتیں:

''اِس بار پہلا روزہ نہ کھایا جاتا تو کل عید ہوتی ...... یہ دُور بینوں والے لَو روزہ رکھوا کر بھی دوپہر کو عید کا

اعلان کر دیتے ہیں ...... یاد نہیں ایوب خان کے دَور میں کیا ہوا تھا ...... دوپہر بارہ بجے روزہ کھول کر عید پڑھی تھی!''

یہ وہ لوگ تھے جنھیں عشا کی نماز کے بعد امام مسجد کے حکم پر مسجد میں دیر تک بیٹھنا پڑتا کہ اگر ہلال کمیٹی کو چاند نظر نہ آیا تو تراویح ہوں گی۔ مگر ذیعقد کے چاند کے بارے وہ زیادہ پریشان کبھی نہیں ہوئے تھے' وہ تو ڈو کی پریشانی تھی' اِن کی نہیں۔ چاند سورج کی اِنھیں تاریخوں کے بیچم بیچ کچھ تہوار اور موج میلے کے ایام سگ برادری کے اپنے بھی ہوتے تھے' جن کے لیے نہ کبھی رویت کا اہتمام ہوتا اور نہ خصوصی نشریات کی گنجایش نکلتی۔ مگر چونکہ جھلتا تو ڈو بھی تھا اور اس کے ہم قبیلہ بھی کہ اِن کی گردنوں میں بھی خم رکھا گیا تھا' لہٰذا یہ اپنے خاص دِنوں میں ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے اور اپنی اپنی زنبیلوں میں جمع پرانے مسوّدے' مخطوطے نکال نکال کر پڑھنے لگتے۔ تمثیل کا سٹیج سجتا' مکالمے پر مکالمہ' رکن پر رکن' پکار پر پکار' سب کچھ باری باری نبھا دیتے۔ جو اُدائی بدھائی بھی تیوہار کی مناسبت سے کاغذوں پر درج ہوتی' اُن پر عائد ہوتی۔ پھر نا زنخرے شروع ہوتے' گپ بازی ہوتی' چھیڑ چھاڑ' اچھل چھل' سگائیاں' شادیاں' رخصتیاں' مکلاوے' تر وینڈے' نیز مولد قائم ہوتے' ماؤں کی چھاتیوں پر تین تین' چار چار متولدین یوں اچھل کود کرنے لگتے' جیسے اونچ نیچ کا کھیل اوپر سے سیکھ کر آئے ہوں۔ دِن ڈھلے سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔ چھوکی شاہ پوچھتا:

'' ڈو' موج مستی میں کہیں اپنا سبق تو نہیں بھول آئے ...... سناؤ تو ذرا!''

''ایک مہینہ شہادتِ عظمٰی کا۔ ایک ولادتِ عظمٰی کا۔ اسریٰ بعبدہٖ کی ایک رات' عرفہ کا ایک دن' اقرا کا ایک سن۔ الیوم اکملتُ ......''

''اور وہ جو'' ...... چھوکی شاہ' اپنا سینہ دِکھا کر اُسے اشارہ کرتا۔

''ہاں ہاں ...... غیبت ایک ماضی' انتظار ایک حال' ظہور ایک مستقبل ...... وہ بھی' وہ بھی!''

''شاباش میرے بچے' شاباش!''

ایسے ہی کسی دِن دِہار پر چھوکی شاہ کا یہ رکھیل کالی اُون کا بیس پاؤنڈ کا گٹھا پچھلی دو ٹانگوں پر براجمان' موج میں آ کر جب کبھی اگلی دو ٹانگوں کو ہوا میں لہراتا تو گلی میں چلنے والوں پر چارپایوں کی حقیقت کھلنے لگتی اور اُسے دیکھنے والے کچھ دو پائے تو اپنی محرومی پر آہ بھر کر رہ جاتے؛ وہیں کھڑے کھڑے جوتے اُتارتے' ڈو کی نقالی کرتے ہوئے چوتڑوں کے بل گرتے اُور پھر کھسیانے سے' ہوا میں دونوں ہاتھ مارتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوتے' جیسے نا کام نہیں کامیاب قرار پائے ہوں۔ پھر وہ اپنے اپنے کپڑے جھاڑنے لگتے۔ سامنے سے قمیص کا گھیرا اُٹھا کر اُوپر نیچے کے دانتوں میں دباتے' دائیں بائیں دونوں کولھوں پر شلوار کے نیفے کو درست کرتے' چنٹ چنٹ کو ناف سے پیٹھ تک اور پھر پیٹھ سے ناف تک پورے چکر میں برابر برابر پھیلاتے اور آگے چل پڑتے۔ پیچھے وہی رہ جاتا جسے رہنے کا حکم ہو چکا تھا۔ کچھ کی قمیصوں پر تھوک کا چھوٹا موٹا نشان پڑ چکا ہوتا اور کچھ

کے رال ٹپکنے سے نچلے بخیے تک سیدھی لکیر کھنچ چکی ہوتی۔ مگر وہ سب چلتے جاتے کہ جیسے پھر آئیں گے تو قدم قدم پر چنٹ‘ چنٹ سے ٹکرا رہی ہوگی غرس فرس پر زین‘ زین کے ساتھ گھس رہی ہوگی اور پھدک پھلانگ کا محیط ہی محیط ہوگا...... یہ لمبا چوڑا‘ ابابائے فرس کا ٹیکا‘ ڈھلکا‘ چھلکا۔

”وہ لوگ ایسے نہیں...... وہ لوگ ایسے ہرگز نہیں کہ روئیں تو آنسو باہر کی طرف گریں اور ہنسیں تو اندر کی طرف...... سنا ہے خارج سے داخل میں آرہے ہیں۔ سب نشانیاں اُدھر سے آنے والوں کی ہیں اُن میں!“

میاں جی دونوں ہاتھ کی تلیوں کے بیچ تسبیح کے دانوں کا گچھا بنا کر رگڑتے‘ جیسے بھنے ہوئے چنوں کا چھلکا الگ کر رہے ہوں اور اندر کا چنا الگ:

” بہت قریب آ چکے ہیں...... شاہ رگ سے بھی زیادہ قریب۔ وہ جہاں جہاں بھی گئے ہیں‘ تیر کی نوک سے زمین کو تقسیم کرتے گئے ہیں۔ اطاعت کو اپنی زائیدہ گردانتے ہیں۔ تم نے اُن کی گردنوں میں جھولتی گھنٹیوں کی آواز سنی؟...... ذرا دو چار اُلٹے قدم اٹھاؤ‘ پھر سنو اور بتاؤ کہ گھر گھر‘ گلی گلی کام والوں کو کام سے چھٹی کیوں دے دی گئی۔ کاپیاں کتابیں کھلی کی کھلی پڑی رہ گئیں۔ اِملا اور خوش خطی میں سو میں سے سو نمبر حاصل کرنے والے کہاں گئے۔ اعراب ہٹے لفظ ہوا سے ہلکے ہوئے اِدھر اُدھر اڑنے لگے۔“

میاں جی بات کرتے ہوئے ذرا رکتے‘ پھر اپنے ایک ہاتھ پر پھونک مارتے‘ جیسے چنے کے اُن چھلکوں کو اڑا رہے ہوں اور بتا رہے ہوں:

” لفظ شروع میں ایسے...... پھر ایسے...... اور پھر ایسے اُڑے۔“

پھر وہ زمین پر بکھرے پڑے چھلکوں کے ڈھیر کی طرف دیکھتے‘ جنھوں نے کچھ لحہ پہلے ہی اپنی پرواز مکمل کی ہوتی:

”اب اُڑیں گے نہیں‘ بس یونہی پڑے رہیں گے‘ جیسے منکوں کی یہ اُترن پڑی ہے۔“

یوں تو یہ تینتیس منکوں کی تسبیح تھی‘ مگر جب اِس کے منکے ڈھلکنے لگتے‘ تو یہ کسی ہزار روپی دیو ہیکل کا رُوپ دھار لیتی اور پھر سکڑنے لگتی جیسے آدھی رات کے کسی مہا تا بیے میں تاروں بھرا آسمان‘ فجر کے ملگجے میں گنتی کے چند ستاروں ہی کو بچا پاتا ہے۔

”میاں جی‘ شاہ رگ پر کیا ایک قبضہ کافی نہیں تھا‘ جو یہ بھی اِسی طرف چلے آرہے ہیں؟“

ویرے کے سوال پر میاں جی کے چہرے کا رنگ بدلنے لگتا‘ ایک آتا ایک جاتا...... خاکی سے نوری‘ نوری سے ناری...... ناری دائرہ پورا ہونے پر پھر خاکی میں بدل جاتا۔ وہ گردن اُٹھا کر اُوپر چھت کی طرف دیکھتے‘ جیسے کسی سے تخلیے کا کہ رہے ہوں۔ پُرانے درباری سمجھ جاتے اور نئے مریدوں کو بھی ٹہوکے سے باہر کھسک جانے کا کہتے۔ دربار کا احاطہ خالی ہو جاتا۔ سب سے پرانے مرید کے پاس ایک سوال ابھی بچا ہوتا۔ ویرے دہلیز سے باہر قدم رکھتے ہوئے ہمت کرتا اور پوچھ لیتا:

''میاں جی کہیں چھوکی شاہ کا جمورا تو ہماری جاسوسی نہیں کر رہا؟''

جواب میں وہ کاندھوں پر پڑی چادر کو کھولتے اور سر پر ڈال کے لمبا گھونگھٹ کھینچ لیتے:

''وہ بھی کر رہا ہے اُور تم بھی اُور میں بھی!''

نقاب کے اَندر سے کچھ دیر آوازیں چھن چھن کر باہر آتی رہتیں' جس سے کپڑے میں معمولی سی لرزش رہتی۔ ایک بولنے والا ہوتا اور ایک سننے والا۔ پھر دروازہ بند ہو جاتا' چاہے جانے والا آدھا اَندر اَور آدھا باہر ہی کیوں نہ رہ گیا ہو۔

''میاں جی' دروازہ کھولیے' میرا ایک پاؤں ابھی اَندر ہے.....کوئی ہے جو دروازہ کھولے؟''

دروازہ کھلتا نہ کھلتا' ویرے ایک پاؤں کے ساتھ بیٹھک میں لوٹ آتا اور کسی کو پتا بھی نہ چلتا کہ دُوسرا پیر کہیں چھوڑ آیا ہے۔ یہ مان لینا اِس لیے بھی آسان تھا کہ اُس گلی کے رہنے والے سب ایسے ہی تھے، لنگڑا کر چلتے تھے مگر محسوس نہ ہونے دیتے تھے کہ ایک ٹانگ کی بستی میں اُتارے گئے ہیں۔ وہ بیٹھک کی کھڑکی کھول کر بیٹھ جاتا۔ چوپایہ جاسوس اُور وہی دو ٹانگوں والے اپنے اپنے جوتوں کے پاس اپنی اپنی مشق میں مصروف نظر آتے' باہر سے آنے والے اُور اَندر تک گھس آتے۔

''وہ بھی کر رہا ہے اور تم بھی اُور میں بھی''

''میاں جی آپ اور ہم کیسے ..... کیسے کر رہے ہیں اپنی ہی جاسوسی؟''

لوہے سے لوہا ٹکراتا اُور ویرے اپنے گریبان سے نکل کر کھڑکی کی سلاخوں سے باہر دیکھنے لگ جاتا۔

''آج تو اگلی دو ٹانگوں کو ہوا میں لہرا کر ہی دم لیں گے۔''

''جیسے جیسے ڈبو کرے گا' ہم بھی کرتے جائیں گے.....ٹھیک؟''

''ایک دم ٹھیک!''

''تو پھر پڑھیے بسم اللہ!''

''بسم اللہ!''

پھر اُن میں سے ایک شخص' جو سب سے آگے کھڑا ہوتا ..... کھڑکی کی طرف بڑھتا' ڈبو سے مخاطب ہوتا۔

''یار ایسی بھی بیگانگی کیا..... تمھارے شہر میں آئے ہیں' یہ دو ٹانگیں اُدھار دے دو ہمیں!''

ڈبو جھرجھری لیتا اور اپنی اُون ویرے کی دیوار کے ساتھ رگڑنے لگتا' جیسے ویرے کو اپنا ہم خیال بنانا چاہتا ہو۔

''واپس کر دیں گے تمھیں تمھارا مال' فتح کے بعد!''

ہجوم میں سے اُور لوگ بھی اپنے کمانڈر کا ساتھ دیتے۔

''کئی گنا زیادہ صلہ دیں گے تمھیں..... اِقتدار میں آ کر!''

ڈبو جواب میں اِتنی تیزی سے خود کو دیوار کی اینٹوں کے ساتھ رگڑتا کہ جلد میں سے خون رسنے لگتا۔ ویرے خون دیکھتا تو کھڑکی کی سلاخیں چھوڑ کر دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھتا اور چہرہ ڈھانپ لیتا۔ ڈبو سلاخوں کے دُوسری طرف ویرے کو دیکھتا رہ جاتا' جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ لوگ کس فتح کی بات کر رہے ہیں اور صلے سے ان کی کیا مراد ہے!

‘‘صلہ و ثواب مراد ہے ڈبو' صلہ و ثواب ...... اور کیا! یہ وہی ستر ہزاروی روپ کے بہروپ ہیں .....تو سمجھتا کیوں نہیں؟’’

ویرے چہرے پر پڑے دونوں ہاتھوں کے جال میں سے جھانک کر اُسے بتاتا اور پھر دونوں خاموش ہو جاتے۔ ویرے کی اُنگلیاں کھڑکی کی سلاخوں کو چھو رہی ہوتیں' سر کے بالوں میں سویرے سویرے خاکروب کی اُڑائی ہوئی دُھول اُڑ اُڑ کر پڑتی اور باہر سے اندر دیکھنے والوں کے لیے وہ بے دھڑ کی ایک تصویر سے زیادہ کچھ نہ ہوتا' سر سے چہرے تک' یا حد سے حد کاندھوں تک اور بس ...... نیچے کچھ نہیں۔ گھر کی ایک عمر رسیدہ خاتون سویرے سویرے صحن کے ایک کونے میں لکڑیاں جلا جلا کر حقے کی ٹوپی میں کوئلے بھرنے میں جُت جاتی۔ خاتون کے صرف ہاتھ ہلتے ہوئے دکھائی دیتے یا اُس کی دُہری پشت' جس پر جابجا کٹاؤ اور دراڑوں کے راستے آتے جاتے سانس کا اُتار چڑھاؤ محسوس ہو سکتا۔ وہ چمٹے کے ساتھ ایک ایک کوئلہ پکڑ کر ٹوپی میں رکھتی جاتی۔ دُخان کے اُوپر دخان' چنگاری کے اندر چنگاری اور پھر جوتے کے ایک تلوے سے آتشیں اُبھار کو تھپکی پر تھپکی دیتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھ سات منزلہ عمارت کھڑی ہو جاتی۔ شروع کے سب سے زیادہ کسیلے گھونٹ وہ خود بھرتی اور کھانسنے لگتی:

‘‘چلو بوٹی تو ہوئی!’’

پھر وہ دُہری کمر کے ساتھ ہی بیٹھک کی کھڑکی میں اندر باہر پڑے ویرے اور ڈبو کو دیکھ آتی۔ بڑھیا اُن کے کانوں میں اپنا رس گھول کر اوجھل ہو جاتی:

‘‘دامن کجا چاڑھیا' اگ بالی ملتان
بلی پھوکاں ماردی تے سڑ گیا ہندوستان’’

پھر وہ حقہ آپ ہی آپ گھر کے سب حقہ بازوں تک پہنچتا رہتا' جیسے اِسے پاؤں نہیں پَر لگ گئے ہوں۔ حقے کی نڑی کبھی کسی چارپائی کے سرہانے سے نمودار ہوتی اور کبھی کسی پائنتی کے شمال جنوب میں دھری ملتی۔ کبھی پیڑھی پر بیٹھی کوئی بی بی گڑگڑ کر رہی ہوتی اور کبھی کوئی گلی میں سے آ کر کھڑے کھڑے خالی پیٹ میں ایک دو کش اُنڈیل کر کام پر نکل جاتی؛ یا زیادہ سے زیادہ مونج کے مونڈھے سے پیٹھ ٹکا کر کھانس لیتی اور یوں اُس کی حاضری بھی لگ جاتی۔ بچے بھی آنکھ بچا کر دخان اور دھواں اپنے اندر کھینچنے کو لپکتے اور انڈے پراٹھے میں تمباکو کا مزہ بھی شامل کر لیتے۔ وہ جو پہلی پہلی بار نڑی کو پکڑتے' وہ تو ہوا کو پھیپھڑوں میں کھینچنے کے بجائے'

اُلٹا پھونک ہی مار دیتے' جیسے غبارہ پچلا رہے ہوں اور ٹوپی پر پڑی راکھ کی پتلی چادر کپکپا کر رہ جاتی۔ پھر یہ بچے ملیشیا کا یونیفارم پہنے' گلے میں خاکی بستے لٹکائے اور ہاتھوں میں تختیاں لہراتے سکولوں کا رُخ کرتے...... جیسے مرغی کے انڈے میں سے چوزہ نکل آئے اور پھر خود ہی نرم نرم پاؤں رکھتا چلنا بھی سیکھ لے' بالکل ایسے ہی یہ بچے بھی اکیس دن والے زیادہ اور نو ماہ والے کم لگتے تھے...... مگر حقہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا ہوتا' دور چل رہا ہوتا۔

اُدھر دو چار زمانے پرے مولوی صاحب نے سیپارہ پڑھاتے پڑھاتے شیروانی کی دائیں جیب میں سے نسوار کی ڈبیا نکالی' انگوٹھا اور انگشتِ شہادت جوڑ کر چٹکی بنائی' چٹکی میں ذرا سا نسواری سفوف بھرا اور ناک کی دونوں نالیوں میں گھسیڑ کر اندر کی طرف ایک ہی لمبا سانس کھینچا کہ پورے کا پورا کمرہ چھت کے شہتیر بالوں تک مہک سے بھر گیا اور مولانا صاحب ایک ذرا سی چھینک مار کر سارے دِن کی دوڑ دھوپ کے لیے تیار ہو گئے۔ اب مولانا کے نقال بھی حرکت میں آئے۔ بچوں کو سبق دے کر وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے اُونگھنے لگے کہ اُن میں سے ایک نے شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈال دیا...... ہاتھ کیا' بازو بھی جیب کے اندھے کنوئیں میں غائب ہو گیا۔ مہینے بھر کا چندہ ایک ساتھ کھنک اُٹھا۔ دو روپے ایک' پانچ ایک' کل ملا کے سات اور ابھی باؤ یونس کے گھر سے چار چونیاں آنا باقی تھیں کہ نسوار کی ڈبیا پر ہاتھ جا پڑا۔ چور ہاتھ نے تیسری اور چوتھی اُنگلی میں خزانے کو دبا کر رحل پر ٹکا دیا۔ پھر سب بچوں نے سبق والے صفحے کو اوپری کونے سے دُہرا کر کے' چوم کر سیپارے ایک طرف رکھے' اُنگلیوں کی اُنھیں درزوں میں اپنی اپنی چٹکیاں نسوار سے بھریں اور نتھنوں کے قریب لے جا کر باہم جُڑے ہوئے پوٹوں کو ایک دم کھول دیا۔ اُنھیں اندازہ نہیں تھا کہ آگے کیا کرنا ہے' ناک اور نسوار کو آمنے سامنے پا کر سانس کتنا اندر اُتارنا اور کتنا باہر بھیجنا ہے۔ بس پھر کیا تھا' ہر کسی کو کسی نہ کسی نے یاد کر لیا اور وہ یاد آتے چلے گئے۔ بھولنے والوں میں کون کون تھا...... کوئی ایک ہوتا تو نام بھی ہوتا؛ مگر یہاں تو پوری کی پوری بچہ برادری تھی جو یاد کر رہی تھی اور یاد آ رہی تھی۔

اب کوئی ڈبو سے پوچھے تو بتائے کہ وہ دِن رات اُس پر کیسے گزرے!

"دو ٹانگیں کمانڈر کے پاس رہن رکھ دوں...... مگر کس لیے!"

"صلہ وثواب کے لیے پیارے بھائی!"

ڈیوڑھی میں پڑا پہلے وہ سوال کرتا اور پھر خود ہی جواب بھی ڈھونڈ نکالتا۔

"اجر وثواب اِتنا تو ہو کہ بغیر حساب کے بات بن جائے!"

"ہو گا...... ہو گا کیوں نہیں...... آخر یہ مستقبل کے فرماں رواں کا وعدہ ہے!"

"ڈبو پہلوان کی دو ٹانگیں اور دُور دیس سے آئے کمانڈر کی چار...... پوری فوج کی بھی چار چار۔ زینے کیا کہےگی کہ اُس کی پوڑی کو پار کرتے کرتے خود بھی......"

”وہ گئی بھاڑ میں۔ میرا تو بخشش کا معاملہ ہے۔ اُور پھر تھوڑے دِنوں ہی کی تو بات ہے، واپس مل جائیں گی۔“

”ہاں ہاں مل جائیں گی اُور میں اُسی طرح آنے جانے والوں کو روک روک کر پوچھوں گا، بقرعید پر چھوٹی قربانی کون کرے گا اور بڑی کون؟“

کل رات اگلا وقت تھا نہ پچھلا، جب ویرے سوال لے کر پہنچ گیا:

”میاں جی، ڈبو مان جائے گا...... مستقل انسان بننے پر؟“

ہزاروی دیوی کی روشن بانہیں اندھیرے کو جھولا جھلا رہی تھیں۔ صدی صدی کے دہے دہے پر رُکتیں اُور پھر چلنے لگتیں...... جیسے پہلی بات چلے، رُکے، پھر چلے، اُور پھر......

”چھووو...... تم مان گئے اپنا آدھا دھرم دینے پر...... میں...... وہ بھی تو ہم میں سے ہے!“

میاں جی نے کل رات پہلی بار اپنا گھونگھٹ ٹخنوں تک سرکا دیا۔ چادر کی سطح پر اُبھرنے ڈوبنے والے بھنوروں سے چھوٹتے گولے اُور زیادہ طوفانی ہو گئے۔

کمانڈر اُور ڈبو کے مذاکرات کامیاب ہو چکے تھے۔ چوپائی فوج اپنے مورچوں میں سے لیس ہو کر نکلی اور محاذ پر چڑھ دوڑی۔ ہر سپاہی نے اپنی اگلی دو ٹانگوں سے دشمن کے مورچوں کی طرف پیش قدمی کی۔ پچھلی دو زمین میں دھنستی گئیں اُور سامنے کی دو خود بخود اُوپر کو تن گئیں۔ حملہ آور فتح کے عین قریب پہنچے تو پوری پلٹون کے آگے کے دونوں پنجوں کا رُخ آسمان کی طرف تھا، پچھلے دونوں کہیں گہرائی میں اُتر چکے تھے اُور درمیان میں نصرت یاب حملہ آوروں کے جسم جھول رہے تھے۔ اب سے پہلے تو صرف ایک ڈبو یہ تماشا دکھایا کرتا تھا اُور اجازت بھی اُسی کو تھی، جیسے یہ چھوٹ بچوں نے اُسے دلوائی ہو۔

”تن جا!“

”تن گیا!“

”گھوم جا!“

”گھوم گیا!“

وہ پچھلے دو پَیروں پر گھوم جاتا اور ساری سمتوں میں سلام پہنچاتا جاتا۔ گلی کی اینٹوں پر پرکار پھر جاتی، دائرے میں سے دائرہ نکل آتا۔ پھر سارے بچے ایک ساتھ اپنے بائیں ہاتھ کا پنجہ اُس کی طرف لہراتے۔ وہ جس بھی مدار میں گھوم رہا ہوتا، رُکنے کا اشارہ پا کر وہیں رُک جاتا۔ کھیل کا سارا لطف بھی اِسی میں تھا کہ جٹ طیارے کو عین اُس وقت ایمرجنسی لینڈنگ کرنا پڑتی جب وہ اِنتہائی رفتار سے علاقۂ غیر کے قریب پہنچ چکا ہوتا۔ سپر سانک سپیڈ کے فی سیکنڈ ہزارہا کلومیٹر اچانک صفر ہو جاتے۔ بچے دائروں کی طرف لپکتے اُور اپنا اپنا مرکز ڈھونڈ نکالتے۔ مگر کل اِتنے سارے ڈبوؤں کو ایک ساتھ دیکھ کر وہ سہم گئے تھے۔ اُنھیں اپنے ڈبو کی فکر لاحق

ہوئی ......اصلی والے ڈبو کی۔

”ڈو وووووووو......تم جہاں بھی ہو واپس آ جاؤ!“

”نہیں نہیں، تم میں سے کوئی بھی ہمارے والا نہیں!“

”وہ تو ہمیں ہنساتا تھا......تم ہمیں مارتے ہو!“

”ہٹاؤ یہ پاؤں ہمارے سینے پر سے، ورنہ ہم اللہ میاں سے تم سب کی شکایت کریں گے ......اللہ میاں ں ں ں، دیکھ لیں یہ کیا کر رہے ہیں!“

اُس وقت پورا آسمان دو دو ٹکلوں کی ٹکڑیوں میں تقسیم تھا اور پیش قدمی جاری تھی۔

آج کی صبح دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی ......ایک حصہ چھوکی شاہ کی تین پائیدانوں والی پربنی پر اور دُوسرا ویرے کی کھڑکی پر پڑا تھا۔ اُدھر ویرے کو میاں جی تسبیح والے نہیں ملے اور اِدھر چھوکی شاہ اکیلے سِنی کے پائیدانوں سے اُتر رہا تھا۔ اُس کے پیچھے ڈیوڑھی میں کھونٹی سے کھلی ہوئی زنجیر فرش پر خاموش بل کھا رہی تھی۔ میاں جی کے احاطے میں اور چھوکی شاہ کی ڈیوڑھی میں ایک جیسا تخلیہ تھا ......ایک جیسے لوگ تھے۔

ڈبو نے اپنی ٹانگیں تو دے دیں مگر گلے کی زنبیل نہیں دی، اُسے کہیں دبا دیا......سلاخوں کے اِس طرف کہ اُس طرف ......ملے گا تو بتائے گا!

☆☆☆☆

نجم الدین احمد

فرار

وہ گھر سے پیدل ہی نکلا تو بازار کھل رہے تھے اور گہما گہمی بڑھ رہی تھی۔ تمازت بڑھنے سے پہلے پہلے گھروں کو لوٹنے کے لیے لوگوں کے پاس خریداری کے لیے بس دو تین گھنٹے تھے۔ آج وہ گھر سے ایک نئے ارادے سے نکلا تھا۔ وہ کچھ عرصے سے ایک خاص کیفیت کا شکار تھا اور اُسے بالآخر ادراک ہو گیا تھا کہ وہ اُسے دھیرے دھیرے پاگل پن کی طرف لے جا رہی ہے۔ وہ اُس کیفیت کا حصار توڑنے کا فیصلہ کر کے باہر نکلا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اب تنہا اُسی کے کندھوں پر کچھ ذمہ داریاں ہیں جنھیں وہ نارمل رہ کر ہی پُورا کر سکتا ہے۔ ورنہ وہ تو پاگل ہوتا سو ہوتا ساتھ ہی اُس سے وابستہ کچھ اَور زندگیاں بھی ہمیشہ کے لیے تباہ اور کاروبار مکمل طور پر برباد ہو جاتا۔ وہ بھک منگے بن جاتے۔

وہ نگاہیں نیچی رکھتے ہوئے، کسی طرف کوئی خاص توجہ دیے بغیر آتے جاتے لوگوں سے ٹکرانے سے اور فٹ پاتھ پر جگہ جگہ بیٹھے چھابڑی فروشوں کے خوانچوں سے بچتا ہوا چوک تک پہنچ گیا جہاں کُہرام مچا ہوا تھا۔ وہ اپنے ارادے پر قائم رہتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا کہ ہنگامہ کیوں برپا ہے لیکن تجسس کے ہاتھوں مجبور بھی ہو رہا تھا۔ اندرونی کشمکش اُسے ورغلا رہی تھی کہ بس ایک نظر دیکھ لو کہ کیا ہو رہا ہے، پھر فوراً ہی نگاہیں ہٹا لینا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ایک نظر بھی اُسے وہاں نہیں رہنے دے گی۔ وہ ملوث ہو جائے گا۔ پس وہ بدستور نظریں جھکائے جلد سے جلد وہاں سے دُور جانے کی نیت سے تیز تیز قدموں چلنے لگا۔ اچانک ایک شخص اُس سے ٹکرایا اور وہ گر گیا۔ ہاتھ زمین پر ٹیک کر کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے اُس کی نگاہیں بے اختیار ہنگامے کی سمت اُٹھ گئیں۔ وہ جہاں کا تہاں رہ گیا۔ چند لوگ گالم گلوچ کرتے ہوئے ایک آدمی کو بُری طرح پیٹ رہے تھے۔ کوئی اِدھر سے گھونسا چلا رہا تھا تو کوئی اُدھر سے لات۔ پٹنے والا اُن سے بچنے کے لیے اپنے دونوں ہاتھوں کو سر پر رکھے جھکا ہوا تھا۔ تماشا دیکھنے والوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا لیکن کوئی بھی پٹنے والے کو بچانے کے لیے آگے نہیں بڑھا۔ آہستہ آہستہ منظر کے گرد ہجوم کے دائرے کی دیوار بن گئی۔ اب اُسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اُس نے جتنا دیکھ لیا تھا کافی تھا۔ یک لخت اُس کے دونوں ہاتھ اُٹھے، سر پر آئے اور وہ بیٹھے بیٹھے جھک گیا جیسے مار اب اُس شخص کو نہیں اُسے پڑ رہی ہو۔ اُس کے مُنھ سے بے ساختہ بہ یک وقت کرب بھری کراہیں اور ڈکرانے جیسی چیخیں نکلنے لگیں۔ اُس نے دیکھا کہ اُسے مارنے والوں میں پٹنے والا بھی شامل تھا اور وہی سب سے زیادہ

چلّا تے ہوے اُسے مارنے کے لیے سب کو جوش دِلا رہا تھا۔

’’مارو، سالے کو۔ اِسی نے مجھے ورغلایا تھا...... مارو...... اِسی نے مجھے چوری کرنے کے لیے کہا تھا...... مارو...... یہی میرا ساتھی ہے...... مارو...... پولیس کو بلاؤ...... مارو...... مارو......‘‘

وہ گھٹی گھٹی آواز میں احتجاج کر رہا تھا۔ ’’میں نے کچھ نہیں کیا...... یہ جھوٹ بول رہا ہے...... میں تو اِسے جانتا تک نہیں...... مجھے خوا مخواہ پھنسا کر اپنی جان چھڑ وا رہا ہے۔ مت مارو...... مت مارو مجھے۔‘‘

لیکن اُس کی کسی نے نہیں سُنی۔ اِتنے شور شرابے میں اُس کی سنتا بھی کون! مارنے والوں کے جوش سے کان بند تھے تو تماشا دیکھنے والوں کے شور وغل نے بند کر رکھے تھے۔ اُس کی آہ و بکا اور چیخ و پکار نقار خانے میں طوطی کی آواز کے مصداق تھی۔ پھر بھی اُس کی گردان جاری رہی۔

’’مت مارو...... مت مارو مجھے۔ مت مارو...... مت...... ما...... ر...... و۔‘‘

جانے یہ سلسلہ کتنی دیر چلتا رہا لیکن اُسے لگ رہا تھا کہ اُس کا اُنگ اُنگ رُوئی کی مانند دھنک کر رکھ دیا گیا ہے اور سر پر ہتھوڑوں کی طرح پڑنے والے گھونسوں نے اُس کا بھیجا ہلا کر رکھ دیا ہے۔ جس سے اُس کا سر اور بدن پھوڑے کی مانند دُکھ رہے تھے۔

وہ ہاتھوں کو موڑ کر سر کو کہنیوں کی پناہ میں لیے قوسی حالت میں زمین پر ڈھے گیا لیکن مارنے والے پھر بھی باز نہیں آئے۔ اب اُن کی لاتیں زیادہ چلنے لگیں تھیں۔ اُسے فٹ بال سمجھ لیا گیا اور ہر ایک کی کوشش تھی کہ وہ فارورڈ کا کردار ادا کرتے ہوے اُسے ایک ہی ٹھوکر میدان کے دُوسرے سرے پر واقع گول تک پہنچا دے۔ وہ کبڑی حالت ہی میں زمین پر لوٹنیاں کھانے لگا۔

کسی نے اُس کے لوٹ پوٹ ہوتے بدن کو سختی سے تھام کر جھنجھوڑا۔ ’’ہے بھائی، کیا ہوا ہے؟ تم ٹھیک تو ہو؟‘‘

اِس کے ساتھ ہی اُس کی لوٹنیاں اور چیخیں بند ہو گئیں۔ وہ اُٹھ بیٹھا اور اُلّو کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اب وہاں نہ پیٹنے والے تھے اور نہ پٹنے والا۔ البتہ تماش بین ہجوم کا کچھ حصہ اُس کے گرد جمع ہو گیا تھا۔

’’کیا ہوا؟ کیا بیمار ہو؟‘‘ ایک شخص نے اُسے پانی کا گلاس پکڑاتے ہوے پُوچھا۔ ’’لو، پانی پیو۔‘‘

وہ غٹا غٹ پانی پینے لگا۔

’’لگتا ہے، مرگی کا دورہ پڑا ہے بے چارے کو!‘‘ ایک اَور نے مُنھ سے افسوس بھری چُچ چُچ کی آوازیں نکالتے ہوے اپنا تجزیہ پیش کیا۔ ’’بہت بُرا مرض ہے جی۔ اللہ دُشمن کو بھی بچائے۔‘‘

’’مرگی کا دورہ پڑا ہے یا پھر اِس پر آسیب ہے۔‘‘ تیسرے شخص نے اپنی رائے دی۔

’’ہاں جی، سایہ ہی لگتا ہے۔ دیکھا نہیں بُڑبُڑا رہا تھا۔ بار بار کسی نظر نہ آنے والی چیز سے کہہ رہا تھا: مت

مارو مجھے۔ مت مارو مجھے۔" چوتھے نے بات آگے بڑھائی۔

"اِس کا علاج کرواؤ، بھائی۔ ٹھیک ہو جاؤ گے۔ اب یہ نا قابلِ علاج نہیں رہا۔" ایک اَور نے صلاح دی۔ پتا نہیں وہ مرگی کے دورے کی بات کر رہا تھا یا پھر آسیب اور سایے کی۔

"ہاں، یہ اب موذی مرض نہیں رہا۔" مرگی کے دورے والی بات کرنے والے پہلے شخص اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

اُنھوں نے خود ہی فرض کر لیا تھا کہ وہ مرگی کا مریض ہے یا پھر اُس پر آسیب سایہ فگن ہے۔ اُس نے وحشت بھری نظروں سے اُنھیں دیکھا۔ دو نوجوان اُسے بازوؤں سے تھام کر اُٹھانے لگے تو وہ اپنے بازو جھٹکے سے خود کو چھڑا کر لوگوں کو ہٹاتے ہوئے بھاگ نکلا۔ وہ دونوں وہی تھے۔ اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ دوڑتے ہوئے اُس نے سُنا کہ کوئی کہہ رہا تھا: پاگل لگتا ہے۔

چائے کے ایک ہوٹل کے باہر پڑے بنچ پر بیٹھ کر وہ دھونکنی کی طرح چلتی ہوئی اپنی سانسیں ہموار کرنے لگا۔ اُسے خود پر قابو پانے میں بہت دیر لگی۔ اُس نے پپڑی جمے ہونٹوں کو زبان سے تر کرتے ہوئے ساتھ والے بنچ پر پڑے سٹیل کے گندے جگ سے گدلے شیشے والے گلاس میں پانی اُنڈیل کر مُنھ سے لگایا اور پہلے ہی بڑے سے گھونٹ پر اُسے اچھو لگ گیا۔ وہ بُری طرح کھانسنے لگا۔ کھانسی تھمی تو اُس نے چھوٹے گھونٹ لے کر گلاس ختم کیا اور پھر دُوسرا بھر لیا۔

اب وہ سڑک سے ہٹ کر نہر کے کنارے درختوں تلے سبزہ بچھی زمردیں زمین کی چوڑی پٹی پر خاموشی سے سر نہواڑے چلے جا رہا تھا۔ اُس کے ذہن میں کوئی سوچ نہیں تھی۔ وہ سوچنے سے دانستہ گریزاں تھا اور مصمم ارادہ کیے ہوئے تھا کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ نظریں اُٹھانے اور کسی بھی واقعے یا ایسی چیز کو دیکھنے سے احتراز کرے گا جو اُسے بہا کر کہیں سے کہیں لے جائے۔ اِسی لیے جب سے وہ نہر کی پٹڑی پر چڑھا تھا تب ہی سے بس گھاس کے ہرے تنکوں کو خالی خالی نظروں سے تکتے ہوئے بلا مقصد چلا جا رہا تھا۔ ہاں، بلا مقصد کیوں کہ اُسے خود بھی نہیں پتا تھا کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہا ہے۔ اُسے معلوم تھا تو صرف اِتنا کہ دوپہر ہونے کو آئی ہے اور اُسے رات پڑنے تک کا وقت ایک کڑے امتحان سے گُزرتے ہوئے بِتانا ہے جس میں کامیابی ہی اُس کی نجات کا واحد راستہ ہے۔

ایک جگہ ٹھہر کر اُس نے نہر کے بلبلے اُٹھتے گدلے پانی کو دیکھا۔ بلبلے ہفت رنگ تھے اور پانی میں سُورج اپنی پُوری آب وتاب سے چمکتے ہوئے آنکھوں میں نابینائی کی چمک بھر رہا تھا۔ اُس نے گھبرا کر نظریں ہٹائیں۔ دونوں ہاتھوں سے آنکھیں اچھی طرح ملنے کے بعد ستانے کے لیے قریبی درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اُس کی نظریں نادانستگی میں بے ساختگی سے اُٹھ گئیں۔ وہ مبہوت رہ گیا۔ سڑک کے پار سُورج کی آب وتاب کو مات دیتا سفید ملبوس میں گدریا ہوا گورا بدن نگاہوں کو اپنے ساتھ چپکا رہا تھا اور ہٹانے کی کوشش میں اپنے

ساتھ اُور چمٹا لیتا تھا۔ آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ، بکھری ہوئی شہد رنگ ریشمی زُلفیں جو گرم اور ہلکی ہَوا میں پیچھے کی سمت لہراتے ہوئے ناگنوں کی مانند کنڈل پھیلا رہی تھیں۔ وہ اُسے پہلی ہی نظر میں دُنیا کی حسین ترین عورت لگی۔ مرکزی سڑک سے مُڑ کر اندرونی گلی میں جانے سے پہلے وہ لحہ بھر کے لیے ٹھیری۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُس کی نظریں اُس پر بھی پڑیں۔ اُس کی محویت بڑھ گئی۔

اُس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اُسے دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھیں مُند گئیں جیسے اُنھیں حسن نے خیرہ کر دیا ہو۔ اچانک اُسے چنبیلی کی بھینی بھینی مہک آنے لگی اور اپنے قریب کسی کی موجودگی محسوس ہوئی۔ وہی حسینہ اپنے بدن کی مہک سے اُس کے دماغ کو معطّر کرتی اُس کے پاس کھڑی تھی۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ بس چُپ چاپ اُس کے جلووں میں کھویا رہا۔ وہ ساتھ بیٹھ کر اُس کا ہاتھ اپنے چھوٹے چھوٹے نرم و نازک مخروطی اور بے داغ سفید مرمر جیسے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں گہرائی تک جھانکنے لگی۔ بہت دیر گُزر گئی لیکن دونوں کچھ بولے نہ اُنھوں نے پلکیں جھپکیں۔ اُس کے ذہن میں بے اختیار یہ شعر گھوم رہا تھا:

میرؔ اُن نیم باز آنکھوں میں
ساری مستی شراب کی سی ہے

”کب تک یُوں ہی چُپ بیٹھے رہو گے؟“ پنکھڑیوں جیسے پتلے پتلے لب ہلے۔

اُن ہونٹوں کو دیکھتے ہوئے اُسے ایک بار پھر بے ساختہ میرؔ تقی میرؔ کی اُسی غزل کا ایک اُور شعر یاد آ گیا:

نازکی اُس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے

”جی چاہتا ہے بس تم یُوں ہی میرا ہاتھ تھامے میری آنکھوں میں دیکھتی رہو اور عمر بیت جائے۔“ اُس نے اُسے مخمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جذبات سے بوجھل لہجے میں سرگوشی کا جواب سرگوشی سے دیا۔

”لیکن میں زیادہ دیر ٹھیر نہیں سکتی۔“ عورت اپنی کلائی سے بندھی نازک گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے بولی۔ اُس کی جِلد اِتنی شفاف تھی کہ اُس پر اُگے ہوئے روئیں نرم گھاس کی سنہری پھوئیوں جیسے لگتے تھے۔ ”مجھے جانا ہوگا ورنہ معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔“

”دوبارہ آؤ گی؟“

”اب مشکل ہے۔ کل۔“

”نہیں، میں تمھارا یہیں انتظار کر رہا ہوں۔“

”تم ضد بہت کرتے ہو۔“ وہ اِٹھلائی۔ ”میں کوشش کروں گی۔“

”جب تک تم نہیں آؤ گی میں تمھارا انتظار کرتا رہوں گا۔“ وہ اُس کے رُوئی کے گالوں جیسے نرم نرم ہاتھ اپنی گرفت میں لیتے ہوئے بولا۔

''چاہے قیامت آ جائے؟'' اُس نے شوخی سے پُوچھا۔

''ہاں، چاہے قیامت آ جائے۔''

اُس کے لہجے کے عزم پر وہ تڑپ اُٹھی۔ ''اچھا، آؤں گی۔ تمھیں چھوڑ کر جانے کو میرا بھی دِل نہیں چاہتا لیکن کیا کروں مجبوری ہے۔''

''وعدہ؟''

''میں کوشش کروں گی۔'' اُس نے دھرایا۔

''کوشش نہیں، وعدہ کرو۔'' اُس نے اصرار کیا۔

''اچھا بھئی، وعدہ۔ اب ٹھیک ہے۔'' وہ اُس کی طرف والہ وشیدا نگاہوں سے دیکھتی ہوئی ہنسی تو اُسے لگا جیسے دُور کہیں مندر کی نقرئی گھنٹیاں لے میں بجنے لگی ہوں۔

وہ اپنے ہاتھ چھڑا کر اُٹھنے لگی تو اُس کی آنکھوں میں یاسیت کے لپکتے کوندے دیکھ کر اُس کی اپنی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''بس۔ اب ...... میں آؤں گی۔'' اور جانے کے لیے مرے مرے قدموں سے مُڑی تو اُسے لگا جیسے اُس نے جانے کے لیے اپنے دِل پر جبر کیا ہو۔ وہ اُسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ وہ ہلکے ہلکے قدموں سے چل رہی تھی لیکن پھر بھی اُس کے فراز تھرا رہے تھے جن کی تھرتھراہٹ سے اُس کا دِل دھڑکنا بھول نے لگا اور سانس سینے میں ٹھیر گئی۔

بلند آہنگ قہقہوں اور باتوں کی اُونچی آوازوں سے وہ حال میں لوٹا۔ چند لڑکے ہاتھوں میں مکئی کے پُھلوں کے لفافے پکڑے، ایک ایک پُھلا ہَوا میں اُچھال کر مُنھ سے پکڑنے کی کوششیں کرتے ہوئے قہقہے لگاتے ایک دُوسرے پر فقرے کَس رہے تھے۔ وہ ایک گھنے سایہ دار درخت تلے نیم دراز اُنھیں نیم وا غنودہ آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ اُن میں وہ دونوں بھی شامل تھے اور افسردہ نظروں سے اُسی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ باقی لڑکے اپنی ہی مستیوں میں مگن تھے۔ لڑکے اُس کے قریب آ کر ٹھیرے تو وہ اُن سے خوف زدہ ہو کر اُٹھ کر وہاں سے چل دیا۔

رات کی بتیاں جلنے لگیں تب اُسے اپنے گھر کے نزدیکی پارک کے بیرونی جنگلے سے پشت ٹکا کر بیٹھے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ پارک سے باہر گاڑیوں کا شور گُونج رہا تھا۔ وہ سہ پہر ہی سے وہاں تھا۔ اب تک وہ بچوں کے ساتھ بچہ بنا پھسلیاں لیتا، پتلے ربڑ کی بنی غباروں جیسی نرم فٹ بالوں کو ہَوا میں اُچھالتا، پینگیں لیتا، برف پانی اور جانے کون کون سے کھیل کھیلتا رہا تھا۔ ایک بچہ جھولے سے پھسل کر گرا تو اُس کی نکسیر پُھوٹ نکلی اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ بچوں اور عورتوں کے لیے مخصوص میدان کے ساتھ والے میدان میں نیچی باڑ کے بالکل ساتھ ایک یوکلپٹس کے سائے تلے سنگی بنچ پر بیٹھا ہے۔ پھر اُس نے بچے کی ماں کو اُسے سنبھالتے، باپ کو اپنا رومال اُس کی ناک پر رکھ کر پانی کے نل کی سمت لے جاتے دیکھا اور اپنی جگہ

سے اُٹھ کر دِھیمے قدموں سے چلتا ہوا آہنی سلاخوں والے اُس جنگلے کے پاس آیا جہاں اب وہ ٹیک لگائے خالی الذہن بیٹھا تھا۔ اُسے لگ رہا تھا جیسے اُس کا دماغ ہر سوچ، ہر خیال اور ہر یاد سے خالی ہو چکا ہو۔ وہاں اب صرف اندھیرے کا راج ہو اور وہ ہمہ قسم کے مصائب، آلام اور پریشانیوں سے آزاد ہو چکا ہو۔

جیسے سُورج کے رُخ بدلنے پر روشنی کی ایک ننھی سی کِرن اندھیرے کمرے میں داخل ہو کر کمرہ جگمگا دیتی ہے، اُس کے ذہن میں بھی ایک سوچ چمکی۔ گھر لوٹنے کا خیال آنے کے ساتھ ہی ایک اَور احساس نے اُس کے اندر افسردگی اور مایوسی کی گہری لہر دوڑا دی۔ اُسے محسوس ہوا جیسے وہ ہار گیا ہو۔ لیکن اُس نے دِل ہی دِل میں کوشش کرتے رہنے کا دوبارہ عزم کیا۔

مرکزی دروازے سے نکل کر وہ سڑک پار کرنے کے لیے رُک کر انتظار کرنے لگا۔ زناٹے بھرتی ہوئی گاڑیاں قطار در قطار یُوں بھاگی چلی جا رہی تھیں جیسے موت اُن کے پیچھے پڑی ہو اور وہ ذرا بھی دِھیمی پڑیں تو وہ اُنھیں آدبوچے گی۔ پھر اُن کی رفتار سست پڑنے لگی۔ اُس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ لال بَتی روشن ہونے پر گاڑیوں کی تین قطاریں لگنے لگی تھیں۔ قطاروں کے طویل ہونے اور گاڑیوں کے مزید دِھیما پڑنے کا انتظار کرتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ اگر اشارے میں سُرخ بَتی نہ ہو تو شاید وہ گاڑیاں زندگی بھر تیز رفتاری سے بھاگتی ہی رہیں۔ قطار اُس تک پہنچ چکی تھی اور اب وہ اطمینان سے اُن کے درمیان چلتے ہوئے سڑک پار کر سکتا تھا۔ ایک بڑی سی ڈبل ڈور جیپ عین اُس کے سامنے آ کر ٹھیری۔ جس کے آگے سے گُزرتے ہوئے اُس نے ایک اچٹتی ہوئی بے ساختہ نظر سامنے والے شیشے سے گاڑی کے اندر دوڑائی۔ گاڑی چلانے والا نوجوان اپنے موبائل فون کو کان سے لگائے ہنس ہنس کر کسی سے محوِ گفتگو تھا۔ اُس کی ساتھ والی نشست پر اُس سے قدرے کم عمر ایک نوجوان کھڑکی پر کُہنی ٹکائے بے خیالی سے پارک میں دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں اُسے شناسا لگے لیکن وہ تیزی سے گاڑیوں کی کھڑی قطاروں کو کاٹتا ہوا دو رَویہ سڑک کو درمیان سے جُدا کرنے والی اُونچی جگہ کے وسط میں سبزہ لگی کچی زمین پر کھڑا ہو کر دُوسری رَو کی گاڑیوں میں وقفے کا انتظار کرنے لگا۔ اِدھر بھی پہلی رَو والی صُورتِ حال تھی۔ اُس کا انتظار کچھ طول پکڑ سکتا تھا۔ اُس کا دھیان اُن دونوں لڑکوں کی طرف چلا گیا۔

‘‘پاپا، چلیں۔ اشارہ کھل گیا ہے۔’’ ساتھ والی نشست پر بیٹھے اُس کے بڑے بیٹے نے فون بند کرتے ہوئے کہا، جو اپنی ماں سے بات کر رہا تھا۔

اُس نے گاڑی آگے بڑھائی اور پُوچھا۔ ‘‘تمھاری مَما کیا کہہ رہی تھیں؟’’

‘‘مَما بھی خوامخواہ پریشان ہونے لگتی ہیں۔’’

‘‘اب کس بات پر پریشان تھیں؟’’ پچھلی نشست سے چھوٹے بیٹے نے مُنھ بناتے ہوئے دریافت کیا۔

‘‘بس وہی ہمیشہ والی بات۔ بار بار یہی پُوچھ رہی تھیں کہاں پہنچ گئے ہو تم لوگ؟ گھر کتنی دیر میں پہنچ جاؤ گے؟’’ اِس بار بڑے نے چھوٹے ہی کی طرح مُنھ بناتے ہوئے جواب دیا۔

’’ماں ہے نا تمھاری۔ اِس لیے پریشان ہوتی ہے۔‘‘ اُس نے بیٹوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

’’پاپا، وہ بھی تو سمجھیں کہ ٹریفک بھی تو جام ہو سکتی ہے۔‘‘ بڑا بولا۔

’’پاپا، اب ہم بچے تو نہیں رہے۔‘‘ چھوٹے نے لقمہ۔ ’’اور پھر آپ بھی تو ساتھ ہیں۔‘‘

’’ہاں، یہ تو ٹھیک ہے لیکن......‘‘ وہ بڑے بیٹے کی طرف گردن موڑے ہوے تھا۔

’’پاپا، سامنے دیکھیے۔‘‘ بیٹے نے تیزی سے قطع کلامی کی۔

اُس نے جھٹکے سے سر گھمایا۔ آگے جاتی ہوئی گاڑی نے اچانک بریک لگائی تھی۔ اُن کی گاڑی اپنی تیز رفتاری کی بِنا پر اُس سے ٹکرانے ہی والی تھی کہ اُس نے اضطراری حالت میں پیر کا پُورا زور بریک پر ڈالا اور ہاتھ کا ہارن پر۔ اِدھر بریک چیخی اور اُدھر ہارن نے شور مچایا۔

وہ دائیں کولہے کے بَل گرا ہوا تھا۔ چلانے والے کی پُوری کوشش کے باوجود گاڑی اُس سے ٹکرا ہی گئی تھی۔ اُسے کولہے میں درد کی شدید لہر محسوس ہوئی۔ پتا نہیں کب وہ دونوں روؤں کی درمیانی بلند سطح سے نیچے سڑک پر اُتر آیا تھا۔ شاید اُس خواب نُما رَو کے درمیان اُس کے لاشعور نے بتایا ہو گا کہ سڑک خالی ہو چکی ہے اور وہ لاشعوری طور پر ہی چل دیا ہو گا۔ وہ بائیں ہاتھ سے کپڑے جھاڑتا اور داہنے سے کولہے پر لگی چوٹ کو سہلاتا ہوا کھڑا ہوا۔ اُس نے تہیہ کیا کہ اب وہ سیدھا گھر جائے گا، رَاستے میں اِدھر اُدھر بالکل نہیں دیکھے گا اور نہ ہی ذہن کو کسی طرف بھٹکنے دے گا۔

....

واقعہ یہ تھا کہ۔۔۔ اور اِس نہایت بھیانک خواب جیسے واقعے نے اُن کی زندگیاں تہ و بالا کر کے رکھ دی تھیں۔ دھونس اور دھوکے سے اپنے سر پر تاج سجانے والے بادشاہ سلامت نے (اُسے بادشاہ کے ساتھ لفظ ’’سلامت‘‘ چبھتا تھا، سب کی طرح اُس کی تمنا بھی اِس لفظ کو ’’ہلاکت‘‘ سے بدلنے کی تھی) اپنی سرشت کے مطابق سپہ کو اپنی ہی رعایا کو گاجر مولی کی طرح بے دریغ کاٹ ڈالنے کا حکم دیا تھا کیوں کہ اُس کی طبیعت پر جمہور کی یہ بات ناگوار گزری تھی کہ وہ اُسے اصل بادشاہ ماننے پر تیار نہیں تھے اور اپنے نجی اجتماعات میں اُس کی پگڑی اُچھالتے تھے۔ جب کہ وہ خُود کو حقیقی بادشاہ سمجھتا تھا کیوں کہ اُس کے خیال میں جمہور کو تو بادشاہ چاہیے ہوتا ہے چاہے کوئی بھی ہو--خواہ کوئی گدھا ہو یا بھیڑیا--اور اپنے لیے بادشاہ کو چننے کا اختیار جمہور کو نہیں۔ جن کو ہونا چاہیے وہ اُس کی بادشاہی پر راضی تھے بلکہ یک چشم مصحفِ اعظم نے تو اپنی اکلوتی بینا آنکھ بھی بند کر کے خُود اپنے ہاتھوں سے اُس کی تاج پوشی کی رسم ادا کی تھی۔ باغی جمہور میں اُس کے دونوں جوان اور کھاتے کماتے بیٹے بھی، جن کے دم سے اُن کے گھر میں روشنی اور خُوشیاں تھیں، شامل تھے۔ تو وہ کیسے بچتے؟ بہت سے گھروں کے ساتھ ساتھ اُن کے ہاں بھی صفِ ماتم بچھ گئی۔ اُن کے گھر اور دماغوں میں اندھیرے بھر گئے۔ ماں چارپائی سے لگ گئی، بہنوں کے چہرے اور آنکھوں میں ویرانی چھا گئی اور باپ......

باپ بولایا بولایا اور سراسیمہ پھرنے لگا۔ اُس کے دماغ میں ہر وقت ایک ہی سوال گونجتا رہتا جسے بُڑبُڑاتی ہوئی زبان اکثر و بیشتر دھراتی رہتی: قسمت، تُو نے مجھ سے کیسا کھیل کھیلا؟ خُدا سے ایک ہی شکوہ ہوتا: ربّا، میرا بھرا پُرا باغ کیوں اُجاڑ دیا؟ اُن کی جگہ مجھے اُٹھا لیا ہوتا! اُسے گھر میں چین پڑتا نہ باہر سکون ملتا۔ اُسے وہ دونوں ہر وقت اپنے آس پاس اُٹھتے بیٹھتے، ہنستے کھیلتے، کھاتے پیتے دِکھائی دیتے۔ کسی نوجوان کو دیکھتا تو اُس کے نقوش میں اپنے بڑے یا چھوٹے بیٹے کا پرتو تلاشنے لگتا۔ دُور سے آتا ہوا کوئی جوان اُسے اپنا کوئی ایک بیٹا لگتا۔ اُس کی بُھوک پیاس اور نیندیں اُڑ گئیں۔ راتیں بےقراری کے عالم میں کبھی سوتے جاگتے، کبھی الٹے سیدھے تو کبھی بھیانک اور کبھی ایسے خواب دیکھتے گزرتیں جن میں اُس کے بیٹے زندہ ہو کر اُس کے پاس لوٹ آتے۔ لیکن اُن خوابوں میں اُس کا من پسند خواب بادشاہ کو تختۂ دار پر لٹکے دیکھنا ہوتا۔ بادشاہ کی گردن کھنچ کر صراحی کی گردن جیسی لمبی ہو جاتی، زبان ٹھوڑی تک لٹک جاتی اور آنکھیں اُبل کر کبوتر کے انڈوں جتنی بڑی ہو جاتیں۔ وہ یہ خوف ناک خواب دیکھ کر ہمیشہ مسرور اُٹھتا ہے۔ جس روز-- عام طور پر ہر دُوسرے تیسرے اور کبھی کبھار ہر روز-- وہ یہ خواب دیکھتا تو آنکھ کھل جاتی اور ابھی آدھی یا کچھ شب باقی ہوتی جو اِس دہشت ناک خواب سے-- جو اُسے کبھی دہشت ناک نہیں لگا-- مسرور ہوتے اور منتشر سوچوں میں بیت جاتی۔ اُسے جاگتی آنکھوں بھی یہ خواب دیکھنا پسند تھا بلکہ اُس کا بس چلتا تو وہ بادشاہ کو اپنے ہاتھ سے پھانسی پر لٹکا دیتا۔

وہ ہر وقت مضطرب رہتا، سوچتا رہتا، خیالوں میں کھویا رہتا۔ اُسے بسا اوقات یاد آتا کہ ایک بار بازار میں اُس کی ایک شخص سے تُو تکار ہو گئی۔ نوبت ہاتھا پائی تک پہنچنے ہی والی تھی۔ ابھی اُس نے اُس شخص کا گریبان پکڑ کر مارنے کے لیے ہاتھ اُٹھایا ہی تھا کہ گشتی سپہ موقع پر پہنچ گئی۔ اُسے بلوے کے الزام میں دھر لیا گیا۔ قید خانے سے جان چھڑوانا مشکل ہو گئی۔ لیکن کیا اُس کے بیٹوں اور بہت سے دُوسرے جوانوں اور عورتوں کی قاتل سپہ اور اُن کے قتل کا حکم جاری کرنے والے بادشاہ ”ہلاکت“ کی گرفت کے لیے کوئی قانون، کوئی سپہ، کوئی قید خانہ اور کوئی منصف نہیں؟ اُس کا ذہن نہایت مایوسانہ جواب دیتا: قانون اُس کا غلام، سپہ اُس کی باندی؛ پھر اُسے گرفت میں کون لے، سزا کون دے؟ قید خانے جمہور کے لیے اور منصف؟ منصف بھی تو اُس کے سامنے ہاتھ باندھنے والے۔ بادشاہ منصفوں کے عہدے اُس اندھے کی مانند بانٹتا ہے جو صرف اپنوں کو ریوڑیاں دیتا ہے۔ منصفوں کے منصب بادشاہ کے مرہونِ منّت۔ وہ جمہور کو انصاف دیں کہ بادشاہ کی حاضری کہ جس کے سبب سے اُن کے منصب ہیں اُن کے سر بادشاہ کے اِس احسان کے بوجھ تلے دبے اور گردنیں اُس کے سامنے جھکی ہوئی ہیں! وہ بُڑبڑاتا: لعنت ہے ایسے قانون پر جس سے منصف بھی اہلیت پر نہیں منظور نظری پر منتخب ہوتے ہیں۔ پھر وہ خُود سے پُوچھتا: تُو بتا، بادشاہ کے مقابلے میں تیری کیا حیثیت، کیا اوقات ہے؟ کیا تُو کسی کو منصف کے عہدے پر فائز کر سکتا ہے؟ دماغ دُکھنے لگتا اور یاسیت بڑھ جاتی۔

یاسیت بھرے بےشمار دِن گزارنے کے بعد بالآخر ایک دِن اُس نے گھر سے نکل کر بیٹوں کی قبروں پر جا

کر دِل ہلکا کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ دوبارہ زندگی کی دوڑ میں شامل ہونے کے لیے تگ و دَو کر سکے۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھا کہ اُس نے احتجاج کرتے ہوئے مشتعل ہجوم کو دیکھا۔ وہ سڑک کے ایک طرف کھڑا ہو کر تماش بین بن گیا۔ اُسے معلوم نہیں ہو سکا کہ لوگ کس بات پر مشتعل تھے۔ شاید مہنگائی بڑھنے پر یا شاید کوئی نیا محصول لگنے پر؟ اُس نے سوچا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نالاں اور بے بس جمہور نے بھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بات بات پر احتجاج کو اپنا وطیرہ بنا لیا ہے۔ روز سپہ کی بندوقوں کا نشانہ بنتے، اُن سے لاٹھیاں کھاتے، اندھے لنگڑے لُولے تک نہ بخشے جاتے لیکن وہ احتجاج سے باز نہ آتے۔ اُنھیں غور سے دیکھتے دیکھتے اُسے لگا جیسے وہ اُس قتلِ عام پر احتجاج کر رہے ہوں۔ اُن کا دُکھ سانجھا ہو گیا اور وہ آنکھیں بند کر کے احتجاج کرنے والوں میں شامل ہو کر بادشاہ اور اُس کی سپہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیے گلا پھاڑ پھاڑ کر احتجاجی نعرے لگانے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد اُسے محسوس ہوا جیسے وہ جنگل میں کھڑا ہے اور اکیلا ہی چیخ و پکار میں مشغول ہے۔ اِس احساس کے ساتھ ہی اُس نے آنکھیں کھول کر ارد گرد دیکھا۔ سڑک خالی پڑی تھی۔ جلوس آگے گُزر چکا تھا اور اُسے دُور سے لوگوں کی کمریں اور نعروں کے لیے اُٹھتے ہاتھ دِکھائی دے رہے تھے۔ اُن کے نعروں کی بلند آوازیں اُس کی سماعت سے محض جھنجھناہٹ بن کر ٹکرا رہی تھیں۔ تو کیا وہ جلوس میں شامل نہیں تھا؟ نہیں تھا تو کہاں تھا؟ اچانک اُس پر منکشف ہوا کہ وہ جہاں بھی تھا اور جتنی دیر کے لیے بھی تھا وہ اِتنی دیر کے لیے اپنا غم و الم بھول گیا تھا اور اب خُود کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اُسے اپنے وجود میں ایک نامعلوم مسرت کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ یہ اُس روگ، اُس سلسلے کا نقطۂ آغاز تھا۔

پھر یُوں ہونے لگا کہ کبھی وہ کوچ بان بن کر تانگے پر سواریوں کو ریلوے سٹیشن سے لاری اڈّے اور لاری اڈّے سے ریلوے سٹیشن چھوڑتا۔ کبھی گداگروں کے گروہ میں شامل ہو کر بھیک مانگتا جہاں کہیں اُسے دھتکارا جاتا تو کہیں اُسے کے ہاتھ پر ایک آدھ سکّہ رکھ دیا جاتا۔ کبھی بس کنڈکٹر بن کر کھچا کھچ بھری بس میں لوگوں کے درمیان سے پھنس پھنس کر نکلتے ہوئے ٹکٹیں دیتا۔ کبھی مالی بن کر باغ کے پودوں کو سینچتا، پانی دیتا، گوڈی کرتا، باڑیں تراشتا اور بڑھی ہوئی گھاس کاٹتا۔ کبھی سمگلر بنتا اور پولیس سے چھپتا پھرتا تو کبھی دہشت گرد بن کر ایک بڑی سی پُر رونق عمارت میں جا گھستا اور وہاں موجود سبھی کو بھون کر خُود کو دھماکے سے اُڑا لیتا۔ کبھی کچھ تو کبھی کچھ اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

شروع میں اُس نے اِسے خُوش بختی گردانا اور اُنھیں ‘سکون کے چند لمحات’ قرار دیا لیکن دھیرے دھیرے اُس کی سمجھ میں یہ بات آتی چلی گئی کہ وہ جب بھی کوئی واقعہ دیکھتا ہے تو خُود اُس میں ملوث ہو جاتا ہے، اُس کا ایک کردار بن جاتا ہے اور انہونی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ روگ کچھ حالات کا تحفہ تھا تو کچھ اُس نے دانستہ اِس کی پرورش کی تھی بلکہ اِسے پالنے میں اُس کا اپنا ہاتھ زیادہ تھا۔ وہ چاہتا تو اُسے آغاز ہی میں کچل ڈالتا اور آج اِس نوبت سے دوچار نہ ہوتا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو مجبور پاتا تھا، اِس سے اُسے ہر وقت کی کرب و اذیت

بھری کیفیت سے چھٹکارا مل جاتا تھا۔ وہ کچھ وقت کے لیے پُرسکون ہو جاتا تھا۔ وہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا تھا اور پھر جب کوئی کھٹکا، کوئی پکار یا تصوراتی دُنیا ہی کا کوئی ضمنی واقعہ اُسے چونکا کر حقیقی دُنیا میں پلٹنے پر مجبور کرتا تو وہ کچی نیند اُٹھا دیے جانے والے کی مانند کچھ دیر کھوئے کھوئے ذہن اور اُلجھی نگاہوں سے اپنے ماحول کو سمجھنے کے لیے نظریں دوڑاتا، پھر اُن ہی کرب و بلا بھری حقیقتوں کو اپنے مہیب مُنھ کھولے اپنا منتظر پاتا۔ تب اُس کا دِل چاہتا کہ وہ پھر وہیں لوٹ جائے لیکن وہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی ناکام رہتا۔ دماغ آڑے آتا، اُسے متنبہ کرتا اور اُس کا دھیان مُنھ سے آگ اُگلنے والے سانپ جیسی حقیقت کی طرف دِلاتا۔ اپنی سعی لاحاصل رہنے پر وہ دماغ کی تنبیہ۔ جھلتا اور نجات کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا۔ ناکام ہونے پر جھنجھلا اُٹھتا۔ اضطراب اور تکلیف بڑھ جاتی۔ لیکن اُس کی مسلسل کوششوں سے دھیرے دھیرے کچھ دماغ ہار ماننے لگا اور کچھ وہ اُسے کو ٹچہ دینے لگا۔ وہ دماغ کو قائل اور مائل ہوتے نہ دیکھتا تو خُود ضد چھوڑ دیتا۔ کچھ دیر اُسے آوارہ گردی کرنے دیتا۔ اُسے بیوی کی بیماری، سر پر تینوں جوان بیٹیوں کے بوجھ اور کاروباری مسائل سے خُوب تھکنے دیتا۔ پھر وہ اُسے تھکتے ہوئے دُنیا بدلنے پر راغب کرتا لیکن ساتھ ہی خُود بھی دُنیا بدل لیتا۔ اب وہ پچھلی دُنیا میں نہ جاتا بلکہ ایک نیا جہان تخلیق کرتا۔ بلکہ وہ خُود بھی نیا جہان تخلیق کرنے پر قادر نہیں تھا، اِس کے لیے اُسے محرک کی ضرورت پڑتی۔ محرک کوئی بھی واقعہ، کوئی بات یا کوئی بھی شے ہو سکتی تھی۔ پہلے پہل محض واقعہ ہی محرک بنتا تھا لیکن آہستہ آہستہ معاملہ مختصر ہو کر محض بات اور چیز پر آ گیا۔ دماغ اپنا اڑیل پن مکمل طور پر چھوڑ کر اب اُس کا بھرپُور ساتھ دینے لگا تھا۔ وہ کوئی واقعہ دیکھتا یا سنتا تو اُس کا حصہ بن جاتا، چیز دیکھتا تو اُس کا لاشعور خُود بخُود کہانی بننے لگتا۔ لیکن اب اُسے یہ بھی سمجھ آ رہی تھی کہ یہ حل نہیں مزید خرابی ہے اور زیادہ خرابی کا سبب بن سکتا ہے۔ اِسی لیے اب وہ اِس روگ، اِس جھنجھٹ اور اِس بکھیڑے سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا۔

……

اُس نے چند لقمے ہی لیے ہوں گے کہ ہمیشہ کی طرح نوالوں نے حلق سے نیچے اُترنے سے انکار کر دیا حالاں کہ وہ صبح سے بُھوکا تھا۔ اُس نے کھانا چھوڑ کر چائے مانگی اور پی کر چوٹ لگے کُولہے کو تکلیف سے بچاتے ہوئے بستر پر بائیں کروٹ لیٹ کر دِیوار کو گُھورنے لگا۔ اُس کا ہاتھ چوٹ کے مقام پر پہنچا جہاں ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ وہ سہلانے لگا۔ چوٹ نے اُس کے دماغ سے کچھ جالے جھاڑ دیے تھے۔ آج وہ قدرے بہتر انداز میں معاملات کی تفہیم کر رہا تھا۔ اُس کا کپڑے کا تھوک اور پرچون کا کاروبار تھا جس میں دونوں بیٹے بھی ہاتھ بٹاتے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ کاروبار اُن کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے خُود فارغ ہوتا جا رہا تھا کہ یہ سانحہ ہو گیا۔ اب اُن کے دُنیا سے رخصت ہو جانے اور اُس کے فرار سے کاروبار مکمل طور پر ملازموں کے رحم و کرم پر تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ کاروبار بس چند ماہ ہی اَور چل پائے گا اور ٹھپ ہو جائے گا۔ پھر اُس کی بیوی مناسب علاج معالجہ نہ ملنے پر راہیِ عدم ہو گی، بیٹیاں بِن بیاہی رہ کر خوار ہوتی پھریں گی اور وہ خُود--جس کیفیت سے دوچار

ہے یا جسے اُس نے خُود اپنے اُوپر سوار کر لیا ہے۔۔۔۔ شلوار مُوڑھے پر رکھے، ناک سے رینٹھ اور مُنھ سے رال بہاتا سڑکوں پر پاگلوں کا ہم رکاب ہوگا۔ وہ معاملے کی گمبھیرتا اور وحشت ناکی سے ہول اُٹھا۔ اُس کا بدن کانپنے لگا۔ وہ بُڑبُڑانے لگا۔ ”میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے خُود پر قابو پانا ہوگا: اپنے لیے، اپنی بیوی اور بیٹیوں کے لیے۔ بس آج سے میں اِس قضیے کو ختم کرنے کی کوشش کروں گا بلکہ آج سے ختم۔“

وہ بار بار تہیہ کرتا رہا۔ بس آج سے ختم، بس آج سے ختم کی تکرار کرتے ہوئے مسمریزم کے ماہر کی مانند اپنے آپ کو ہدایات دیتا رہا۔ نیند قریب تک نہ پھٹکی اور رات آنکھوں میں کٹی۔ بہت عرصے کے بعد وہ پہلی رات ہوش وحواس بھری تھی۔

صبح سویرے بستر چھوڑ کر وہ نہایا دھویا اور کام پر جانے کا عندیہ دیا جس سے اُس کی بیوی اور بیٹیوں کے چہرے مسرت سے دمکنے لگے۔ اُن کی کیفیت دیکھ کر اُس کا عزم مزید پختہ ہو گیا۔ اڑوس پڑوس کے دکان داروں نے بھی اُسے مسرور چہروں سے خُوش آمدید کہا اور بہت دیر اُس کے پاس بیٹھے حال احوال دریافت اور اِدھر اُدھر کی باتوں سے اُس کا جی بہلانے کی کوشش کرتے رہے۔ اُسے کہا کہ وہ ہڈیوں کا پنجر بن کر رہ گیا ہے، اپنی صحت کا خیال رکھا کرے۔

”میاں جی، آپ نے یہ خبر سنی؟“ باتوں ہی باتوں میں ایک پڑوسی دکان دار نے پُوچھا۔

”کون سی، میاں؟ بہت دِنوں سے اپنی ہی خبر نہیں۔ کیا ہوا ہے؟“

اُس نے بتایا کہ ایک مسلم ملک میں کئی روز سے خانہ جنگی ہو رہی ہے۔ ”وہاں گئے ہوئے ہمارے بہت سے ہم وطن پھنس کر رہ گئے ہیں۔ یہ خبر سنو۔“ وہ اخبار میں پڑھا ہوا دُہرانے لگا۔ ”ایک عمارت کے تہ خانے میں قید دو جوڑوں، ایک لڑکی اور اُن کی ماں نے ٹیلی فون پر سفارت خانے سے اُنھیں بچانے کی درخواست کی ہے۔ وہ پانچوں خانہ جنگی کے شروع ہوتے ہی اپنی رہائش گاہ کے تہ خانے میں جا چھپے تھے۔ مکان کا زیادہ حصہ بمباری سے تباہ ہو چکا ہے۔ اب اُن کے پاس کھانے پینے کے لیے بھی کچھ نہیں بچا۔ فاقوں مر رہے ہیں۔ اللہ رحم کرے جی اُن پر۔ یہ تو ایک قصہ ہے جی۔ ایسے ہی ہزاروں لوگ پھنسے ہوئے ہیں، کوئی کہیں تو کہیں۔“

وہ کچھ نہیں بولا لیکن اُس کا ذہن تہ خانے میں پھنسے ہوئے پانچوں افراد میں اُلجھ گیا۔ پڑوسی دکان دار اپنی دھن میں باتوں میں لگا رہا لیکن اب اُس کا دھیان اُس کی طرف تھا ہی نہیں۔ اُس کی نگاہوں میں دُودھیا روشنی جھلملانے لگی تھی جیسے سینما ہال میں فلم شروع ہونے سے پہلے سکرین کے پردے پر دُودھیا روشنی نمودار ہوتی ہے اور پھر منظر اُبھرتا ہے۔ اُسے لگا جیسے بالکل ویسے ہی ابھی تہ خانے کا منظر اُبھرے گا اور وہ وہاں موجود ہوگا۔ اِس ادراک کے ساتھ ہی اُس نے اپنے ارادے پر عمل کرتے ہوئے اِس کیفیت کا سر کچلنے کے لیے اپنے آپ سے جنگ چھیڑ دی۔ اُس کے چہرے پر کشمکش کے آثار نمودار ہوئے تو ساتھی دکان دار نے اُسے اُس کی طبیعت کی خرابی سمجھتے ہوئے مشورہ دیا۔ ”میاں جی، ٹیک لگا کر تھوڑا سا آرام کر لو۔ تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔“ اور ایک

ملازم کو آواز دی۔ ’’اے، میاں جی کو پانی پلاؤ اور اِن کا خیال رکھنا۔ زیادہ مسئلہ ہو تو ہمیں بلا لینا۔‘‘

ملازم نے پانی لا کر دیا۔ وہ پینے لگا تو ساتھی دکان دار ایک بار پھر اُسے آرام کرنے اور اپنا خیال رکھنے کا کہہ کر چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد وہ اُٹھا، اُس نے ٹھنڈا پانی لے کر خوب اچھی طرح مُنھ دھویا اور اپنا ذہن بٹانے کے لیے ملازموں کو مختلف ہدایتیں دینے لگا۔ اپنی غیر حاضری کے عرصے کے کھاتے لیے اور اُن کی جانچ پڑتال میں جُت گیا اور ساتھ ہی آنے جانے والے گاہکوں اور لین دین پر بھی نظر رکھنے کی کوشش کرنے لگا تا کہ دماغ کئی اطراف مصروف رہے اور اُسے اُس طرف جانے کا موقع ہی نہ ملے جس طرف وہ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنی اِن مصروفیات سے وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے میں کامیاب رہا۔ وہ خُوش تھا کہ اگر یُوں ہی کوشش کرتا رہا تو یقیناً بہت جلد اِس روگ سے چھٹکارا پانے میں کامیاب رہے گا۔

دِن نہایت اچھا اور بے حد مصروف گُزرا۔ کھاتوں کی جانچ پڑتال سے ذہنی تھکن اور گزشتہ بہت سی راتوں کی نیم خوابیوں کی تکان نے اُسے گہری نیند عطا کی۔ بادشاہ کو تختۂ دار پر کھڑا کرنے کے بعد پھندا گلے میں ڈالا جا چکا تھا۔ لوگ بادشاہ کے پیروں کے نیچے سے تختے کے کھینچے جانے کے منتظر تھے۔ اُن کی نگاہیں جلاد کے رسّی کو جھٹکا دینے والے ہاتھوں پر جمی تھیں کہ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے دوبارہ سونے کی بہت کوشش کی اور بے شمار کروٹیں بدلیں لیکن نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دُور رہی۔ اُس کے ذہن میں دِن بھر کے خیال آنے لگے کہ اچانک ہی اُسے دیارِ غیر میں تہ خانے میں مقید وہ پانچ لوگ یاد آ گئے۔ اُس کی سوچوں کا رُخ بے اختیار اُن کی طرف مڑ گیا۔ نقب لگنے لگی۔ چپکے سے سیندھ لگا کر کاری وار کیا گیا۔ حملہ اچانک اور اِس قدر شدید تھا کہ وہ سنبھل نہیں سکا۔ اُس کا دھیان اپنے آپ سے کیے ہوئے عہد کی طرف گیا ہی نہیں۔ پانچ افراد: دو لڑکے، تین لڑکیاں اور ایک عورت ......اور چھٹا وہ خُود۔ سارا خاندان ایک ہی چھت تلے جمع تھا۔

’’دبک جاؤ۔‘‘ اُس نے تہ خانے کی چھت پر زوردار دھماکے اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنتے ہوئے اُنھیں ہدایت کی۔

’’پاپا، ہم کب تک دبکے رہیں گے؟‘‘ اُس کے چھوٹے بیٹے نے سوال کیا۔ اُس کی آواز میں پژمردگی اور نقاہت کئی دِنوں کے فاقوں کا نتیجہ اور بے بسی و بے کسی کا مظہر تھی۔

’’ہاں پاپا، آخر ہم کب تک قید رہیں گے؟‘‘ بڑے بیٹے نے اُس کے جواب دینے سے پہلے ہی چھوٹے کے سوال کو مُردہ لہجے میں دہرا دیا۔

اُس نے نظریں گھما کر اپنے ساتھ مُردوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے دونوں بیٹوں، تینوں بیٹیوں اور بیوی کی طرف دیکھا۔ اُسی کی طرف اُٹھی ہوئی اُن سب کی نظریں استفہامی تھیں۔ وہ خُود نہیں جانتا تھا، جواب کیا دیتا۔ اُس نے بے بسی کندھے اُچکائے لیکن وہ ذرا بھی نہیں ہلے۔ اُن میں اب اتنی جان بھی نہیں بچی تھی کہ وہ اپنے جسم کو بھی تھوڑا بہت ہلا سکتے۔ صرف اُن کی زبان اور آنکھیں کچھ حرکت کر سکتی تھیں۔ چہرے

پیلے پڑ گئے تھے اور اُن پر فاقہ زدگی نے خزاں کے پُرمُر پتوں جیسی جھریاں ڈال دی تھیں۔ جبڑے بھنچنے سے مُنھ لمبوترے ہو گئے تھے اور جلد پر یُوں سلوٹیں پڑ گئی تھیں جیسے وہ اپنی عمروں سے بہت آگے نکل کر خاصے ضعیف العمر ہو گئے ہوں۔ ہونٹ نیلے ہو گئے تھے جیسے اُنھوں نے اُن پر نیل مل رکھا ہو۔ بولتے تو لب بس تھرتھراتے اور آواز اتنی کم زور ہوتی کہ بمشکل سنائی دیتی لیکن حیرت انگیز طور پر اُن کی سماعتیں نہایت تیز ہو چکی تھیں۔

‘‘پاپا، بہت بُھوک لگی ہے۔’’ سب سے چھوٹی بیٹی بولی۔ ‘‘دیکھو، میرا پیٹ کمر کے ساتھ لگ کر کمر بن گیا ہے۔’’ اُس نے مُن مُن کی۔

‘‘اب تو پیٹ میں ڈالنے کے لیے پانی بھی نہیں بچا۔’’ منجھلی نے کہا۔

اُس نے بڑی بیٹی اور بیوی کی سمت دیکھا۔ ان کی نظریں کہہ رہی تھیں کہ تم نے بھی جو کہنا ہے کہہ دو۔ بیٹی تو چُپ رہی البتہ بیوی بول اُٹھی۔ ‘‘ہم سے برداشت نہیں ہو رہا تو بچے کیسے برداشت کریں؟’’

‘‘ہونہہ، میں باہر جاتا ہوں۔ شاید کچھ مل جائے۔’’ اُس نے کہنے کو تو کہہ دیا جب کہ وہ جانتا تھا کہ اب اُس میں زندگی بھر یہاں سے ہلنے تک کی طاقت نہیں تھی۔

‘‘نہیں، نہیں۔’’ وہ سبھی دہشت ناک لہجے میں چلّائے لیکن اُن کا چلّانا بھی یُوں تھا جیسے اُنھوں نے نہایت دِھیمی آواز میں محض چُوں چُوں کی ہو۔

‘‘مرنا تو یُوں بھی ہے۔’’ وہ مایوسی سے بولا۔

‘‘نہیں، ہم اکٹھے مریں گے: ایک دُوسرے کے پاس، ایک دُوسرے کے سامنے۔’’ اُس کی بیوی نے حتمی لہجے میں کہا۔

‘‘لیکن ہم یُوں کب تک قید رہ سکتے ہیں؟’’ بڑی بیٹی پہلی بار بولی۔

‘‘شاید ہمیشہ۔’’ اُس نے کبھی نہ کھولنے کے ارادے سے آنکھیں بند کرتے ہوئے گویا بات ختم کی۔

‘‘لگتا بھی تو یہی ہے کہ ہمیشہ سے قید ہیں اور ہمیشہ ہی رہیں گے۔’’

☆☆☆☆

جانِ عالم

وارث

"آؤ آؤ-----!!

"وقت بڑا ظالم ہے----
اس کے وار سے بچنے کے لیے ستاروں کی چال سے باخبر ہونا ضروری ہے۔ "

ادھیڑ عمر پروفیسر نے اپنی عینک کے موٹے شیشوں سے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پروفیسر!! میں نے آج پھر ایک نوکری کے لئے انٹرویو دینا ہے۔ "

پروفیسر نے ایک بڑے سے فریم میں زائچے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے نوجوان کی طرف دیکھا اور پھر کاغذ پر کچھ ہندسے اور لکیریں کھینچنے لگا۔

"نئے سال کے آغاز سے چودہ فروری تک مشتری بارھویں گھر میں رہے گا----
پچھلے چند برسوں سے اہلِ حمل زحل کی ساڑھ ستی سے گزر رہے ہیں۔ دو مارچ کو زحل برج ثور میں داخل ہوگا۔ حمل سے زحل کا انخلا خوش بختی کی بنیاد ثابت ہوگا۔ مگر خانۂ مال میں زحل کے داخل ہو جانے سے ابھی مالی بحران مزید بڑھ جائے گا۔ مالی لحاظ سے ابھی زحل کی نحوست برقرار رہے گی۔ اس لئے تمام مالی منصوبے غیر ضروری اور غیر متوقع تاخیر اور ناکامی سے دوچار ہوں گے----
یہ نوکری بھی تمہارے لئے سعد نہیں ثابت ہو سکتی۔ "

"لیکن پروفیسر میں نے پچھلی چار نوکریاں تمہارے کہنے پر چھوڑ دیں۔ اور----اور----!!"

"اگر تم کرتے تو بڑے امتحانوں میں مبتلا ہو جاتے۔ تم نے ستاروں کے مطابق فیصلہ کر کے اچھا کیا ہے۔ "

"پروفیسر! تم دوسروں کے بارے میں اتنا کچھ جان لیتے ہو، کیا اپنا حساب بھی کرتے ہو؟"

"نہیں میں نے اپنا حساب کبھی نہیں کیا۔ میں نے انسانیت کی خدمت میں اپنے بارے میں نہیں سوچا----!!"

’’اسی لئے تمہارے چہرے پہ ہر وقت ایک مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے۔ تمہاری لاعلمی نے تمہیں خوش رکھا ہے۔‘‘

’’ہاں، تم کچھ بھی سوچ سکتے ہو۔ دوسروں کی فکر کرنے والوں کو خود سے بے نیاز ہونا پڑتا ہے۔‘‘

’’اسی لیے میں نے تمہیں کبھی پریشان نہیں دیکھا۔ تمہارے چہرے پر ایک مسکان ہمیشہ رقص کرتی رہتی ہے۔ اور تم ہم جیسے پریشان حالوں کو بڑے اطمینان سے ہمارے ستاروں کی چالیں بتاتے رہتے ہو۔ تمہارے بچے کتنے ہیں پروفیسر؟‘‘ نوجوان نے آج پہلی بار پروفیسر کی نجی زندگی کے بارے میں سوال کیا۔

’’میں نے شادی نہیں کی۔ ماں باپ میرے بچپن میں ہی مر گئے تھے۔ بس۔ یہی میرا گھر ہے۔!!‘‘

’’تمہارا کوئی وارث نہیں ہے؟ تمہاری شادی نہیں ہوئی، ماں باپ نہیں ہیں۔ اور تم مطمئن ہو؟

اس لیے کہ تم اپنے ستاروں کی چال نہیں جانتے۔ جاننا ہی نہیں چاہتے؟‘‘ نوجوان کے چہرے سے حیرت اچانک اُڑی اور عجیب سا سکون آ کر بیٹھ گیا۔ ایک مسکان اُس کے چہرے پر دوڑنے لگی۔

’’پروفیسر! تم خوش قسمت ہو۔ تمہیں یہ نہیں پتہ کہ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے۔ اسی لیے تمہیں آنے والے وقت کا خوف ہی نہیں۔ مجھے اب سمجھ آ گئی ہے۔ اپنے ستاروں کی چال کا جاننا ضروری نہیں ہوتا۔‘‘

نوجوان نے اچانک زائچے والی بڑی فریم اٹھائی اور اُسے پوری قوت سے پروفیسر کے سر پر مار دی۔ خون کا فوارہ چھوٹا۔ پروفیسر کا سر ایک طرف لڑھک گیا۔

……

’’آؤ آؤ۔!!‘‘

وقت بڑا ظالم ہے۔

اس کے وار سے بچنے کے لیے ستاروں کی چال سے باخبر رہنا ضروری ہے۔‘‘

نوجوان نے آنے والے شخص کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے زائچے والی بڑی فریم میں زحل کے خانے کو دیکھا۔

اس کے چہرے پر فکرمندی کے تاثرات ابھرنے لگے۔

☆☆☆☆

کرن شفقت

فیصلہ

سوجھلا کے لیے یہ رات برزخ کی رات سے کم نہیں تھی۔ وہ امید وبیم کے جھٹپٹے میں اپنا دم گھٹتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ قبولیت وناقبولیت کی سولی پر لٹکی سوجھلا کا دل کان بنا ہر آہٹ پر اس کے سجے سنورے بدن پر کپکپاہٹ پیدا کر رہا تھا۔ حجلۂ عروسی میں بیٹھی سوجھلا نئی نویلی دلہنوں کی طرح زندگی کے نئے خوابوں سے ہم آہنگ ہونے کی بجائے اندیشوں، وسوسوں، ناامیدیوں اور مایوسیوں کی تعبیروں میں جکڑی ہر آنے والے لمحے سے خوفزدہ تھی، بسترِ عروسی پر بچھی سرخ گلابوں کی خوشبو اور ملائمت سے اس کی سانسیں اور جسم اس طرح ناآشنا تھا جیسا کہ جانتا ہی نہیں، کمرے میں سجی مصنوعی پھولوں کی جھالریں، کمرے کی مدھم روشنی سے چمکتے چاند ستارے اس کے سرخ لباس پر ٹانکے ہوئے موتیوں کی چکا چوند اس کی سرخ وسفید مہندی سے بھری ہوئی کلائیوں میں چمکتی چوڑیوں کی کھنک، یہ سب کا سب سوجھلا کیلئے صرف اذیت کا سامان تھا۔ اس کے دل ودماغ پر صرف خوف کا راج تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کاش یہ سب ایک خواب کی طرح ہو اور کسی طرح اس کی آنکھ کھل جائے اور وہ اس خواب کی قید سے رہا ہو جائے، پھولوں اور خوابوں سے سجی مسہری پر بیٹھی سوجھلا اُس کا انتظار کر رہی تھی جو اس کے خوابوں کا شہزادہ تھا جس کو اس نے لمحہ لمحہ سوچا تھا، چاہا تھا، پوجا تھا، جس کو پا لینا اس کی مناجاتوں، دعاؤں اور اشکوں کا اجر تھا۔

آج سوجھلا نے اس کو پا لیا تھا جس کے حصول کا خواب بھی دیکھنے سے پہلے اُسے نیند میں بھی اِدھر اُدھر دیکھنا پڑتا تھا کہ کسی کو پتہ نہ چل جائے کہ وہ تابش کا خواب دیکھ رہی ہے۔ تابش کا بھائی سرمد اس کے بھائی ساحر کا دوست تھا۔ اس نے تابش کو پہلی بار ایک شادی کی تقریب میں دیکھا تھا اور سوجھلا پر تابش کی ایک طائرانہ نظر ہی سوجھلا کے دل کو اتھل پتھل کر گئی تھی۔ سوجھلا نے پہلی بار اپنے دل کو دھڑکتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ محبت تابش کی نظر بن کر سوجھلا کے تن من کو سیراب کر گئی تھی اور سوجھلا نے قطرہ قطرہ خود کو بھیگا ہوا محسوس کیا تھا۔ سوجھلا کے جسم سے پانی کی طرح بہنے والا پسینہ اسے تابش کی محبت کی بارش لگ رہا تھا۔ وہ خود کو بار بار کن اکھیوں سے تابش کو دیکھنے پر مجبور پا رہی تھی۔ اس دن کے بعد تابش اس کے خوابوں، خیالوں، دعاؤں، مناجاتوں اور آنسوؤں کا مرکز ومحور بن گیا تھا۔ خاموش اور یکطرفہ محبت سوجھلا کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ تابش پر اس کے حسن کی اوس گری ہے یا نہیں؟ لیکن وہ خود مسلسل محبت کے اس دریا میں

ڈوب رہی تھی، اُبھر رہی تھی ۔ سوجھلا دل ہی دل میں تابش کو اپنی تمناؤں آرزوؤں اور امیدوں کا مرکز مان چکی تھی ۔ تابش کے معاملے میں وہ خود ہی اپنی رازدار تھی، خود ہی تابش کی باتیں کرتی اور خود ہی سنتی، اسے معلوم تھا کہ قبائلی رسم و رواج کے مطابق اس کی شادی کسی بھی صورت تابش سے ممکن نہیں، لیکن دل ازل سے رسموں رواجوں، عقیدوں، قبیلوں اور چھوٹے بڑے کی تقسیم کا کافر، مسلسل تابش ہی کی تمنا کیے جا رہا تھا، اس نے کئی بار اپنے آپ سے لڑائی کی، جھگڑا کیا، خود کو سمجھایا لیکن تابش کی ایک نظر کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا اور وہ محبت کی اس دلدل میں آنکھوں تک دھنس گئی وہ چاندنی راتوں میں چاند کو تابش کی شبیہ سمجھ کر اس سے اپنی محبت کا اظہار کرتی ۔ ہواؤں کے ہاتھ تابش کو محبت کے پیغام بھیجتی، ستاروں سے تابش کی آنکھوں کا حال پوچھتی، پرندوں کے ساتھ تابش کے گھر کی طرف پرواز کرتی اور گھر کی چھت اور منڈیروں پر بیٹھ کر تابش کو ایک نظر دیکھنے کی کوشش کرتی، کبھی اسے گھر کے صحن میں ٹہلتا تابش نظر آجاتا اور اس کی آنکھیں سجدہ ریز ہو جاتیں اور اگر تابش نظر نہ آتا تو کچھ آنسو نشانی کے طور پر تابش کے گھر کی منڈیر پر رکھ کر واپس آجاتی ۔

آج وہ اسی تابش کی دلہن بنی حجلۂ عروسی میں اس کی منتظر تھی، لیکن یہ انتظار اس کے گلے کی پھانس بنا ہوا تھا، وہ انتظار کی اس زنجیر کو توڑ کر حجلۂ عروسی سے بھاگ جانا چاہتی تھی ۔ وہ تابش کی نفرت انگیز نظروں کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی لرز لرز جا رہی تھی، اس کا یہ گمان یقین کا سانپ بن کر اس کی روح اور جسم کو ڈسے جا رہا تھا کہ تابش اسے مسترد کر دے گا، وہ اپنے خوابوں خیالوں اور دعاؤں کے مرکز سے رد ہو جانے کے خیال سے مری جا رہی تھی، اگر تابش نے اسے قبول نہ کیا تو وہ کیسے جی پائے گی؟ یہ سوال سوجھلا کو ریزہ ریزہ کر رہا تھا ۔ رات کا ایک ایک لمحہ صدیوں سے زیادہ طویل تھا وہ اپنی ہی چوڑی کی کھنک، اپنی ہی سانسوں کی سرسراہٹ اور اپنے ہی جسم کی لرزش سے خوف کھا رہی تھی ۔ اسے یہ سب کبھی دروازہ کھلنے کی چرچراہٹ اور کبھی تابش کے قدموں کی آہٹ لگتا اور وہ سہم جاتی، دعاؤں کی مقبولیت کا یہ انداز تو سوجھلا کے تصور میں بھی نہیں تھا ۔ وہ اپنے خالق و مالک سے شکوہ سنج تھی "مالک! میں نے تابش اس طرح تو نہیں مانگا تھا" لیکن کاتب تقدیر لکھ چکا تھا اور اس کا لکھا ہو بھی چکا تھا وہ اپنے محبوب کے گھر بیوی کی حیثیت سے آچکی تھی لیکن یہ بیوی تابش کے بھائی کے قاتل کی بہن تھی ۔ سوجھلا کے باپ نے اپنے بیٹے ساحر کو سزائے موت سے بچانے کیلئے اُسے تابش کے بھائی سرمد کے قتل کے عوض بدلے میں دیا تھا ۔ جرگہ کے فیصلے کے مطابق طے ہوا تھا کہ اگر خمیسو خان اپنے بیٹے ساحر کو سزائے موت سے بچانا چاہتا ہے تو اسے مقتول کے خاندان کو بیس لاکھ روپے نقد اور بیٹی کا رشتہ دینا ہوگا ۔ قبائلی رسم و رواج کے پابند خمیسو خان کے نزدیک بیس لاکھ روپیہ اور بیٹی، بیٹے کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے تھے ۔ وہ ہر صورت اپنے بیٹے کو بچانا چاہتا تھا، ساحر جس نے معمولی سے جھگڑے پر اپنے دوست سرمد کو دن دہاڑے سرِ بازار قتل کر دیا تھا اب پولیس کی حراست میں تھا اور پولیس جرگے کے فیصلے کی منتظر تھی ۔ جرگے کا فیصلہ سن کر خمیسو خان نے فوراً حامی بھر لی تھی ۔ سوجھلا کو جب فیصلے کا پتہ چلا وہ اسی وقت سے حیران و پریشان اس

سوچ میں گم تھی کہ اگر وہ خواب میں بھی تابش کے ساتھ شادی کی بات کر دیتی تو اس کا باپ اسے کاری کر کے مار دیتا۔ اس کی زبان کاٹ دیتا، لیکن بیٹے کو بچانے کیلئے خمیسو خان نے بیٹی اس طرح مقتول کے قبیلے والوں کو دے دی جیسے وہ بھیڑ بکری یا بھینس ہو۔ پورے گھر میں حتیٰ کہ اس کی ماں تک نے ایک لمحے کیلئے بھی سوجھلا کی محسوسات، جذبات اور پسند و ناپسند کا خیال نہیں کیا تھا۔ آج ان کا بیٹا دنیا کی ہر چیز سے قیمتی ہو گیا تھا اور سوجھلا بھی ایک ''چیز'' ہی تو تھی۔ اس نے خاموشی سے سر جھکا کر باپ کے فیصلے کا پھندا اپنے گلے میں ڈال لیا تھا۔ ایک بے بس مجبور اور محکوم لڑکی اور کر بھی کیا سکتی تھی؟ وہ تابش کو دل و جان سے چاہتی تھی اس کو پانا اس کا واحد خواب تھا لیکن تعبیر کی یہ شکل تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی اسے پورا یقین تھا کہ تابش اور اس کے گھر والے اُسے وہ محبت اور توجہ نہیں دیں گے جو ایک بہو یا بیوی کا حق ہوتی ہے۔ انھیں اس کی شکل میں ان کے بیٹے کا قاتل نظر آئے گا اور وہ اسے قبول نہیں کریں گے۔

حجلۂ عروسی میں بیٹھی سوجھلا نے باپ کے گھر کی دہلیز سے تابش کے گھر کی چوکھٹ تک کا سفر جس طرح طے کیا تھا اس سے اس کا شک یقین میں بدل چکا تھا، کیونکہ تابش کے گھر والوں نے شادی کی تمام رسمیں بہت ہی سرسری انداز میں ادا کی تھیں، سوجھلا کے ماں باپ نے تو اسے ایسے گھر سے نکالا تھا جیسے وہ ان کے بیٹے کیلئے پیغامِ اجل ہے۔ وہ گھر سے نکلے گی تو بیٹا گھر میں آئے گا۔ دوسری طرف تابش کے گھر والوں کیلئے بھی سوجھلا کوئی تحفہ نہیں تھی۔ اپنے بیٹے کی جان کا عوض تھی، خون کا بدلہ تھی، قتل کا انتقام تھی۔ وہ اسے چاہتوں، محبتوں، شفقتوں اور خوشیوں کی چھاؤں میں اپنے گھر کیسے لاتے۔

چنانچہ سوجھلا بدلے اور انتقام کی دھوپ سے جھلسا بدن اور خوف و دہشت سے بھری روح لیکر تابش کے گھر آ گئی تھی اور اب سہاگ کی سیج پر بیٹھی وہ اپنے مستقبل کے فیصلے کی منتظر تھی۔ محبت و نفرت کی اس عدالت میں اس کا وکیل صرف اس کا دل تھا لیکن اس عدالت کا منصف اس کا محبوب تابش، اس کے جذبات، اس کی ریاضت، اس کی عبادت، اس کی محبت اور اس کے رتجگوں سے مکمل طور پر ناواقف بھی تھا اور دل کی زبان سے ناآشنا بھی۔ سوجھلا کو یقین تھا کہ وہ محبت کا مقدمہ ہار جائے گی اور اس کا محبوب منصف اس کے خلاف ہی فیصلہ سنائے گا۔ آخر دروازے کی ہلکی سی چرچراہٹ نے عدالت لگنے اور منصف کی آمد کا اعلان کیا اور سوجھلا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ چند لمحوں کے سکوت کے بعد ایک آواز سوجھلا کی سماعت میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح اتری لفظوں کے پتھر اس کے جسم سے ٹکرائے اور وہ لہولہان ہو گئی۔

''تم میرے بھائی کا بدلہ ہو، اس ظالم کی بہن ہو جس کے ہاتھ میرے بھائی کے خون میں رنگے ہیں، اس لیے کبھی اس بات کا خیال بھی دل میں نہ لانا کہ میرے دل میں بیوی کے طور پر تمہارا کوئی مقام یا بہو کے طور پر گھر میں کوئی جگہ بن سکے گی۔ میں اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ تم سے نفرت کر کے لوں گا اور یہ نفرت دن بدن بڑھے گی، میرے گھر میں نہ تمہیں زندہ رکھا جائے گا نہ مردہ۔ میرے لیے تم ایک بیکاری چیز ہو جس کی مجھے کبھی

بھی ضرورت نہیں پڑے گی"۔

بند آنکھوں سے اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ سن کر سوجھلا کے دل سے ایک چیخ نکلی اور زور سے بند ہوئے دروازے کی آواز میں ضم ہو گئی۔ سوجھلا کی قسمت کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور اشکوں کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ آغاز کر چکا تھا، نجانے کب سہاگ کی سیج قبر میں ڈھلی، کب اس کا سرخ جوڑا کفن میں تبدیل ہوا، اور کب اس کا جسم بے جان ہو کر گر گیا، اسے کچھ پتہ نہیں چلا۔

اگلے دن اسے ہوش تب آیا، جب گھر کی ایک ملازمہ نے اسے ناشتے کیلئے جگایا، دکھوں، محرومیوں، ناآسودگیوں اور آنسوؤں کے ساتھ سہاگ رات گزارنے والی سوجھلا اگلے دن ایک لاش کی طرح اُٹھی۔ سیج پر بن کھلے مرجھائے پھولوں کو اپنے مہندی رنگے ہاتھوں سے ملنے لگی، وہ شاید اس انتظار میں تھی کہ ابھی اس کی ساس آئے گی، نندیں آئیں گی، اس کی بلائیں لیں گی، اس کے صدقے واری جائیں گی، لیکن نہ ایسا کچھ ہونا تھا نہ ہوا۔ وہ دکھوں کی تھکن سے چور اٹھی اور باتھ روم میں چلی گئی۔ باہر نکلی تو ایسے لگ رہی تھی کہ جیسے ابھی ابھی بیوہ ہوئی ہو اس کے پورے جسم پر سوائے مہندی کے پھیکے پڑتے رنگ کے اور کوئی نشانی ایسی نہیں تھی جو اس کے سہاگن ہونے کی علامت بن پاتی، کمرے سے نکلی تو ساس نے ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی اور منہ پھیر لیا۔

گھر کے دیگر افراد اس سے ایسے لاتعلق تھے جیسے کہ جانتے ہی نہیں تھے۔ سوجھلا سسرال والوں کے اس رویے سے مزید دل برداشتہ ہو رہی تھی کوئی اس کے غم بانٹنے والا اس کے پاس بیٹھنے والا اس سے بات کرنے والا، اس کو گلے لگا کر اسے دو بول تسلی کے کہنے والا تھا ہی نہیں، وہ خود ہی غم تھی، خود ہی غمگسار، خود ہی دل تھی اور خود ہی دلدار، خود ہی آنسو تھی اور خود ہی دامن۔ ریزہ ریزہ سوجھلا اپنی کرچیوں پر خود ہی چلتی اور زخمی ہوتی رہی۔ ماں باپ اس کو کچھ تو اس لیے بھول چکے تھے کہ انہیں بھائی کی زندگی بچ جانے کی خوشی سے ہی فرصت نہیں تھی۔ دوسرے جرگے کے فیصلے کے مطابق وہ اپنی بیٹی سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھنے کے بھی پابند تھے۔ پابندیوں اور رسموں کی زنجیروں میں جکڑی سوجھلا کو زندگی میں کوئی سکھی سہیلی بنانے کی اجازت بھی نہیں ملی تھی۔ کس سے کہتی کس کو بتاتی کہ وہ کتنی اکیلی ہے، کتنی تنہا ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کو گواہ بنا کر اس کا شریکِ زندگی بننے والا تابش جس کے خواب کبھی اس کی راتوں کا اجالا تھے بھیانک تعبیر میں ڈھل چکے تھے۔ سوجھلا جو تابش کے خیالوں میں پرندوں کی اُڑانوں میں شریک تھی، تھک کر ٹوٹے ہوئے پروں کے ساتھ کسی کیکر پر گر چکی تھی۔ تابش جو کبھی اس کی آنکھوں کی چمک تھا، اب سیاہ بادلوں کا روپ اختیار کر چکا تھا۔ بھرے پڑے گھر میں سوجھلا کی تنہائی بانٹنے والا کوئی نہ تھا، بس کھانے کے وقت کھانا اس کے کمرے میں پہنچا دیا جاتا۔ کھانا لانے والی ملازمہ کو بھی اس سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

سوجھلا اپنے آپ کو مصروف رکھنے کیلئے کبھی خود ہی اپنے کپڑے بکھیر دیتی اور پھر خود ہی ان کو سمیٹنے لگتی اس

کی محرومیوں اور نا آسودگیوں کا واحد گواہ اس کا بستر اپنی تمام تر ویرانیوں کے ساتھ اس کا مونس و رفیق تھا اور یا وہ کمرہ جس میں سجی سنوری دلہن سوجھلا کو دفن کر دیا گیا تھا اس کی تنہائیوں کا رازدار تھا۔

دن مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلتے جا رہے تھے لیکن سوجھلا کا وقت ٹھہر چکا تھا اس میں کسی قسم کے بدلاؤ کے کوئی آثار نہیں تھے پھر ایک دن آسمانوں کے خدا کو اس بھولی بسری سوجھلا کا خیال آ گیا اور سوجھلا کو کمرے کی الماری سیٹ کرتے ہوئے ایک پرانا سا موبائل فون مل گیا۔ سوجھلا نے موبائل فون کو دیکھا، آن کیا تو وہ آن ہو گیا اس کے نمبرز وقت کی دست برد کے ہاتھوں اپنا وجود تقریباً اپنا وجود تقریباً کھو چکے تھے لیکن اس کی سکرین کی روشنی اس کے زندہ ہونے کا اعلان کر رہی تھی اچانک سوجھلا کو ایک خیال آیا اور اس نے کھانا لانے والی ملازمہ کو اعتماد میں لیا اور اس کو کچھ روپے دیکر آمادہ کر لیا کہ وہ ایک خاموشی اور رازداری سے ایک سم لا دے۔ ملازمہ جو اس کی تنہائی کے دکھوں سے آشنا بھی تھی اور اس کے لیے رحم کے جذبات بھی رکھتی تھی۔ چند روپوں کے عوض اسے سم لا کر دینے کا “رسک” لینے پر تیار ہو گئی۔ سوجھلا کو سم ملی تو اس نے موبائل آن کیا۔ سوجھلا کو ایک خیال سوجھا اور اس نے موبائل کی فون سکرین پر چمکنے والا پہلا نمبر ملا دیا، دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر سوجھلا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اسے ایسے لگا کہ جیسے کہ اس کا دل سینہ توڑ کر باہر آ جائے گا۔

پگھلے ہوئے سیسے کی طرح کان میں پڑنے والی آواز کو بھلا سوجھلا کیسے بھول سکتی تھی، دوسری طرف وہی آواز اس سے دوبارہ مخاطب تھی۔ سوجھلا کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے، ہیلو کے جواب میں اسے اور تو نہ سوجھا اس نے فوری کسی فرضی لڑکی کا نام لے دیا جواب میں کہا گیا “سوری رانگ نمبر” اور فون بے جان ہو گیا۔ سوجھلا کا شادی کے بعد یہ پہلا مکالمہ تھا جو کسی سے کیا گیا تھا اور وہ کسی کوئی اور نہ تھا اس کا سب سے زیادہ اپنا اور سب سے زیادہ غیر، تابش تھا۔ سوجھلا کو اس موبائل میں اپنے جینے کا ایک جواز نظر آیا دوسرے دن اس نے بڑے تحمل، حوصلے اور ہمت کے ساتھ وہی نمبر دوبارہ ڈائل کیا۔ دوسری طرف پھر وہی آواز۔ سوجھلا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اسی فرضی لڑکی کا نام دوبارہ لیا تو دوسری طرف سے کہا گیا “محترمہ یہ غلط نمبر ہے کل بھی آپ نے یہ نمبر ملایا تھا”۔ جواب میں سوجھلا نے بات کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا اور کہا، جی! “وہ میری سہیلی ہے، اس نے مجھے یہی نمبر دیا تھا خیر کوئی بات نہیں، سوری میں نے آپ کو پریشان کیا”۔ جواب میں Never Mind کہا گیا تو سوجھلا نے تھوڑی سی اور ہمت کی اور خود کلامی کے انداز میں کہا کہ “اب میں کیسے اس سے رابطہ کروں۔ پلیز آپ میری کوئی مدد کر سکتے ہیں؟ دوسری طرف سے استفسار پر سوجھلا نے کہا کہ مجھے اس سے بہت ضروری کام ہے۔ کسی طرح اس کا صحیح نمبر مل جائے تو میرا مسئلہ حل ہو جائے گا”۔ جواب میں ایک حرفِ تسلی، “محترمہ! میں کوشش کرتا ہوں’ ’ اور فون ایک بار پھر بے جان ہو گیا۔ سوجھلا دراصل بات کو طول دینا چاہ رہی تھی اور اس کی یہ کوشش کامیاب بھی ہو رہی تھی، سوجھلا کو رابطے کے تسلسل کی امید بندھ گئی تھی۔ اگلے دن پھر دونوں طرف رابطہ ہونے پر سوجھلا نے اسے کہا کہ میں ہر وقت آپ سے بات نہیں کر پاؤں گی، جواب میں اُس

سے خود رابطہ کرنے کی درخواست کی گئی جسے تھوڑے سے تامل کے ساتھ سوجھلا نے قبول کر لیا اور اسے ایک مخصوص وقت پر رابطہ کرنے کا کہہ دیا۔

سوجھلا کی ویران زندگی میں بہار کی طرف ایک کھڑکی کھلی تھی اور جسے وہ بہر حال کھلا رکھنا چاہتی تھی اس کا خیال تھا کہ تابش سے جو محبت وہ بطور بیوی حاصل نہیں کر سکی ایک دوست کی حیثیت سے حاصل کر لے گی۔ فون پر گفتگو کا سلسلہ دراز ہو رہا تھا، تابش کی گفتگو میں پہلے دلچسپی، پھر اشتیاق، پھر امید اور پھر یقین کا عنصر غالب آنے لگا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا جب تابش نے کھل کر اس سے اظہارِ محبت کر دیا۔ اس دن سوجھلا نے خود کو پہلی بار زندہ محسوس کیا، اسے لگا کہ اس نے اپنے محبوب کو پا لیا ہے وہ تابش کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اس دن اس نے اپنے انگ انگ سے خوشی پھوٹتی محسوس کی اور اس خوشی کو اس کے کمرے میں رکھی ایک ایک چیز نے واضح طور پر محسوس کیا تھا۔

وہ گھنٹوں اپنے محبوب سے باتیں کرتی اسے پانے کے خواب دیکھتی، تابش کے ساتھ مل کر اس نے کئی نئے خواب بُنے۔ محبت و سرخوشی کے کئی پھول چُنے، تابش کی وارفتگی و محبت ضبط کے تمام بندھن توڑنے کی کوشش میں مصروف تھی لیکن سوجھلا بڑی احتیاط اور سمجھداری سے بات کو آگے بڑھا رہی تھی۔ اسے خوف تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی اس کے خوابوں کے گھروندے کو ملیا میٹ کر سکتی ہے اور اس کے ہاتھوں میں ایک بار پھر خالی ہاتھوں میں ریت کے سوا کچھ نہیں بچے گا۔ اس نے شوہر تابش کو کھو کر محبوب تابش پایا تھا جسے وہ کسی بھی صورت کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی زندگی کے بے رنگ آسمان پر محبت کے رنگوں سے مزین جو قوسِ قزح بکھری تھی وہ اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ اس کی بے خواب آنکھوں میں ایک بار پھر خوابوں نے بسیرا کر لیا تھا، پرندے ایک بار پھر اس کے ہم پرواز بن چکے تھے۔ محبت کی بارش نے ایک بار پھر اس کے آنگن کو منتخب کر لیا تھا۔ زندگی نے ایک بار پھر اس کے دروازے پر دستک دے دی تھی۔ اس کی گنگ زبان ایک بار پھر لفظ آشنا ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں نے ایک بار پھر مسکراہٹ کو کھلنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ تنہائی کی قبر سے نکل کر زندوں کی دنیا میں آنے کے لیے پَر تول رہی تھی۔ ظاہری طور پر دوزخ میں زندہ سوجھلا کے خیالوں میں ایک جنت آباد ہو چکی تھی، جس کی وجہ سے اس کی ظاہری زندگی کے عذاب کم پڑنے لگے تھے۔ دوسری طرف وہ تابش میں ایک واضح تبدیلی محسوس کر رہی تھی اب اُکھڑا اُکھڑا اور چڑا ہوا تابش جب گھر آتا تو اس کے چہرے پر ایک بے نام سی مسکراہٹ کھل رہی ہوتی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک، اس کے دل کی مخبری ہوتی۔ اسے کھلا کھلا اور مسکراتا تابش دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی اور وہ اپنے آپ کو فاتح تصور کرتی۔ رسم و رواجوں اور سماجی پابندیوں کی گھٹن میں محبت نے ایک چور دروازہ تلاش کر لیا تھا، جہاں سے آنے والی تازہ ہوا دونوں کی زندگی کو حیات آمیز پیغام دے رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گم قدم قدم آگے بڑھ رہے تھے، تابش کی محبت کو پا کر سوجھلا اپنے آپ کو طاقتور، مضبوط اور حوصلہ مند محسوس کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ تابش کا ساتھ

اسے دنیا کی کسی بھی طاقت سے ٹکرا جانے کا حوصلہ دے رہا ہے اور پھر ایک دن اچانک گھر میں زلزلہ آ گیا اور سوجھلا کے خوابوں کا محل ایک بار پھر دراڑوں سے بھر گیا۔ سوجھلا خزاں رسیدہ پتے کی طرح تیز ہواؤں کی زد میں آ گئی۔ اس کی ساس نے اسے کسی سے بات کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اب پورا گھر سوجھلا کے لیے نفرتوں کا جہنم بن چکا تھا۔ سوجھلا گھر کے تمام افراد کے سامنے مجرم بنی کھڑی تھی، تابش کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا اور اس کی زبان آگ کے شعلے اُگل رہی تھی۔ ”ایک قاتل کی بہن بدکار بھی ہوگی، یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا، اس نے اس گھر کو بے حیائی کا اڈہ بنا لیا ہے، میں اسے جان سے مار دوں گا، اس کے گھر والوں نے بھائی کے قتل کے بدلے میں ایک بے حیا لڑکی ہمارے حوالے کر کے پورے جرگے کی توہین کی ہے، اس نے وہ جرم کیا ہے جو کسی بھی صورت قابلِ معافی نہیں“۔ سوجھلا کی ماں اسے طلاق دے کر گھر بھیج دینے کے مشورے دے رہی تھی، جبکہ تابش اسے جان سے مار دینے پر بضد تھا۔ تابش کا باپ دوبارہ جرگہ بلانے پر زور دے رہا تھا اور تابش کی بہنیں سوجھلا کا منہ سر کالا کر کے اور اس کا سر منڈا کر اس کو واپس گھر بھیج دینے کو بہتر خیال کر رہی تھیں۔ تابش چاہتا تھا کہ سوجھلا اس شخص کا نام بتائے جس سے وہ فون پر بات کر رہی تھی تاکہ دونوں کو ایک ساتھ سزا دی جائے۔ ملامتوں کے اس شور میں سوجھلا جو خاموشی سے اپنی بے بسی کا تماشا دیکھ رہی تھی، نے اچانک سر اُٹھایا اور اپنی تمام تر ہمت جمع کر کے زبان کو بولنے پر آمادہ کیا اور پھر سارا گھر سناٹے کے شور سے گونج اُٹھا۔ اب صرف سوجھلا بول رہی تھی، باقی سب پتھر تھے۔ سب کے سروں پر ہما بیٹھا ہوا تھا، زبانیں گنگ، آنکھیں بے جان اور جسم پتھر کے۔

سوجھلا بول رہی تھی، صدیوں کی خاموش عورت سوجھلا کی آواز بن چکی تھی، سوجھلا کے لفظ آگ کے شعلے بن کر رسموں رواج اور عورت پر ظلم کے ضابطوں کو بھسم کر رہے تھے۔

”ہاں میں بدکار ہوں، بے حیا ہوں، میں نے اس گھر کو بے حیائی کا اڈہ بنا دیا ہے، میں قاتل کی بہن ہوں جو مقتول کا خوں بہا ہے، مجھ میں اور بیں لاکھ روپوں میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ وہ خرچ ہو چکے ہیں اور میں ضائع کر دی گئی ہوں، میں جس نے تابش کی من ہی من میں پوجا کی، اسے اپنی محبت کے سنگھاسن پر چاہت کے خدا کا منصب دے کر بٹھایا جس کے خواب میری بینائی اور خیال میری سوچ کا حسن تھے۔ میں جس نے تابش کی محبت کو اپنے دل میں ایسے سجایا کہ کوئی کافر اپنے معبدوں میں پتھر کے خداؤں کو بھی کیا سجاتا ہوگا۔ میرے بھائی نے قتل کیا لیکن سزا مجھے ملی، میرے ماں باپ کی نظروں میں میرا بھائی مجھ سے کہیں زیادہ قیمتی تھا۔ میں اگر تابش کی محبت اپنی زبان پر لاتی تو میرا باپ میری زبان کٹوا دیتا، مجھے کاری کر کے مار دیتا، لیکن اس باپ نے مجھے قتل کے بدلے تابش کو دینے میں کوئی تامل نہیں کیا۔ میں اِس گھر کی عزت و آبرو اور اپنے تمام تر جذبوں، خوابوں اور اُمیدوں کے گلاب لے کر آئی، جواب میں میری جھولی نفرت کے کانٹوں سے بھر دی گئی۔ مجھے قاتل کی بہن قرار دے کر انسان ہونے کی رعایت ہونے سے بھی محروم کر دیا تھا۔ مجھے تابش کی الماری سے

موبائل ملا تو میں نے پہلا اور آخری فون اُسی تابش کو کیا جو میرا شوہر ہے۔ مجھے پتہ تھا کہ یہ تابش کا نمبر ہے، میرا جرم یہ ہے کہ جو محبت مجھے اپنے شوہر تابش سے نہیں ملی، اسے میں نے اپنے دوست تابش سے حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن کیا تابش بتا سکتے ہیں کہ انھوں نے گھر میں بیوی ہونے کے باوجود ایک غیر لڑکی کو شادی کے خواب کیوں دکھائے؟ اُس سے ہمیشہ ساتھ رہنے کے وعدے کیوں کیے؟ اسے گھر سے بھاگ جانے کے مشورے کیوں دیئے؟ لیکن ....!! یہ مرد ہے، یہ سب کر سکتے ہیں، عورت جرم نہ کر کے بھی سزا کی مستحق اور مرد جرم کر کے بھی بے گناہ۔

میرے بھائی نے سرمد کا خون میرے کہنے پر نہیں کیا تھا، میں جو من ہی من میں تابش کی پوجا کر رہی تھی، کیا یہ چاہتی تھی کہ اُس کا بھائی میرے بھائی کے ہاتھوں قتل ہو جائے، میں تو ماں باپ اور جرگے کے فیصلے اور حکم کے سامنے سر جھکا کر آپ کے گھر آ گئی تھی، تابش نے مجھے پہلی ہی رات نفرت کا تحفہ دے کر زندہ لاش بنایا اور میں سر جھکا کر تابش کی مرضی کی قبر میں دفن ہو گئی۔ صرف یہ سوچ کر کہ چلو تابش کے گھر پر تو ہوں۔ چاہے لاش بن کر ہی سہی۔ میری ساس، نندیں یہ بھی عورتیں ہیں، کیا انہوں نے کبھی خود کو میری جگہ پر رکھ کر سوچا، لیکن سچ تو یہ ہے کہ مرد بھی عورت کا دشمن اور عورت بھی عورت کی دشمن!! بھیڑ بکری جس نے جب چاہا ہانک لیا، جس نے جس کھونٹے پر باندھنا چاہا، باندھ لیا۔ نہ عورت کی کوئی خواہش نہ مرضی، نہ حکم نہ عرض۔ ٹھیک کہا ہے آپ سب نے! مجھے، میرا منہ کالا کر کے اور سر منڈا کر بستی کی گلیوں میں پھرایا جانا چاہیے، مجھے طلاق دے کر اُسی گھر میں واپس بھیج دینا چاہیے جس کے مکین قاتل بیٹے کو بچانے کے لیے مظلوم بیٹی کو خوں بہا میں دینے میں کوئی تامل نہیں کرتے۔ جن کے لیے بیٹا، بیٹی سے ہزار گنا زیادہ قیمتی ہے، لیکن میری آپ لوگوں سے گذارش ہے کہ میرے ساتھ اس کو بھی کاری کیا جائے، اسے بھی سزا دی جائے جس نے میرے ساتھ عشق کیا، مجھے گھر سے بھاگ جانے کی ترغیب دی۔ مجھ سے شادی کے عہد باندھے۔

سوجھلا بول رہی تھی تابش اور اس کے گھر والے دم سادھے سن رہے تھے، گھر کی دیواریں ہمہ تن گوش تھیں اور شاید دور کہیں وقت اور زمانہ بھی کان لگائے ہوئے تھے۔ اب کی بار ایک عورت کی آواز کچھ آنکھوں کو نم کر رہی تھی، کچھ سروں کو نادم ہونے پر مجبور کر رہی تھی اور کچھ دل محبت کی فتح یابی اور کامرانی پر خوش بھی تھے، تاہم فیصلہ ہونا ابھی باقی تھا اور شاید اب بھی باقی ہے، سوجھلا کا فیصلہ، عورت کا فیصلہ، وقت کا فیصلہ اور زمانے کا فیصلہ۔

☆☆☆☆

آدم شیر

چہرے کی تلاش

آج کے اخبار میں چھپی ایک خبر نے مجھے اپنا برسوں پرانا دوست یاد دلا دیا ہے اور ایک کہانی ماضی کے جھروکوں سے صدا دینے لگی ہے۔

میں نے آج تک سمندر نہیں دیکھا۔ ٹی وی کی سکرین پر موجیں دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ ان کے ساتھ ساتھ جاؤں دور تک۔

لڑکپن سے ایک خواب دیکھتا آ رہا ہوں۔ عمر پچاس برس سے اوپر ہو تو ایک بڑی سی کشتی خرید لوں اور اس میں ڈھیروں کتابیں اور کھانے پینے کی دوسری چیزیں بھر کر سمندر کی سیر کو نکل جاؤں یا سمندر میں ہی رہنا شروع کر دوں۔ بس پڑھوں، لکھوں اور سوتا رہا ہوں یا ہر طرف پھیلے پانی کو دیکھوں جو زندگی رواں دواں رکھتا ہے۔ لوگوں کے لیے رزق چھپائے رکھتا ہے اور کشت کرنے پر اگل دیتا ہے۔ موت کا باعث بھی بنتا ہے مگر یہی حیات ہے۔ پانی اور پانی، ہر طرف پانی جس میں بڑی مچھلیاں صرف زندہ رہنے کے لئے چھوٹی مچھلیوں کو کھاتی ہیں اور زندگی یوں ہی موجوں کی طرح اوپر نیچے، آگے پیچھے ہوتی رہتی ہے، بالکل میرے خواب کی طرح۔ کسی کو یہ خواب جیسا بھی لگے، مجھے پرواہ نہیں کیونکہ یہ میرا خواب ہے اور خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا، تو میں یہ خواب دیکھتا رہوں گا کہ میں سمندر میں ہوں۔ میں ایک کشتی میں ہوں۔ خشکی سے دور، بہت دور، موٹی موٹی کتابوں کے درمیان دبلا پتلا سا میں، حروف کے سمندر میں غوطہ زن، اعمال سے دور۔

اب میں سمندر سے بہت دور ہوں۔ اتنا دور بھی نہیں کہ جا نہ سکوں لیکن ڈرتا ہوں۔

میں ٹی وی پر ایسی مہم جوئی پر مبنی فلمیں دیکھتا ہوں جو سمندر کی زندگی پر بنی ہوتی ہیں۔ مجھے ایسی دستاویزی فلمیں بھی بہت پسند ہیں جن میں پانی کے نیچے رہنے والی رنگ برنگی، دل للچانے والی اور ڈرا دینے والی مخلوق نظر آتی ہے۔

مجھے ہرمن میلول کی موبی ڈک پسند ہے۔ ارنسٹ ہیمنگوے کی وہ کہانی بھی کئی بار پڑھی ہے جس میں ایک بوڑھا مچھلی پکڑنے جاتا ہے اور ایک بہت بڑی مچھلی اس کے ساتھ کھیلنے لگتی ہے۔ اور، اور انگ انگ میں جوش بھر دینے والی اوڈیسی تو میرے سرہانے تلے دھری رہتی ہے، جب جی چاہتا ہے ورق الٹاتا ہوں اور اس میں کھو جاتا ہوں۔

اور خواب دیکھتا ہوں کہ میں ایک بڑی کشتی میں ہوں جو سمندر میں ہوا کے دباؤ پر بہہ رہی ہے اور کبھی کبھی ہچکولے کھاتی ہے میرے خیالات کی طرح۔

ایک بار میں نے حقیقت میں سمندر دیکھنے کا منصوبہ بنایا اور ہر مہینے کی تنخواہ میں سے بچت شروع کر دی۔ کسی مہینے سات سو اور کبھی آٹھ سو روپے نکال لیتا۔ تین چار بار دو دو ہزار بھی بچائے اور پچاس ہزار روپے تک جوڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ سمندر دیکھنے کے لئے پچاس ہزار روپے کافی تھے۔ پھر بھی بے کراں پانی نہ دیکھ پایا۔

میرے گھر میں جھمیلے بہت ہیں۔ ضرورتیں ہر وقت منہ کھولے کھڑی رہتی ہیں لیکن پچاس ہزار روپے جوڑے ہی سمندر دیکھنے کے لیے تھے۔ سوچا کہ کراچی جاتا ہوں لیکن جا نہ پایا۔ پھر سوچا کہ گوادر چلے جاتے ہیں مگر وہاں بھی جا نہ سکا۔

میں ڈرتا ہوں۔ میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوفزدہ ہو جاتا ہوں لیکن ایسی باتیں مجھے بہت بڑا سمندر دیکھنے کی خواہش سے نہیں روک سکتیں۔

میں راستہ بھٹک جانے سے نہیں ڈرتا۔ میں اس بات سے بھی نہیں گھبراتا کہ یوں پیسے خرچ کرنے پر گھر والے لعن طعن کریں گے۔ مجھے ایسی پریشانی نہیں کہ اتنی محنت اور صبر سے اکٹھے کئے پیسے ختم ہو جائیں گے، یہ رقم اسی لیے جمع کی تھی تا کہ میں سمندر دیکھ سکوں جو اب تک صرف ٹی وی کی چھوٹی سی سکرین پر دیکھا ہے۔

میرے پاس پیسے ہونے کے باوجود برسوں پرانی خواہش پوری نہیں ہو رہی۔ اس کی تکمیل میں کوئی رکاوٹ نہیں سوائے اس کے کہ میں کھیتوں کھلیانوں کی زمین سے ہوں جو پانچ دریاؤں کی دھرتی ہے اور ہیبت ناک خوبصورتی سے بھرا سمندر پانی کے دیوتا سندھو دریا کی گزرگاہ سے کچھ پرے ہے، یا ان سخت جان یودھاؤں کی دھرتی کو چھوتا ہے جن کو لوری ملتی ہے۔ میرا پھول سا بچہ جواں ہو گا۔ کاندھے پہ رکھ بندوق رواں ہو گا۔

اور میں پانچ دریاؤں کی دھرتی کا بھوری رنگت والا بیٹا ہر جگہ قابل نفریں بنا دیا گیا ہوں۔ وہ پرانی بندرگاہوں کا دیس ہو یا نئی بندرگاہ کا وطن، نیلی جھیلوں کی سرزمین ہو کہ پھلوں اور پھولوں سے لدے ہرے بھرے باغوں سے سجی دھرتی جو جنگجوؤں اور جارحیت پسندوں کا کھیل تماشا دیکھنے والے سنگلاخ پہاڑوں کے درمیان لے جاتی ہے یا جنت نظیر کشمیر، میرا چہرہ بگاڑ دیا گیا ہے۔

مجھے نیا چہرہ نہیں چاہیے۔ میں اپنا اصلی چہرہ واپس چاہتا ہوں جس پر ملا ہوا گند صاف کرنے کے لئے کوئی نمکین پانی دینے کو تیار نہیں، سمندر سے بھی زیادہ نمکین۔ اتنا کہ پانی نہیں رہتا، تیزاب بن جاتا ہے جو سب صاف کر دیتا ہے اور اگر یہ کہیں باہر سے مل گیا تو، صرف کالک اترے گی یا چمڑی بھی پگھل جائے گی اور میں پہچانا نہیں جاؤں گا اپنے دوست کی طرح، جسے شناخت کر کے ناقابل شناخت بنا دیا گیا۔

☆☆☆☆

ظفر اقبال

لاء کالج میں قیام

قیام اس لیے لکھا ہے کہ رہائش ہاسٹل میں رہی۔ افتخار جالب بھی لاء کر رہے تھے اور میرے ساتھ ہاسٹل ہی میں مقیم۔ کالج سے کوئی ادبی میگزین نہ نکلتا تھا جس کا ڈول ہم دونوں نے ڈالا اور ’’میزان‘‘ کے نام سے ’’راوی‘‘ کی طرز اور معیار کا پرچہ نکال مارا۔ ادھر اُدھر چھپنا شروع ہو گیا تھا، اس لیے حنیف رامے سے بھی یاد اللہ ہو چکی تھی، چنانچہ رسالے کا ٹائٹل انہی سے بنوانے کی درخواست کی گئی جو انھوں نے قبول کر لی اور سیاہ و سبز رنگوں میں ایک بہت خوبصورت سرورق بنا دیا۔ رسالے کا مدیر میں تھا جبکہ نائب مدیر کے طور پر افتخار جالب کا نام تھا۔ ’’راوی‘‘ کی طرح اس میں بھی کالج سے باہر کی ادبی شخصیات کی نگارشات شامل کی گئیں جن میں ناصر کاظمی، منیر نیازی، محمد صفدر، انجم رومانی، امجد الطاف، شہرت بخاری، قیوم نظر اور دیگر شامل تھے۔ ہمارے بعد پھر وہ پرچہ شائع نہ ہوا۔ مجھے یاد ہے اس میں محمد صفدر نے ’’پنجابی بولیاں اور رنگ‘‘ کے عنوان سے مضمون قلمبند کیا تھا جس کی ایک خوبصورت بولی یہ تھی:

سانوں سیاچ پئین بھُلیکے
تیری وے سندھیوری پگ وے

اسی طرح اُستاد انجم رومانی کی غزل کا شعر بھی یاد ہے ؎

گرُو تو پھر گرُو ہے، اُس کی بھلی کسی
چلتا ہے کیا بانکا اُچھل اُچھل کے ساتھ

گورنمنٹ کالج سے ابھی تازہ تازہ ہی نکلے تھے کہ قیوم نظر صاحب نے کہا کہ چندی گڑھ (بھارت) میں مشاعرہ ہے، تم بھی چلو۔ میں نے کہا کہ میں نے تو آج تک کوئی مشاعرہ نہیں پڑھا، کہنے لگے۔ فکر نہ کرو، وہاں بھی کئی تمہارے جیسے ہوں گے جو پہلا ہی مشاعرہ پڑھ رہے ہوں گے۔ اس پر شفیق الرحمٰن کا لکھا ہوا ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا جب گھوڑ سواری کے ایک مقابلے میں اس کے مشہور کردار ’’شیطان‘‘ جس کا اصل نام شاہد روفی تھا، کے لیے ایک نوجوان گھوڑا لا کر اُسے سوار ہونے کو کہا گیا جس پر وہ بولا کہ میں نے آج تک

گھوڑے کی سواری نہیں کی تو اُسے کہا گیا، کوئی بات نہیں، اس پر بھی آج تک کوئی سوار نہیں ہوا!۔

اس مشاعرے میں شرکت کے لیے مندرجہ بالا حضرات کے علاوہ نثار امرتسری، شہزاد احمد اور صوفی تبسم بھی تھے۔ یہاں سے ریل گاڑی پر گئے تھے اور اُسی سے واپس آئے۔ صوفی صاحب واپسی پر کسی اور ڈبے میں تھے اس لیے سب نے اُن کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اپنے انداز میں اُن کی ہجو میں زوردار شعر کہے اور سفر نہایت خوبی اور خوشی میں کٹا۔ وہاں میں نے جو غزل پڑھی اس کا ایک ہی شعر یاد ہے اور ”جو آب رواں“ میں شامل نہیں ہو سکی تھی، شعر یہ تھا:

حدیث شامِ غریبی شجر شجر سے کہو
اگر کوئی نہیں سنتا تو بام و در سے کہو

یہ میرا بھارت کا پہلا اور آخری دورہ تھا۔ آدھا بھارتی تو میں پہلے ہی ہوں کہ بھارت میں پیدا ہوا جبکہ ہمارے علامہ اقبال تو پورے کے پورے بھارتی تھے کہ پیدا بھی وہیں ہوئے اور وفات بھی وہیں پائی اور یہ لازوال نغمہ بھی لکھ گئے جس کا پہلا شعر ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بُلبلیں ہیں اُس کی یہ گلستاں ہمارا

ہاسٹل میں شکیب جلالی بھی ملنے آیا کرتے تھے جو اہلِ زبان ہونے کے باوجود نہایت خاموش طبع واقع ہوئے تھے جبکہ انہی دنوں ہم ”امروز“ اخبار کے ادبی ایڈیشن میں اکٹھے چھپا بھی کرتے تھے بلکہ اس کے علاوہ ادھر اُدھر بھی شائع ہونے لگ گئے تھے۔ انہی دنوں امجد الطاف اور کچھ دیگر دوستوں نے ”نئی تحریریں“ کے نام سے ایک ادبی پرچے کا اجراء کیا جس میں میری پانچ چھ غزلیں مختصر تعارف کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک غزل کے ایک شعر کے مصرعہ میں قیوم صاحب نے بڑی خوبصورت تبدیلی کی۔ مصرعہ یہ تھا ؏

سونی سلگتی سوچ کی سنسان سی سڑک

جسے تبدیل کر کے انھوں نے اس طرح کر دیا ؏

سُونی سلگتی سوچتی سنسان سی سڑک

اور اسی طرح شعر کی Alliteration کو مکمل کر دیا!

انہی دنوں کا ایک اور دلچسپ واقعہ جس کا ذکر پہلے بھی کہیں کر چکا ہوں، یہ تھا کہ قیوم نظر صاحب کی آنکھیں خراب ہو گئیں تو انجم رومانی جو ہومیو پیتھک علاج بھی کرتے تھے۔ قیوم صاحب نے ان سے علاج

کروایا تو اُن کی آنکھیں ٹھیک ہونے کی بجائے مزید خراب ہو گئیں جس پر ایک طالب علم نے انجم صاحب سے کہا کہ سر۔ آپ نے قیوم صاحب کا کیسا غلط علاج کیا کہ ان کی آنکھیں مزید خراب ہو گئیں۔ اس پر انجم صاحب بولے:

"میرا علاج ٹھیک تھا، بندہ غلط ہے!"

اُس زمانے میں صفدر میر کے ساتھ خاصی ملاقاتیں رہیں۔ اُن دنوں وہ انارکلی بازار کے ایک فلیٹ میں رہائش پذیر تھے جہاں میں اور میرے دوست اقبال جعفری اُن سے ملنے کے لیے جایا کرتے تھے۔ وہ فارسی میں بھی خاصا درک رکھتے تھے۔ چنانچہ میں نے دیوان نظیری کا ایک نسخہ بازار سے خرید کر اُنھیں گفٹ کیا۔ انھی دنوں میں نے ہنرِخ ہائنے کی دو نظموں کا منظوم ترجمہ کیا جو ہفت روزہ "لیل ونہار" میں شائع ہوئیں تو انھوں نے کہا کہ ان نظموں کا کبھی میں نے بھی ترجمہ کیا تھا لیکن آپ کا ترجمہ زیادہ کمپیکٹ ہے۔

لا ءکالج ہاسٹل کی ایک یادگار ہستی ایک ایسے بزرگ تھے جنہوں نے اپنے کمرے میں باقاعدہ حقہ رکھا ہُوا تھا۔ میرا دوست عارف سجاد ایک اور عیاشی تھی جو مجھے وہاں میسر تھی اور جو سکول کے زمانے سے ہی میرا ہم جماعت چلا آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک سعید بھائی بھی ہوا کرتے تھے جن کے ساتھ ہنسی مذاق میں وقت گزر جاتا کہ پڑھائی کی طرف لا ءکالج میں تو کم ہی توجہ دی جاتی تھی اور تھوڑی مغز ماری امتحان سے کچھ عرصہ پہلے ہی کر لیا کرتے تھے۔ افسوس کہ چند برسوں کے بعد عارف سجاد عین جوانی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

انھی دنوں ٹی ہاؤس بھی آنا جانا رہا جہاں متذکرہ بالا سینئر شعرا سے ملاقات رہتی جہاں ایک طرف اسرار زیدی بھی براجمان ہوتے جو اس سے پہلے کچھ عرصہ اوکاڑہ میں بھی رہ چکے تھے اور وہاں کی ادبی مجالس میں بھی باقاعدگی سے شریک ہوا کرتے۔ اپنے زیرِ مطالعہ کلیات میر کا نسخہ میں نے انھی کو گفٹ کر دیا تھا جس کا احوال کہیں پہلے بتا چکا ہوں۔ گویا اس وقت تک میری شاعری کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا جو روزنامہ "امروز" سے ہوتے ہوئے لاہور کے دیگر رسائل "سویرا"، "ادبِ لطیف" اور "ادبی دنیا" وغیرہ تک پہنچ چکا تھا۔

افتخار جالب کے ساتھ ادبی گپ شپ تو ہوا کرتی لیکن ابھی انھوں نے لسانی تشکیلات کا ڈول نہیں ڈالا تھا اور جو اس کے بعد ساٹھ کی دہائی شروع ہوتے ہی نئی شاعری کے نام سے اس کا غلغلہ شروع ہو گیا جس میں افتخار جالب کے علاوہ جیلانی کامران، صفدر میر جو ان دنوں "زینو" کے فرضی نام سے انگریزی اخبار میں کالم بھی لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ انیس ناگی اور ڈاکٹر سعادت سعید، تبسم کاشمیری اور عبدالرشید وغیرہ تھے۔ میں نے اس دوران پنجابی میں بھی شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور میری چیزیں "امروز" ہی کے ہفتہ وار ایڈیشن میں شائع ہوا

کرتیں۔ اُنہی دنوں ‘‘پنجابی مجلس’’ کا بھی آغاز ہوا جس میں شفقت تنویر مرزا اور محمد آصف خان وغیرہ بھی تھے اور میں نے جس کے پہلے جنرل سیکرٹری کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔

اوکاڑہ میں شب وروز

لاء کرنے کے بعد چھ ماہ کے لیے ساہیوال میں چوہدری نذیر احمد خاں کرنالوی کے پاس تربیت حاصل کی اور اوکاڑہ میں پریکٹس شروع کر دی۔ وہاں کمپنی باغ میں صبح کی باقاعدہ سیر کا آغاز ہوا۔ وہاں اور (مقامی) لوگوں کے ساتھ ساتھ نثار آغا کے ساتھ خصوصی صحبت رہی جو ڈاکٹر وزیر آغا کے بھتیجے تھے اور کسی وجہ سے باپ دادا کی زرعی اراضی میں اپنے حصے سے محروم رہ گئے تھے۔ تپ دق کے مریض تھے اور بے روزگار بھی۔ البتہ ڈاکٹر صاحب ہر ماہ انھیں ایک مقررہ رقم بھجوا دیا کرتے تھے جو ان کے لیے ناکافی تھی چنانچہ میری درخواست پر ڈاکٹر صاحب نے اس رقم میں اضافہ کر دیا تھا۔

نثار آغا کے ساتھ وقت بہت خوبی سے گزر رہا تھا کہ فاختاؤں کے شکار میں میرے ہمراہ ہوتے۔ ڈانا کی ائرگن ہوتی تھی اور ہم دونوں۔ ان دنوں فاختائیں ہوتی بھی عام تھیں۔ اب تو یار لوگوں نے جال کے ذریعے پکڑ پکڑ کر ان کا تقریباً بیج ہی مار دیا ہے۔ اس کے علاوہ کبوتر، تلئیر ہماری زد میں رہتے۔ بلکہ ایک روز ایک ہریل بھی خلافِ معمول ہمارے ہتھے چڑھ گیا۔ حرام پرندوں مثلاً کوؤں، شارکوں اور طوطوں وغیرہ پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ آغا نثار کا ایک جوان اور خوش شکل اکلوتا بیٹا بیڈمنٹن کھیلتے ہوئے سانس پھول جانے کی وجہ سے وفات پا گیا جس سے موصوف کی کمر ہی ٹوٹ گئی اور کچھ عرصہ بعد وہ خود بھی اللہ کو پیارے ہو گئے اور میری ذاتی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا۔

باہر سے آنے والوں میں منیر نیازی، احمد فراز، صلاح الدین محمود، محمد سلیم الرحمٰن، ریاض احمد اور محمد خالد اختر وغیرہ شامل ہیں۔ جمیل الدین عالی کی کچھ اراضی اوکاڑہ کے قریب اختر آباد میں واقع تھی جس سلسلے میں وہ کبھی کبھار وہاں کا دورہ کیا کرتے۔ میرے وہاں پریکٹس شروع کرنے کے بعد پہلی بار جب وہاں آئے تو کنور سعید احمد ایڈووکیٹ (جو اَب مرحوم ہو چکے ہیں) کے ہی پاس رُکا کرتے تھے۔ چنانچہ ان سے میری ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تو کنور صاحب نے اپنے منشی بشیر سے کہا کہ جا کر میاں صاحب کو بلا لاؤ جس پر عالی صاحب نے کہا کہ کیا غضب کرتے ہو اُنھیں یہاں بُلا رہے ہو۔ ہم خود ان کے پاس جاتے ہیں، لیکن چونکہ کنور صاحب کے ساتھ بے تکلفی تھی۔ اس لیے انھوں نے مجھے بُلوا کر ملاقات کرا دی۔

لطیف اُلفت اور صابر لودھی بھی کچھ عرصہ کے لیے اوکاڑہ کالج میں تعینات رہے جن کی وجہ سے وہاں کی

ادبی محفلوں میں رونق رہی۔ اسرار زیدی وہاں پہلے ہی موجود تھے۔ تاہم ان محفلوں کی مرکزی حیثیت سنیئر صحافی کامریڈ عبدالسلام ہی تھے جو پکے مارکسی تھے۔ وہاں کا پریس کلب بھی خاصا فعال تھا جس کے اجلاس باقاعدہ ہوا کرتے اور کمپنی باغ کے ایک کونے میں کلب نے ایک عمارت بھی کھڑی کر دی تھی۔

کلب کے انتخابات بھی ہر سال ہوا کرتے۔ میں نے اس کا صدارتی الیکشن لڑا لیکن ''اخبار پاک'' کے ایڈیٹر مرزا بشیر محمد منشی فاضل سے ہار گیا کیونکہ اس الیکشن میں شہر کی سیاسی پارٹیوں کا بھی عمل دخل تھا۔ تاہم بعد میں دو دو دفعہ اس کا صدر منتخب ہوا۔ اس کے روح رواں منیر چوہدری ہیں جو لاہور کے ایک اخبار کے رپورٹر ہیں اور کلب کی پرشکوہ عمارت کی تعمیر کا سہرا بھی اُنھی کے سر بندھتا ہے۔ کلب میں اہم سیاسی شخصیات کو بھی مدعو کیا جاتا جن میں وفاقی وصوبائی وزرا بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں جن میں میاں محمد زمان، میاں محمد یٰسین خاں وٹو، میاں منظور احمد خاں وٹو، راؤ سکندر اقبال، رانا اکرام ربانی، چوہدری اکرام الحق، حاجی محمد یار خاں لاشاری، سید سجاد حیدر کرمانی، محمد اشرف سوہنا، شیخ ریاض، میاں یاور زمانی اور دیگر شامل ہیں۔

گھر سے کچہری کا کوئی خاص فاصلہ نہیں تھا۔ اس لیے شروع شروع میں پیدل ہی آنا جانا رہا۔ اس کے بعد ریلے سائیکل جو پرمٹ پر ملا کرتا تھا۔ مجید امجد ساہیوال میں فوڈ کنٹرولر تھے اور انھیں یہ اختیار حاصل تھا، چنانچہ ان سے پرمٹ لے کر یہ سائیکل خریدیا خریدی جو اس زمانے میں کسی کسی کے پاس ہی ہوا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ گاؤں بھی عام طور سے سائیکل پر ہی جایا کرتا جو شہر سے 12 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے جبکہ پریکٹس شروع کرنے کے تقریباً 15 سال بعد گاڑی نصیب ہوئی۔ وہ بھی اس طرح ممکن ہوا کہ شہر ہی میں مَیں نے 200 روپے روزانہ کی کمیٹی ڈال رکھی تھی اور جو زیادہ تر اسی مقصد کے لیے تھی جو اس طرح پورا ہوا۔

سیاست کا آغاز بھی وکالت کے آغاز ہی سے ہو گیا۔ ہمارے بزرگ میاں عبدالحق اور میاں عبدالخالق کا تعلق چونکہ مسلم لیگ کے ساتھ تھا، اس لیے کچھ عرصہ اس کے ساتھ وابستگی رہی اور جب پاکستان پیپلز پارٹی کا ڈول ڈالا گیا تو میں رانا اظہر اور پروفیسر محمد سلیم کے لاہور میں منعقد ہونے والے اس کے اساسی اجلاس میں شامل تھے اور میں مقامی الیکشن میں شہر کا سینئر وائس پریذیڈنٹ منتخب ہوا۔ اس کے دیگر عہدوں پر بھی رہا جبکہ پارٹی کے اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہوا کرتے۔ 70ء کے انتخابات قریب آئے تو مجھے دیہی حلقوں سے ٹکٹ کی پیشکش ہوئی لیکن میرے ایک عزیز میاں نذیر احمد جو اسی حلقے سے اُمیدوار تھے حلقے میں خاصا کام بھی کر چکے تھے، انھوں نے درخواست کی کہ میں دست بردار ہو جاؤں جس پر میں نے پارٹی کا ٹکٹ واپس کر دیا جبکہ اس وقت یہ احساس بھی نہیں تھا کہ پارٹی اتنی آسانی سے فتح یاب ہو گی۔ چنانچہ میری جگہ وہ ٹکٹ رائے

میاں خاں کھرل کو دیا گیا جس پر وہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے جبکہ شہر سے شیخ محمد ریاض اور تقریباً دیہی حلقوں سے بھی پارٹی کے امیدوار منتخب ہوئے۔

میں پارٹی سے بد دل اُس وقت ہوا جب بھٹو صاحب پالیسی ترک کرتے ہوئے ان لوگوں کے ساتھ شیر وشکر ہو گئے جن کے خلاف ہم نے اپنی جدو جہد کا آغاز کیا تھا چنانچہ میں نے پارٹی کی بنیادی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا جس کے بعد حنیف رامے اور کئی دوسرے بھی پارٹی چھوڑ گئے جبکہ الیکشن 77ء جیتنے کے باوجود انتخابات دھاندلی زدہ ہونے کے باعث تحریک چلی اور ضیاء الحق نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھٹو حکومت کا تختہ اُلٹ دیا۔ اس سازش میں امریکہ باقاعدہ شامل تھا۔ چنانچہ یہ کھیل بالآخر بھٹو کی پھانسی پر منتج ہوا۔

تب تک آب رواں سمیت میرے تین شعری مجموعے شائع ہو چکے تھے جبکہ ''رطب ویابس'' کے نام سے تیسرا مجموعہ پہلے شمس الرحمٰن فاروقی نے الٰہ آباد سے شائع کیا جو بعد میں ''جنگ'' پبلشرز کی جانب سے شائع ہوا۔ پہلی دو کتابوں کی طرح اس کا سرورق بھی حنیف رامے نے بنایا۔ کالم نویسی ماہنامہ ''دھنک'' سے شروع ہوئی اور پھر ''جنگ''، ''نوائے وقت''، ''مشرق، ''پاکستان''، ''خبریں''، ''جناح''، ''وقت''، ''نئی بات'' اور اب ''دنیا'' میں جاری ہے۔ کالموں کے دو انتخاب ''دشتِ زعفران'' اور ''دال دلیا'' کے نام سے شائع ہوئے۔

1995ء تک اوکاڑہ میں پریکٹس کی اور پھر مجھے اردو سائنس بورڈ کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کر کے لاہور بھیج دیا گیا۔ یہ دو سال کا کنٹریکٹ تھا جس کے بعد منسٹری کی جانب سے مجھے کہا گیا کہ ہم آپ کے کام سے مطمئن ہیں اور آپ کے معاہدے میں دو سال کی توسیع کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ کو منظور ہو تو اپنی رضامندی کا خط لکھ کر مطلع کریں چنانچہ میں نے خط لکھ دیا لیکن اسی دوران حکومت تبدیل ہو گئی اور میری جگہ امجد اسلام امجد کو تعینات کر دیا گیا جس کے بعد واپس اوکاڑہ جانے کی بجائے میں نے لاہور ہائیکورٹ ہی میں پریکٹس شروع کر دی۔

اب تک کئی اور مجموعے بھی شائع ہو چکے تھے جب کہ میں نے ''اب تک'' کے نام سے کلیات چھاپنے کا پروگرام بنایا جس کی اب تک چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور پانچویں تیار ہے۔ چند ماہ پہلے میرے نثری مضامین کا مجموعہ جو کلیاتِ نثر پر مشتمل ہے۔ ''لاتنقید'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ پنجابی شاعری کا کلیات ''پنڈ وکڑی'' کے عنوان سے پلاک کے زیر اہتمام شائع ہونے کو تیار ہے۔

☆☆☆☆

سلمان باسط

ناسٹیلجیا

میری زندگی کی اوّلین یاد مصری شاہ لاہور کے ایک گھر سے وابستہ ہے۔۔ وہ ایک چھوٹا سا تین کمروں پر مشتمل گھر تھا جس میں میرے ابا جی، اَمّی جی، بھائی جان اور میں رہائش پذیر تھے۔ گھر کے تمام کمرے ایک ہی سمت میں تھے درمیان میں ایک مختصر سا صحن تھا جس کے دوسری جانب ایک غسل خانہ تھا۔ مرکزی دروازے سے داخل ہوتے ہی بائیں جانب باورچی خانہ تھا جہاں سے اکثر کھانے کی سوندھی سوندھی خوشبو آتی رہتی تھی جو اشتہا میں اضافے کا باعث بنا کرتی تھی۔ گھر کے مرکزی دروازے سے داخلے کے لیے چھوٹی سی اونچائی چڑھنی پڑتی تھی جو اس وقت خاصی اونچی محسوس ہوتی تھی۔ یہ چڑھائی ہماری اس وقت دستیاب واحد سواری بائیسیکل کو سہولت سے اتارنے اور چڑھانے کے لیے تھی۔ مجھے یاد ہے جب بھی میرے ابا جی دفتر سے چھٹی کے وقت گھر آتے تو دروازے کے باہر سے گھنٹی بجاتے۔ میں جہاں ہوتا اور جس بھی حالت میں ہوتا لپک کر دروازے پر پہنچ جاتا اور میرے شفیق ابا جی دونوں بازو پھیلا کر مجھے اٹھا لیتے۔ پہلے میرے دونوں گالوں پر بوسہ دیتے اور پھر سائیکل پر اپنے ساتھ بٹھا کر ایک چکر لگواتے اور سائیکل پر اسی طرح بٹھا کر اس چڑھائی نما داخلی راستے سے گھر میں داخل ہو جاتے اور میں سائیکل کی گھنٹی بجاتا جاتا۔ آغوشِ مادر وا ہوتی اور میں اپنی امی کی باہوں میں جھول جاتا۔ میں ان دنوں کسی بڑے راج پاٹ والا شہزادہ ہوا کرتا تھا۔ ہر کام میرے منہ سے نکلتے ہی ہو جاتا۔ مجھے علم ہی نہ تھا کہ میرے راج پاٹ سے باہر بھی کوئی دنیا ہے جہاں میرا حکم نہیں چلتا۔

ہمارے اس چھوٹے سے گھر کے ڈرائنگ روم جسے ان دنوں بیٹھک کہا جاتا تھا، کا بیرونی دروازہ مرکزی دروازے کے متوازی مگر ذرا داہنی جانب تھا۔ بیٹھک میں داخل ہونے کے لیے غالباً دو سیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں کیونکہ ہمارا گھر نسبتاً اونچا تھا۔ میری عمر اس وقت بمشکل تین سال تھی لیکن میرے معصوم بچپن نے ان دلربا نقوش کو ایک پینٹنگ کی طرح ذہن کے کینوس پر محفوظ کر لیا تھا۔ اس گھر سے ہم 1962 میں رخصت ہو گئے تھے جب ابا جی گورنمنٹ کالج چکوال میں تدریسی فرائض کے لیے تعینات ہوئے۔ 1982 میں تقریباً بیس سال بعد جب میں گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے انگریزی کا طالب علم تھا، ایک روز ذہن پر بنی ہوئی اسی تصویر کے سہارے کھوجتا ہوا اسی گھر کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ اس روز مجھے جو خوشی ملی، وہ بیان سے باہر تھی لیکن

میں دروازے پر دستک نہ دے سکا کہ اب وقت کے ساتھ قدریں بھی تبدیل ہو چکی تھیں اور میں نئے مکینوں کے مزاج کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ سو دستک اپنی انگلیوں کی پوروں میں لپیٹ کر لوٹ آیا۔

سادہ مگر صاف ستھرا وہ گھر میری امی جی نے آراستہ کر رکھا ہوتا تھا اور کہیں سے کبھی گندگی یا بے ترتیبی کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔ کسی بستر کی چادر میں شکن نہ آنے دیتیں حالانکہ میری اچھل کود ان کے لیے کافی مشکلات پیدا کرتی رہتی۔ مجھے پیار سے کہتی رہتیں ''نہ میرے لعل! نہیں، اس طرح نہ کرو، چادر خراب نہ کرو''۔ ساتھ ساتھ چادر کی شکنیں دور کرتی جاتیں۔ آج اپنی ضعیف ماں کے چہرے پر پڑی شکنیں دیکھ کر میں دل گرفتہ ہو جاتا ہوں۔ جانے ان شکنوں کو انہوں نے کیسے گوارا کر لیا۔

ہمارے گھر سے متصل ایک اور مکان تھا جس میں میرا ہم عمر ایک بچہ رہتا تھا جس کا نام مقیط الرحمٰن تھا۔ وہ مجھے سلمان کی بجائے مسلمان کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ خدا جانے وہ مجھے ایسے کیوں بلاتا تھا۔ یا تو اس نے اس سے قبل صرف مسلمان کا لفظ ہی سن رکھا تھا یا پھر وہ مجھے ہر قدم پر احساس دلانا چاہتا تھا کہ میں ایک مسلمان ہوں۔ ویسے وہ احساس نہ بھی دلاتا تو بھی ہمارے گھر کی مذہبی فضا اس یاددہانی کے لیے کافی تھی۔ جب سے آنکھ کھولی اپنے والدین کو نماز، روزے اور قرآنِ مجید کی تلاوت کا اہتمام اور پابندی کرتے پایا۔ گرمیوں کی ان صبحوں کا رومانس آج بھی دل میں گدگدی کرتا ہے جب گھر کے صحن میں بچھی چارپائی اور اس پر سفید چادر والے بستر پر میری آنکھ کھلتی تو میرے سرہانے امی جی کی سحر انگیز تلاوت کی آواز آ رہی ہوتی اور وہ ساتھ ساتھ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی جاتیں۔ میں جاگ بھی جاتا تو بھی آنکھیں موندے رکھتا تاکہ اس خوش الحان تلاوت کی تاثیر اپنی روح میں اتارتا رہوں۔ پھر امی جی مجھے کلمہ طیبہ پڑھتے ہوئے اٹھاتیں اور ساتھ کلمہ پڑھاتیں۔ میں کبھی مانتا اور اپنی توتلی آواز میں ٹکڑوں میں کلمہ پڑھ لیتا اور کبھی صاف انکار کر دیتا۔ امی جی مجھے اپنے سینے سے لگا لیتیں اور پیار سے کہتیں، ''نہ بیٹا، ایسے نہیں کہتے یہی کلمہ تو ہمیں مسلمان بناتا ہے'' اور ان کی اس بات سے میرا ذہن فوراً مقیط الرحمٰن کی طرف چلا جاتا جو مجھے مسلمان کہہ کر پکارا کرتا تھا۔

بھائی جان عثمان خاور ہمیشہ سے ہی بڑے اہتمام اور اطمینان کے ساتھ ہر کام کرنے کے عادی رہے ہیں۔ کبھی انہیں کوئی کام جلدی کرتے ہوئے نہیں دیکھا حتیٰ کہ جلدی کرنے والے کام بھی ہمیشہ آرام سے ہی کرتے آئے ہیں۔ ایک روز میں مقیط کے ساتھ گھر کے سامنے کھیل رہا تھا اور مغرب ڈھل رہی تھی۔ بھائی جان پاس آئے، سر سے نماز کے لیے بندھا رومال اتارا، اسے اچھی طرح اطمینان سے تہہ کیا، جیب میں ڈالا اور پھر میرے ننھے سے بائیں رخسار پر ایک زوردار طمانچہ مارا جس کے لیے میں ہرگز تیار نہیں تھا۔ میرے منہ سے بے ساختہ لاہوری لہجے میں ایک جملہ نکلا، ''کیہ اوئے'' نظم و ضبط کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی زندگی

گزارنے والے بھائی جان کو کھیلوں سے کوئی خاص رغبت نہ تھی جبکہ میں کھیلوں کا اتنا ہی رسیا تھا۔ یوں بھی ہماری عمروں میں پانچ سال کا فرق تھا۔ میں زندگی کے جس بھی مرحلے پر پہنچتا، وہ اسے پانچ برس پہلے گزار چکے ہوتے۔ فرق صرف عمروں میں نہیں تھا، مزاج، طبیعت اور عادتوں میں بھی تھا۔ میں آغاز سے ہی لاابالی، بے فکرا، کھیل کود کا شوقین، جذباتی اور مجلسی زندگی میں دلچسپی رکھنے والا من موجی تھا جبکہ بھائی جان میری ان تمام عادات سے 180 درجے کے زاویے پر کھڑے ہوتے تھے۔ میں نے ہمیشہ ان کو سلیقے، نظم وضبط، اہتمام اور ضبط نفس کی اذیت سے گزرتے دیکھا ہے۔ میرے لیے یہ منظر ہی تکلیف دہ ہوتا تھا کہ وہ ہر کام کو ضابطے کی نذر کر دیتے تھے۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ والدین کی محبت تو میرے حصے میں بھی اتنی ہی آئی لیکن مجھے جوانی کی سرحدوں میں داخل ہونے تک ان جیسی قدر ومنزلت کبھی نہ ملی۔ مجھے اس کا زیادہ ملال بھی نہ تھا کیونکہ مجھے اپنی آزادی اور بے فکری بہت عزیز تھی اور بنے بنائے راستوں پر چلنا میری فطرت میں ہی نہ تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود بھائی جان کی شفقت اور محبت ہمیشہ مجھ پر سایہ فگن رہی، میری کجیاں، خامیاں، شرارتیں اور غلطیاں وہ اپنے دامن میں چھپاتے رہے اور میری بے فکری اس چھتری تلے پروان چڑھتی رہی۔

مجھے اپنے گھر سے زیادہ دور تک کے راستوں سے آگاہی نہ تھی۔ صرف اتنا یاد ہے کہ دوموریہ پل کی طرف سے مصری شاہ کی طرف آتے ہوئے سڑک پر بائیں جانب ایک بڑا سا احاطہ تھا جس میں کوئی ورکشاپ تھی۔ اس سے ذرا سا آگے ایک سفید رنگ کی مسجد تھی جس کا لاؤڈ سپیکر اذان اور نماز کے اوقات کے علاوہ بھی خاصا مصروف رہتا تھا۔ اس مسجد سے آگے بڑھتے ہی ایک گلی اچانک جُل دے کر دائیں جانب مڑ جاتی تھی اور اسی طرف ہمارا گھر تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے والی گلی خاصی کشادہ اور بڑی تھی لیکن جب میں 1982 میں دوبارہ اسی گلی میں آیا تو وہ اب مجھے بہت چھوٹی دکھائی دے رہی تھی۔ ہمارے گھر سے نکلنے کے بعد بائیں جانب ایک گلی تھی۔ اس کے بعد کے نقوش پر اب دھند چھائی ہوئی ہے لیکن ان راستوں کے بعد ایک سڑک پر پہنچتے ہی یہ دھند چھٹ جاتی ہے۔ وہ سڑک مجھے اکیلے پار کرنے کی اجازت نہ تھی اور ابا جی یا بھائی جان ہمیشہ میری انگلی تھام کر مجھے وہ سڑک عبور کروایا کرتے تھے جبکہ میری ہمیشہ یہی خواہش اور کوشش ہوتی کہ میں خود سے، کسی کی مدد کے بغیر سڑک عبور کروں۔ اس کوشش میں ایک آدھ دفعہ کامیاب بھی رہا لیکن ڈانٹ کھانے کے باعث میری خوشی اکارت ہو گئی۔ اس سڑک کے اس پار ایک دودھ والے کی دکان تھی۔ دودھ والا ایک لمبی سی ڈنڈی والے ”پوے“ کو اپنے سامنے ابلتے ہوئے دودھ کی کڑاہی میں ڈبوتا اور پھر پوا ابھر کر ایک مخصوص بلندی تک لے جاتا اور وہیں سے دودھ کو ایک دھار کی صورت میں دوبارہ کڑاہی میں انڈیل دیتا۔ ہم دونوں بھائی اکثر گردوپیش سے غافل، مبہوت ہو کر یہ دلکش منظر دیکھتے رہتے اور ہماری معصوم حیرت اس وقت مرتعش ہوتی

جب دودھ والا اپنی پاٹ دار آواز میں بولتا "جی میرلٹر" اور ہم اپنے ہاتھ میں تھاما ہوا ڈول ایک میکانکی انداز میں آگے بڑھا دیتے ۔

ایک اور دھندلی سی یاد ذہن کے پردے پر سرک رہی ہے ۔ ہمارے گھر کے پچھلی طرف ایک خالی پلاٹ تھا جس میں ایک دفعہ دو اونچے بانسوں پر قدم جمائے ایک شخص مختلف سمتوں میں چل رہا تھا ۔ جیسے ہی وہ میری سمت بڑھتا، میں سہم کر اپنے بھائی کی گود میں دبک جاتا ۔ یہ تماشا دیکھنے کے لیے اکٹھا ہونے والا ہجوم اس کے لیے تالیاں بجاتا اور اس کا ساتھی تماشائیوں سے سکے وصول کرتا جاتا ۔ یہ منظر کئی دن بعد بھی میرے ذہن پر نقش رہا اور میں ہر رات سونے سے قبل اس گتھی کو سلجھانے کی ناکام کوشش کرتا حتیٰ کہ نیند کی دیوی مجھے تھپک تھپک کر سلا دیتی ۔

بیچ کی کڑیاں کہیں غائب ہوگئیں ۔ میرے ذہن پر بننے والا اگلا نقش چکوال کی خوبصورت سرزمین کا تھا ۔ ابّا جی گورنمنٹ کالج چکوال میں اسلامیات پڑھانے کے لیے تعینات ہوئے تھے ۔ چکوال میں ہمارا گھر کافی بڑا تھا ۔ یہ ہندوؤں کے زمانے کا تعمیر کردہ ایک کشادہ دومنزلہ مکان تھا جس کی تعمیر میں سرمئی رنگ کے پتھر کا فراخدلانہ استعمال ہوا تھا ۔ آج جب میں صحرا کی ریت چھان رہا ہوں تو مجھے اس گھر کے سرمئی رنگ کے پتھر بہت یاد آتے ہیں ۔ نچلی منزل پر غالباً ایک بیٹھک اور تین مزید کمرے تھے، درمیان میں ایک بڑا سا صحن تھا جو مجھے اس لیے بھی پسند تھا کہ میری اچھل کود کے لیے وافر جگہ تھی ۔ صحن کی تین اطراف میں کمرے تھے ۔ بالائی منزل پر بھی دو یا تین کمرے تھے ۔ اس گھر میں سب سے پرکشش جگہ اس کی چھت تھی جس کی دونوں جانب چوبارے بنے ہوئے تھے جہاں سے باہر کی دنیا کا نظارہ کیا جا سکتا تھا ۔ ہم دونوں بھائیوں کو سڑک کی جانب بنا ہوا چوبارہ زیادہ پسند تھا اور ہم اکثر وہیں دیوار کے اوپر سے باہر جھانکتے رہتے ۔ یہ سڑک جہلم کو جاتی تھی اور اس زمانے میں دو ٹرانسپورٹ کمپنیاں چکوال اور جہلم کے مابین بسیں چلایا کرتی تھیں ۔ ایک تو سرکاری کمپنی جی ٹی ایس تھی اور دوسری نیو جہلم ٹرانسپورٹ تھی ۔ ان کے مالک تو جانے کون تھے مگر ہم دونوں بھائیوں نے ان کو اپنی ملکیت میں لے رکھا تھا ۔ نیو جہلم ٹرانسپورٹ کی گزرنے والی ہر بس میری ملکیت ہوتی اور جی ٹی ایس کی ہر بس پر میرے بھائی کی اجارہ داری تھی ۔ ہمارا سارا وقت اسی تقابل پر گزر جاتا کہ کس کی بسیں سڑک سے زیادہ گزری ہیں ۔ اس ملکیتی بحث میں اکثر بات بڑھ جاتی اور جھگڑا امی جی کی عدالت میں پہنچ جاتا ۔ میں عموماً ہاری وکیل ثابت ہوتا اور اپنا موقف غلط ہونے کے باوجود فیصلہ اس وقت تک تسلیم نہ کرتا جب تک میزان کا پلڑا میرے حق میں جھک نہ جاتا ۔ بھائی جان ہر بار مجھے ''کمینہ'' کہ کر اپنا غبار نکال لیتے اور یوں ہار مان کر کسی اور کام میں مشغول ہو جاتے جب کہ میرا ہنوز یہی اصرار ہوتا کہ بسوں کی گنتی جاری رکھی جائے ۔

قدرت نے ہمیں بہن کی نعمت سے محروم رکھا تھا۔ ہم جب بھی اپنے دوستوں یا اپنے کزنز کو دیکھتے اور ان سے بہنوں کا ذکر سنتے تو ایک عجیب سی بے کلی ہوتی اور احساسِ محرومی شدت اختیار کر لیتا۔ ہم دونوں بھائی جب رات کو سونے کے لیے بستر پر لیٹتے تو ہمارا معصوم آئیڈیزم جوبن پر پہنچ جاتا۔ ہم آپس میں اس تصور پر گفتگو کیا کرتے کہ ابھی دروازے پر دستک ہو اور جب ہم دروازہ کھولیں تو ہماری ایک بڑی اور ایک چھوٹی بہن دروازے پر کھڑی ہوں اور ہم یکدم دو بھائیوں سے چار بہن بھائی بن جائیں۔ میں نے بہت سی راتیں ایسے خواب دیکھتے گزار دیں مگر ان خوابوں کو کبھی تعبیر نہ مل سکی۔ خالقِ کائنات نے میرے اس خواب کو یاد رکھا اور اس کے کئی برس بعد مجھے دو بیٹیوں اور دو بیٹوں سے نواز کر اس خواب کو ایک نئی تعبیر دے دی۔

ہمارے ساتھ والے گھر میں ایک وکیل صاحب رہتے تھے۔ ان کی اہلیہ نے اس میں ایک کنڈرگارٹن سکول کھول رکھا تھا۔ مجھ سے بالا بالا گھر میں ایک دن یہ فیصلہ ہو گیا کہ مجھے اس سکول میں داخل کروا دیا جائے۔ ایک صبح مجھے نیکر شرٹ، ٹائی اور سیاہ رنگ کی لمبی جرابوں کے ساتھ نئے چمکتے ہوئے سیاہ رنگ کے جوتے پہنا کر تیار کیا گیا۔ میں اس بات پر خوش تھا کہ یقیناً کہیں جانے کی تیاری ہے۔ امی جی نے گھر میں کام کرنے والی ماسی کو ساتھ لیا۔ مجھے گود میں اٹھایا اور سکول پہنچ گئیں۔ میں "آنٹی" کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کیونکہ جب کبھی ہماری گیند ان کی چھت پر گرتی تھی تو آنٹی اپنی چھت نیچی ہونے کے باوجود کئی کوششوں کے بعد گیند واپس ہماری طرف پھینک دیا کرتی تھیں۔ وہ ایک باوقار اور خوش لباس خاتون تھیں اور امی جی کے ساتھ ان کی خاصی دوستی تھی۔ ہم کچھ دیر ان کے دفتر میں بیٹھے رہے۔ میں دفتر میں موجود نئی اور مختلف چیزوں کو دیکھنے اور چھیڑنے میں مگن تھا اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی کہ کس لمحے امی جی وہاں سے جا چکی تھیں۔ یہ سب ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہو رہا تھا۔ میں نے ابھی رونے کے لیے چہرے کے عضلات کو تیار ہی کیا تھا کہ آنٹی نے لپک کر مجھے گود میں اٹھا لیا اور اپنے دفتر میں موجود تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال ہونے والے کھلونوں کو میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں تھوڑی دیر کو سب بھول گیا۔ آنٹی اسی طرح مجھے اٹھائے ایک کمرے میں آ گئیں جہاں مختلف میزوں اور کرسیوں پر میری عمر کے کچھ بچے بیٹھے تھے اور ایک جواں سال ٹیچر کتاب ہاتھ میں تھامے بچوں کو پڑھا رہی تھیں۔ آنٹی نے مجھے سب سے آگے والی نشست پر بٹھا دیا اور خوبصورت تصویروں سے مزیّن انگلش کی ایک کتاب میرے سامنے میز پر رکھ دی۔ اس کے علاوہ ایک کاپی بھی تھما دی جو کسی قسم کی لکیروں سے پاک تھی۔ میں حیرت، جھجک مگر دلچسپی کے ساتھ یہ تمام مناظر دیکھتا جا رہا تھا اور ابھی کسی بھی چیز کو ہاتھ لگانے سے احتراز کر رہا تھا کہ مختلف رنگوں والے کرےاونز میری دسترس میں آ گئے۔ کرےاونز نے مجھے گرد و پیش سے تھوڑی دیر کو بے نیاز کر دیا اور میں باری باری مختلف رنگوں کو کاپی کے مختلف صفحات پر آزمانے لگا۔ میری ٹیچر نے کاپی یوں

خراب کرتے دیکھ کر مجھے ٹوکنا چاہا مگر آنٹی نے آگے بڑھ کر انہیں روک دیا اور میرے ساتھ کاپی پر دیگر کرے اونز کے ساتھ رنگ بکھیرنے لگیں۔ میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور انہوں نے میری جانب ایک شفیق مسکراہٹ اچھالی۔ کرے اونز کے رنگ سارے کمرے میں بکھر گئے۔ ہم دوست بن چکے تھے۔

ہمارے گھر میں کام کرنے والی ماسی ایک نیک دل بزرگ خاتون تھی۔ دراز قد، دُبلی پتلی اور نرم گفتار۔ محنت اور تندہی سے کام کرنے والی اور ہر کسی سے خوش دلی سے پیش آنے والی ماسی گویا ہمارے گھر کا ایک فرد تھی جسے گھر کی بھلائی گھر کے تمام افراد کی طرح عزیز ہوتی تھی۔ وہ بھی ہر معاملے میں مشورہ دینا اپنا فرض سمجھتی تھی اور اس کی رائے کو توجہ سے سنا بھی جاتا تھا۔ ماسی مجھ سے بہت پیار کرتی تھی اور مجھے "ماڑی بلّو" کہ کر مخاطب کیا کرتی تھی۔ جانے میں کس طرح اسے ایک بلی کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ بھائی جان اکثر مجھ سے اس طرح اپنے تمام اگلے پچھلے حساب چکایا کرتے تھے۔ مجھے کہا کرتے کہ میری شکل بلی سے ملتی ہے اسی لیے ماسی مجھے "بلّو" کہتی ہے۔ اور میں اس بات سے بہت چڑتا۔ کبھی کبھار تنہائی میں آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے چہرے کا جائزہ بھی لیا کرتا آیا کسی طرح میں بلی سے مشابہت رکھتا ہوں مگر مجھے بھائی جان اور ماسی سے کبھی اتفاق نہ ہو سکا۔ جب تک ہم چکوال رہے، ماسی ہمارے ہاں کام کرتی رہی اور مجھے "ماڑی بلّو" کہ کر ہی پکارتی رہی۔ میرے کانوں کو آج بھی اس مہربان آواز کا لمس محسوس ہوتا ہے۔ اس بوڑھے سراپے کی شبیہ اسی طرح نظروں میں تیرتی ہے اور وہ آج بھی اپنی آنکھوں سے محبت کے چھینٹے اڑاتی اور ماحول کو بھگوتی محسوس ہوتی ہے۔

سکول میں پہلے دن کا تو مجھے احساس ہی نہ ہوا۔ گھر والے خوش تھے کہ میں نے سکول کو قبول کر لیا تھا۔ سارے گھر والے تمام دن حیلے بہانوں سے میرے سامنے سکول کے خوش کن تصورات کو اجاگر کرتے رہے اور میں اپنی معصوم دنیا میں مگن ان کے اصرار پر ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ اگلی صبح جب مجھے سکول کے لیے تیار کیا جانے لگا تو میں بگڑ گیا۔ امّی جی نے بڑی مشکل سے تیار کیا مگر جب ماسی مجھے لے جانے کے لیے اٹھانے لگے تو میں نے باقاعدہ مزاحمت شروع کر دی۔ خوب ہاتھ پاؤں چلائے اور ماسی بیچاری ان کی زد میں آتی رہی۔ وہ ماڑی بلّو، ماڑی بلّو کہتی جاتی اور میں مزید مزاحمت کرتا جاتا۔ امی جی آخر کار خود تیار ہوئیں۔ دونوں نے مجھے کسی طرح قابو کیا اور سکول کی طرف روانہ ہو گئیں۔ امی جی نے سکول پہنچتے ہی آنٹی سے میری شکایت کی اور بتایا کہ کن مشکلوں سے سکول لائی ہیں۔ آنٹی کے چہرے کا وہ بناوٹی غصہ مجھے آج بھی یاد ہے جو ان کے شفیق چہرے پر بالکل بھی جچ نہیں رہا تھا۔ آنٹی نے اپنی میز کی دراز سے چاکلیٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور بولیں، "ٹھیک ہے اگر سلمان سکول نہیں آنا چاہتا تو یہ چاکلیٹ میں کسی ایسے بچے کو دے دوں گی جو خوشی سے سکول آئے گا اور دل لگا کر پڑھے گا۔" آنٹی نے مجھے بہت بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ میں سکول جانے سے انکار کر چکا تھا سو اَنا کا مسئلہ

اپنی جگہ تھا اور اب ایک قدم کے فاصلے پر دیدہ زیب ریپرز میں ملفوف چاکلیٹ تھے۔ آنٹی نے چاکلیٹ میرے آگے کر کے مجھ سے میرا آخری فیصلہ جاننا چاہا لیکن تب تک میں ان کے ہاتھ سے چاکلیٹ اُچک چکا تھا اور یوں سکول سے میرا مستقل رشتہ استوار ہو گیا۔

سردیوں میں ہماری کلاس سکول کی کھلی چھت پر منتقل ہو جاتی تھی۔ ایک دن کلاس حسبِ معمول جاری تھی اور میرا دھیان حسبِ معمول اردگرد کے مناظر میں تھا کہ اچانک کہیں سے غالباً روئی کا ایک سفید سا ریشہ اڑتا ہوا کہیں سے آیا اور میرے سامنے سے گزرا۔ ہم سب بچے اسے "مائی بڈھی" کہا کرتے تھے۔ میں بھول گیا کہ میں کلاس میں بیٹھا ہوں اور مائی بڈھی کو پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگ کھڑا ہوا۔ میری ٹیچر مجھے واپس بلاتی رہیں لیکن میں اس وقت گرد و پیش سے مکمل طور پر غافل تھا۔ اس وقت میری زندگی کا واحد مقصد مائی بڈھی کو پکڑنا تھا جو کبھی ہوا کے ساتھ اوپر اور کبھی نیچے اڑتی جا رہی تھی۔ آخر کار میں کامیاب ہو گیا اور اسے اپنی مٹھی میں پکڑ لینے کے بعد باقی دنیا کی طرف مائل ہوا۔ میری ٹیچر ناراض تھیں۔ پہلے انہوں نے مجھ سے بلانے پر بھی واپس نہ پلٹنے کی وجہ دریافت کی۔ میرے پاس کوئی جواب نہ تھا اور میں خاموش کھڑا ہو گیا۔ مجھے اس وقت صرف اس بات کی خوشی تھی کہ میں مائی بڈھی کو پکڑنے میں کامیاب رہا تھا۔ ٹیچر نے میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر مجھے سزا سنادی کہ کونے میں جا کر کان پکڑ لوں۔ میں نے دائیں بائیں دونوں کانوں کو اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ ٹیچر نے بلند آواز سے کہا "اس طرح نہیں، دوسری طرح"۔ درحقیقت وہ چاہتی تھیں کہ میں مرغا بن جاؤں اور میں تب تک سزا کے اس استھان سے ناواقف تھا۔ ٹیچر کے دوسری طرح کہنے کا مطلب مجھے سمجھ نہ آیا اور میں نے دائیں ہاتھ سے بایاں اور بائیں ہاتھ سے دایاں کان پکڑ لیا۔ ٹیچر کو ہنسی آ گئی اور بولیں، "چلو واپس آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاؤ"۔ میں واپس آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا اور دوبارہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تمام بچے اور ٹیچر میری طرف دیکھ رہے تھے مگر مجھے اس کا بالکل بھی احساس تھا نہ پرواہ۔ ٹیچر نے میری طرف سے مایوس ہو کر باقی بچوں سے کہا "چلو آپ لوگ تو پڑھو"۔ سارے بچے مل کر کورس کے انداز میں پڑھنے لگے "ٹونکل ٹونکل لٹل سٹار۔۔۔ ہاؤ آئی ونڈر واٹ یو آر" اور میں منہ اٹھا کر آسمان پر ان لٹل سٹارز کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا جن کا اس وقت کہیں وجود نہیں تھا۔ سورج کی چندھیا دینے والی روشنی سے تنگ آ کر میں نے یہ کوشش ترک کر دی اور وہ ستارے زمین پر تلاش کرنے لگا۔

میں اکثر اپنی کتابیں، کاپیاں اور پنسلیں گم کر دیا کرتا تھا۔ وجہ صرف اور صرف لاپرواہی تھی۔ اپنی چیزوں کو سنبھال کر رکھنے کی کبھی عادت ہی نہیں پڑی یا شاید یہ بھی میرے مزاج کا حصہ تھا۔ مجھے سکول میں پڑھتے یا کم از کم سکول جاتے ہوئے کچھ دن ہو چکے تھے اور کتابیں گم کرنے کا وہی عالم تھا۔ ایک روز ہماری ٹیچر کئی بچوں کی

کتابیں نہ ہونے کی وجہ سے بہت غصّے میں تھیں ۔ انہوں نے زور زور سے چلا کر حکم دیا کہ جن بچوں کے پاس کتابیں نہیں وہ اپنی سیٹوں پر کھڑے ہو جائیں ۔ میں سب سے آگے والی نشست پر تھا اور وہیں کھڑا ہو گیا ۔ ٹیچر نے آخری نشست سے ہر کھڑے ہوئے بچے کو ایک ایک کرارا تھپڑ مارنا شروع کیا ۔ سکول میں مار کا عموماً تصور نہیں تھا اور میرے لیے یہ منظر خاصا روح فرسا تھا ۔ میں اس قدر خوفزدہ ہو چکا تھا کہ جب ٹیچر مجھ تک پہنچیں تو اچانک میری نیکر سے ٹپ ٹپ کسی چیز کے ٹپکنے کی آواز آئی ۔ میری ٹیچر اچھل کر پیچھے ہٹ گئیں ۔ میرے گھر سے ماسی کو بلایا گیا اور اس کے ساتھ مجھے اسی وقت گھر بھیج دیا گیا ۔ گھر پہنچ کر مجھے دو باتوں کی خوشی ہوئی ۔ ایک جلدی گھر آنے کی اور دوسرے پٹائی سے بچ جانے کی ۔ کئی سال گزرنے کے بعد جب میں گورنمنٹ کالج چکوال کے ایک بین الکلیاتی مشاعرے کے مقابلے میں شرکت کے لیے پہنچا تو اپنا سکول دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی ۔ اب وہ کمرہ سکول کا حصہ نہیں رہا تھا یا سکول ہی ختم ہو چکا تھا تاہم میرے اس کلاس روم کے باہر ایک بورڈ لگا تھا، ’’محکمہ آب پاشی، چکوال ۔‘‘

گورنمنٹ کالج چکوال ایک وسیع رقبے پر محیط تھا ۔ کالج کے لان کی روشیں مختلف رنگوں کے پھولوں سے سجی ہوتیں اور میرا اکثر جی چاہتا کہ میں اپنی پسند کے پھول ہاتھ بڑھا کر توڑ لوں مگر ابا جی ہمیشہ پھول توڑنے سے منع کرتے اور کہا کرتے کہ پھول شاخوں پر ہی رہنے چاہئیں ۔ ان کو صرف دیکھنا چاہیے ۔ مجھے اس بات کی کبھی سمجھ نہ آتی اور میں ناخوش سا ہو کر کسی اور طرف متوجہ ہو جاتا ۔ میں کبھی کبھار ضد کر کے ابا جی کے ساتھ کالج چلا جاتا ۔ دیگر پروفیسر حضرات مجھ سے پیار کرتے، کیفے ٹیریا سے میرے لیے چیزیں منگواتے اور میں خود کو بہت اہم شخصیت سمجھنے لگتا ۔ جب پروفیسرز سیاہ گاؤن پہنے دیوتاؤں جیسے وقار کے ساتھ سٹاف روم میں داخل ہوتے تو مجھے وہ بہت پرکشش لگتے اور میں مبہوت ہو کر انہیں دیکھتا رہتا ۔ میرا جی چاہتا کہ میں بھی جلدی سے پروفیسر بن جاؤں اور گاؤن پہن کر پینٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سٹاف روم میں داخل ہوں ۔ میرے لیے چپڑاسی چائے لائے اور میں کبھی کسی کتاب کی ورق گردانی کروں اور کبھی خلا میں گھورتا رہوں ۔ مجھے لگتا یہ دنیا کا سب سے خوبصورت کام ہے ۔ آتے جاتے طلبا السلام علیکم سر کہتے اور پروفیسر صاحبان گردن کو خفیف سا خم دے کر، لبوں پر دلآویز سا تبسم سجائے، وعلیکم السلام اچھالتے آگے بڑھ جاتے ۔ شاید میں تبھی اس طلسم کدے میں کہیں کھو گیا تھا اور غیر شعوری طور پر انہی دنوں پروفیسر بن گیا تھا ۔

کالج کا سالانہ ہفتہ تقریبات چل رہا تھا ۔ دیگر سرگرمیوں کے ساتھ سٹاف کے بچوں کی دوڑ کا مقابلہ بھی منعقد کروایا گیا ۔ مقررہ وقت پر سب بچوں کو ان کی عمروں کے اعتبار سے مناسب فاصلے پر کھڑا کیا گیا ۔ مجھے عمر میں سب سے چھوٹا ہونے کے باعث سب سے آگے کھڑا کیا گیا ۔ دوڑ کے آغاز کا اعلان کرنے کے لیے ایک

کھلونا پستول سے فائر کیا گیا جس سے میں خوفزدہ ہو گیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب بچے آگے کی طرف دوڑے اور میں اپنے ابا جی کی طرف دوڑ پڑا۔ یہ منظر دیکھ کر ہر طرف سے قہقہے گونجنے لگے۔ میں کھسیانا سا ہو گیا۔ ڈی پی صاحب نے مجھے گود میں اٹھایا اور ٹریک پہ لے جا کر کھڑا کر دیا۔ مجھے خوب دلاسا دینے کے بعد دوڑ کا نئے سرے سے آغاز کیا گیا۔ اس بار پستول سے فائر کرنے کی بجائے ایک دو تین سے کام چلایا گیا۔ میں دوڑا تو اپنی منزل کی جانب ہی مگر میری عمر کی کم مائیگی میری رفتار کو بڑھانے میں ناکام رہی۔ کالج کے پرنسپل سلطان بخش صاحب نے مجھے آ کر اٹھا لیا اور ٹافیوں کا ایک بڑا سا پیکٹ میرے چھوٹے سے ہاتھوں میں تھما دیا۔ میری تالیفِ قلب کے لیے یہ سامان کافی تھا۔ میں ٹافیوں کا پیکٹ تھامے ابا جی کی طرف لپکا اور ان کے کندھوں پہ سوار ہو گیا۔ خوش رنگ ٹافیوں کے پیکٹ نے میرے تمام خوف، میری تمام خجالت کا یکسر خاتمہ کر دیا تھا اور میں اس وقت کالج، اس کی روشوں، طلبہ، اساتذہ اور ارد گرد وقوع پذیر ہونے والے تمام واقعات سے مکمل طور پہ غافل تھا۔ میری توجہ کا مرکز صرف وہ ٹافیوں کا پیکٹ تھا جس کو میں جلد از جلد کھولنا چاہتا تھا مگر مجھے اندیشہ تھا کہ سرِ عام پیکٹ کھولنے سے شاید بہت سے لوگوں کو اس میں حصہ دار بنانا پڑے۔ بالآخر تقریب کے جھمیلے ختم ہوئے اور میں نے گھر پہنچتے ہی ٹافیوں کے پیکٹ کو کھول لیا۔

ٹافیوں کے ساتھ وابستہ انہی دنوں کا ایک ایسا واقعہ بھی ہے جو آج بھی یاد آنے پر میرے دل کو مسل دیتا ہے۔ ایک دفعہ میں ابا جی کے ساتھ کہیں باہر گیا اور حسبِ معمول ٹافیاں لے کر گھر آیا۔ بھائی جان کے لیے ان کی پسندیدہ کوئی اور چیز تھی جو اب مجھے یاد نہیں۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ انہوں نے مجھ سے وہ چیز بانٹ کر کھائی۔ جواباً میں نے بھی خیر سگالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں کمال فیاضی سے ایک عدد ٹافی عنایت کر دی۔ بھائی جان کی ہمیشہ سے یہ عادت تھی کہ وہ چیزوں کو وقتی طور پہ سنبھال کر رکھ لیتے تھے اور بعد میں ان کو اپنی سہولت اور اہتمام سے استعمال کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے ہر ماہ ہم دونوں بھائیوں کو پاکٹ منی ملتی۔ میرے حصے کی پاکٹ منی عموماً ایک آدھ دن میں اختتام پذیر ہو جاتی اور بھائی جان اسے کسی اور دن پہ اٹھا رکھتے اور وہ کوئی اور دن تب آتا جب میں بھی اس میں شریک ہو جاتا۔ جس وقت میں نے بھائی جان کو ٹافی دی، وہ امی جی کے ساتھ ڈرائنگ روم کے فرنیچر کی سیٹنگ تبدیل کروا رہے تھے۔ انہوں نے میری عطا کردہ ٹافی جیب میں رکھ لی اور کام میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں بھائیوں میں کسی بات پہ لڑائی ہو گئی۔ جب بات زیادہ بڑھی تو میں نے اپنی دی ہوئی ٹافی واپس مانگ لی۔ بھائی جان نے جیب سے وہ ٹافی نکالی اور مجھے تھما دی۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر ریپر کھولا اور اسے منہ میں ڈال لیا۔ جب میں ٹافی کھا چکا تو مجھے اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ مجھے آج بھی وہ کیفیت بخوبی یاد ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میرا دل بیٹھ رہا ہے اور کوئی

میری آنکھوں میں دھواں بھر رہا ہے۔ لیکن وقت گزر چکا تھا۔ وہ احساس ایک پھانس بن کر ہمیشہ میرے سینے میں زندہ رہا ہے۔

عید کا دن تھا۔ ہم دونوں بھائی نئے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ ابا جی نے ہم دونوں کو سرپرائز دیتے ہوئے نئی گھڑیاں عید کے تحفے کے طور پر دیں۔ ہماری خوشی دیدنی تھی۔ ہم گھڑیاں اپنی اپنی کلائی پر باندھ کر اترا رہے تھے اور بار بار وقت دیکھ رہے تھے۔ امی جی نے ہمیں تیار کیا اور ہم سب باہر گھومنے کے لیے نکلے۔ میرے بال گھنگریالے تھے۔ امی جی ہمیشہ میرے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے ایک منفرد سٹائل بناتی تھیں۔ میرے بالوں میں دائیں اور بائیں دو پف بناتیں۔ میرے گھنگریالے بال ان میں کہیں جھولتے رہتے۔ امی جی کی خواہش تھی کہ ہم دونوں بھائیوں کی تصویر کھنچوائی جائے۔ ہمارے گھر سے نکل کر دائیں جانب ایک گلی سیدھی بازار میں جا نکلتی تھی۔ غالباً اس کا نام چھبڑ بازار تھا۔ سردیوں کی مہربان، نرم اور گلابی رنگت والی دھوپ پورے بازار میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہمارے اندر کا موسم باہر کی اس دلآویزی سے ہم رنگ تھا۔ صاف نیلے آسمان تلے میں خوشی کو پور پور میں محسوس کر رہا تھا۔ اسی کیف آگیں کیفیت میں ہم ایک فوٹو سٹوڈیو پہنچے۔ نیچے والی منزل صرف پبلک ڈیلنگ کے لیے مخصوص تھی۔ تصویر کھینچنے کے لیے لکڑی کی سیڑھیوں کے ذریعے اوپر سٹوڈیو میں لے جایا گیا۔ ہمیں ایک بنچ پر بٹھا دیا گیا جس کے عقب میں ایک بھاری پردہ تھا۔ جب تصویر کھینچنے کا مرحلہ آیا تو ہمیں مسکرانے کو کہا گیا۔ مجھے اچانک یاد آیا کہ میں نے تو گھڑی باندھی ہوئی ہے اور وہ نظر نہیں آ رہی۔ میں مسکرانا بھول کر گھڑی سامنے کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ بھائی جان نے ہاف سویٹر پہنا ہوا تھا سو قمیض کے کف ہٹانے سے ان کی گھڑی تو واضح نظر آنے لگی۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں نے ہائی نیک سویٹر پہن رکھا تھا اور اس کے لمبے بازو بار بار میری گھڑی کو چھپا لیتے تھے۔ میں پوری یکسوئی کے ساتھ سویٹر کے بازو پیچھے کر کے گھڑی کو اس پوزیشن میں لانے کی کوشش میں مصروف تھا مگر جیسے ہی تصویر بنانے کا وقت آتا تو سویٹر پھر گھڑی کے اوپر آ جاتا اور میں پھر سے گھڑی کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ فوٹو گرافر نے میری مشکل کو آسان بنانے کے لیے آگے بڑھ کر سویٹر میری گھڑی کے ساتھ اٹکا دیا۔ میں نے فوٹو گرافر کی طرف تشکر آمیز نظر ڈالی۔ اس نے میرا گال تھپتھپاتے ہوئے مجھے حرکت نہ کرنے اور مسکراتے ہوئے کیمرے کی طرف دیکھنے کی ہدایت کی۔ بالآخر تصویر بن گئی۔ وہ یادگار تصویر آج بھی میرے پاس محفوظ ہے اور میرے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھیر دیتی ہے۔

ہمارے ہاں کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔ سب کا کلر کہار جانے کا پروگرام بنا۔ روانگی سے ایک رات قبل کھانے تیار کیے گئے۔ مجھے ان تیاریوں کی گہما گہمی بہت بھلی لگ رہی تھی اور رات دیر تک میرا سونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اگلی صبح سب ایک بڑی گاڑی میں سوار ہو کر منزلِ مقصود کی جانب روانہ ہوئے۔ جب ہم کلر کہار کے

مضافات میں پہنچے تو پھل دار درختوں کے گہرے سائے بہت دل نواز محسوس ہونے لگے۔ کئی جگہوں سے گزرتے ہوئے تو لوکاٹ اور خوبانی سے بوجھل شاخیں ہماری دسترس میں تھیں۔ مجھے جنت کے بارے میں وہ تمام کہانیاں یاد آنے لگیں جو امی جی اکثر اوقات سونے سے پہلے مجھے سنایا کرتی تھیں۔ مجھے ان تمام کہانیوں میں سب سے زیادہ دلکش وہ حصے لگتے تھے جن میں رس ٹپکاتے ہوئے پھلوں سے جھکی ہوئی شاخوں کا ذکر ہوتا۔ جب میں نے اپنے ہاتھ کی پہنچ میں انہی کہانیوں جیسے پھل دیکھے تو مجھے لگا کہ شاید میں جنت میں پہنچ گیا ہوں۔ مگر ابا جی اور امی جی کی مسلسل اور کڑی نگرانی کے باعث میری وہ جنت مجھ سے دور ہی رہی۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ وہاں ہمارے قیام کے دوران بہت سے پھل کھانے کو مل گئے اور جب ہم واپس آنے لگے تو لوکاٹ اور خوبانی کے کچھ کریٹ ہمارے ہمراہ تھے۔ آخر کار ہم کلر کہار کے ریسٹ ہاؤس پہنچے۔ کچھ دیر رکنے کے بعد ہم باہر سیر کے لیے نکلے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار مور دیکھے۔ انہیں ناچتے دیکھا، ان کی آوازیں سنیں۔ میرے لیے مور کے پھیلے ہوئے پنکھ اور ان پر بنے ہوئے خوشنما رنگ بہت دلچسپی کا باعث تھے۔ میں بہت دیر تک فطرت کی اس بے حجابی میں کھویا رہا۔ ہماری اور بھی سرگرمیاں رہی ہوں گی مگر وہ میرے ذہن سے محو ہو چکی ہیں اور میرے تصور کی آنکھ کے سامنے آج بھی وہی خوبصورت مور ناچ رہے ہیں۔

گرمیوں کی دوپہروں میں ہم دونوں بھائی جانگیے پہن کر باتھ روم میں گھس جاتے۔ پانی کی ٹوٹی کھول دیتے اور ٹھنڈے پانی کی فراخ دل دھار ٹب کو لبا لب بھرتی رہتی۔ ٹب سے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اڑتے اور ہمارے بدن اس ٹھنڈک سے سرشار ہوتے رہتے۔ ایسے میں لاہور کے مصری شاہ کے دودھ والے کا "پوے" کو کڑاہی میں ڈال کر دودھ بھرنے، اسے اوپر اٹھانے اور ایک مخصوص بلندی تک لے جا کر ایک دلکش دھار کی صورت میں پھر سے کڑاہی میں منتقل کرنے کا منظر ہمارے تصور میں زندہ ہو جاتا۔ ہمارا وہ رومانس جاگ جاتا اور ہم اپنا اپنا مگ لے کر پانی میں ڈبوتے اور پانی کو دودھ مان کر اس کی دھار بناتے۔ اپنے تئیں ایک دوسرے کو دودھ بیچتے اور کنکریوں کو پیسوں کی شکل دے کر باقاعدہ حساب رکھتے۔ میرا حساب ہمیشہ سے کمزور رہا ہے۔ میں اکثر غلطی کر جاتا اور دودھ کے اس کاروبار میں گھاٹے کا شکار ہو جاتا۔ مال کی یہ آزمائش ہمارے لیے کٹھن ثابت ہوتی۔ اکثر ہم آپس میں الجھ پڑتے اور کئی بار صرف دودھ کا نامکمل کاروبار ہی ہوتا اور ہم نہائے بغیر ہی باتھ روم سے باہر آ جاتے۔ امی جی کو پہلے سے ہی ہمارے جھگڑے کا علم ہوتا۔ ہم دونوں اپنا اپنا مقدمہ بھرپور انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتے اور امی جی "اچھا اچھا" کہتے ہم دونوں کا بازوؤں سے پکڑ کر واپس باتھ روم لے جاتیں اور ہمیں ٹھیک سے نہلا کر اور تولیوں میں لپیٹ کر باہر نکالتیں۔ باتھ روم سے باہر نکلنے تک ٹھنڈے پانی کی دھار میں ہمارا جھگڑا کہیں بہہ چکا ہوتا۔

میری زندگی کا اگلا پڑاؤ کمالیہ میں تھا جب ابا جی کی تعیناتی پریم ستی ٹرسٹ کالج کمالیہ میں ہوئی۔ تب کمالیہ ضلع لائلپور کا حصہ ہوا کرتا تھا اور لائلپور نے ابھی فیصل آباد کا چولا نہیں پہنا تھا۔ یہ ایک گرد آلود قصبہ تھا جس کی گلیوں میں اتنی مٹی تھی کہ امی جی کا سارا دن گھر کے اندر در آنے والی مٹی کو ہر چیز سے صاف کرنے پر گزرتا تھا۔ امی جی کی صفائی پسند طبیعت کو کمالیہ کی یہ حرکت بہت ناپسند تھی اور اسی لیے وہ ابا جی کے کمالیہ آنے کے فیصلے سے زیادہ خوش نہیں تھیں۔ کمالیہ میں کوئی کنڈرگارٹن سکول نہیں تھا لہٰذا مجھے اور بھائی جان کو ایک گورنمنٹ سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ یہ سکول ہمارے گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا مگر ہمیں کچھ فاصلہ سڑک کے ساتھ پیدل طے کرنا پڑتا۔ بھائی جان خود سڑک کی جانب چلتے اور مجھے ٹریفک سے بچانے کی خاطر اپنی داہنی سمت رکھتے۔ مجھے یہ بات اپنی خود اعتمادی پر کاری ضرب محسوس ہوتی اور کئی بار میرا جی چاہتا کہ میں بھی بڑا بن کر سڑک پر رواں دواں ٹریفک کے قریب سے بلا جھجک گزروں اور کوئی روک ٹوک نہ ہو مگر سڑک کا کنارا میرے لیے ہمیشہ شجرِ ممنوعہ ہی رہا۔

یہ سکول رقبے کے اعتبار سے چکوال کے سکول کی نسبت منا کو کے مقابلے میں روس کی حیثیت رکھتا تھا۔ بڑے بڑے کھیل کے میدان، بڑے کلاس رومز اور بچوں کی کثیر تعداد۔ جب پہلے دن سکول کا وقت ختم ہوا اور بچے اندھا دھند باہر کی طرف بھاگے تو میں گھبرا گیا اور کلاس روم کے باہر کھڑا ہو کر منہ کھولے زور زور سے رونے لگا۔ مجھے لگا میں کھو گیا ہوں اور اتنی بھیڑ میں مجھے کوئی ڈھونڈ بھی نہ سکے گا۔ ابھی مجھے اس کیفیت میں تھوڑا وقت ہی گزرا تھا کہ بھائی جان دوڑتے ہوئے آئے اور آتے ہی مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیا، بڑوں کی طرح پیار کیا، خاموش کروایا اور یوں میرا رونا ہچکیوں میں تبدیل ہوا اور بتدریج میں خاموش ہو گیا مگر خوف دل سے دور نہ ہو سکا۔ بھائی جان مجھ سے پانچ سال بڑے تھے اور خود بھی ابھی بچے تھے مگر میرے لیے ایک چھتنار درخت سے کم نہ تھے۔ گھر پہنچتے ہی بھائی جان نے امی جی سے کہا کہ اس کو کسی اور سکول داخل کروا دیں جب یہ روتا ہے تو مجھے بھی رونا آتا ہے۔

یہ ایک مکمل روایتی اردو میڈیم سکول تھا جہاں بچے خوف کے سائے میں تعلیم حاصل کرنے پر مجبور تھے۔ اکثر اساتذہ اس فلسفے پر یقین رکھتے تھے کہ بچے مار کے خوف کے بغیر پڑھ ہی نہیں سکتے اور وہ ہاتھوں، ڈنڈوں اور گالیوں کے ذریعے قوم کے نونہالوں کی کردار سازی میں مصروف تھے۔ میں نے یہاں آ کر زندگی میں پہلی بار اساتذہ اور بچوں کو آپس میں وہ بے ہودہ الفاظ بولتے ہوئے سنا جن سے میں تب تک یکسر ناآشنا تھا۔ ہمارے گھر کے ماحول میں تو کسی کو کتا کہنے پر بھی شدید ڈانٹ پڑ جایا کرتی تھی اور امی جی ڈانٹ کے بعد ہمیں توبہ کرنے کو بھی کہا کرتی تھیں۔ میں نے ایک دفعہ اپنے کلاس فیلوز کو بات بات پر گالیوں کے استعمال پر ٹوکا اور

توبہ کرنے کو کہا تو سب کھلکھلا کر ہنسنے لگے اور میں خفت کے مارے یوں خاموش ہو گیا جیسے گالی میں نے دی ہو اور وہ سب میری بے ہودگی پر میرا مذاق اڑا رہے ہوں۔ انہی لڑکوں میں ایک ایسا بچہ بھی تھا جس کی زبان سے میں نے کبھی گالی نہیں سنی تھی۔ وہ اکثر خاموشی سے اپنے کام میں مگن رہتا۔ کلاس ختم ہوئی تو شفقت میرے قریب آیا، مجھ سے ہاتھ ملایا اور یوں ہم بغیر کچھ کہے دوست بن گئے۔ اس کے بعد شفقت اور میں ایک ہی ڈیسک پر بیٹھنے لگے اور اکٹھے لنچ بھی کرنا شروع کر دیا۔ بھائی جان اس تبدیلی پر بہت خوش تھے کیونکہ اس سے قبل بریک کے اوقات میں سارا وقت میں انہی سے چمٹا رہتا اور انہیں نہ اپنے دوستوں سے کھیلنے دیتا اور نہ ہی خود سے الگ ہونے دیتا۔ گھر سے بھی بھائی جان کو یہی ہدایت تھی کہ مجھے اکیلا نہ چھوڑا جائے چنانچہ بھائی جان تلملاتے ہوئے مجھے ساتھ ساتھ لیے پھرتے اور کڑھتے رہتے۔ شفقت کے ساتھ میری دوستی نے گویا ان کو آزادی سے روشناس کروا دیا۔ اب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھیلا کرتے مگر وقفوں وقفوں سے آ کر مجھ پر بھی نظر ڈال لیا کرتے اور میں ان شفیق آنکھوں کی پھوار میں بھیگتا رہتا۔

ہمارا سکول آٹھویں جماعت تک تھا اور یہاں ملک بھر سے اساتذہ ٹریننگ لینے اور پیشہ وارانہ کورسز کے لیے بھی آیا کرتے تھے۔ سکول کی عمارت کا ایک حصہ ان زیرِ تربیت اساتذہ کی رہائش کے لیے مخصوص تھا۔ ہمارے ایک ماموں زاد بھائی جو مجھ سے بہت بڑے تھے، ٹیچر ٹریننگ کے لیے آئے اور ہمارے اصرار پر ہاسٹل کی بجائے ہمارے ہاں ہی ٹھہرے۔ بھائی جان اجمل بہت باذوق تھے اور اکثر اچھے اشعار اور نثری فن پاروں کے اقتباسات سنایا کرتے۔ بھائی جان اجمل کے آ جانے سے ہم دونوں بھائی بہت خوش تھے۔ ہمارے مختصر سے کنبے والے گھر میں جب کوئی مہمان آتا تو ہم بہت خوش ہوا کرتے اور پھر یہ تو بہت دنوں کے لیے آئے تھے۔ بھائی جان اجمل کی شخصیت ہمیشہ سے بہت شفیق تھی۔ مجھ سے بہت پیار کرتے اور ہر اچھے کام کی حوصلہ افزائی کرتے۔ میری آنکھوں میں آج بھی وہ دن روشن ہے جب ایک چھٹی کے دن ہم گھر کے آنگن میں سردیوں کی مہربان اور خمار آلود دھوپ کا لطف لے رہے تھے۔ میں نے اپنی تختی دھو کر سوکھنے کے لیے دیوار کے ساتھ ٹکا کر رکھی ہوئی تھی۔ بھائی جان اجمل نے مجھے اٹھ کر تختی پکڑنے اور لکھنے کو کہا۔ میں ابھی کام کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر جواباً زندگی کا پہلا شعر کہا جو برجستہ اور فی البدیہ تھا۔

تختی مری ابھی سوکھی نہیں
سورج کی گرمی بھی اٹھی نہیں

اس وقت مجھے اتنا ادراک کہاں تھا کہ الفاظ کی نشست و برخواست موزوں ہے یا نہیں۔ میں نے تو اپنی طرف سے مذاق میں یہ شعر کہہ دیا مگر بھائی جان اجمل بہت خوش ہوئے اور امی جی، ابا جی کو فوراً بتایا کہ اس نے

اتنی چھوٹی سے عمر میں شعر کہا ہے۔ گھر میں سب نے بہت حوصلہ افزائی کی۔ اگر میں یہ کہوں کہ میرا شعر گوئی کی طرف وہ پہلا قدم تھا تو بے جا نہ ہوگا۔

امی جی کا ادبی ذوق ہمیشہ سے بہت عمدہ تھا۔ اقبال، غالب میر کے علاوہ بھی بہت سے اردو اور پنجابی کے شعرا کے اشعار ان کو ازبر تھے اور سنایا کرتی تھیں۔ ہمارے سکول میں باقاعدگی سے بزمِ ادب کا انعقاد ہوا کرتا تھا۔ میں غالباً دوسری یا تیسری میں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ایک دفعہ مجھے امی جی نے اقبال کے جواب شکوہ سے کچھ اشعار یاد کروائے جن کو میں نے پورے سکول کے سامنے بزمِ ادب میں اشاروں کے ساتھ پڑھا۔ میرے معصومانہ انداز، درست تلفظ اور برجستہ ادائیگی کو سب حاضرین نے بہت سراہا اور دیر تک میرے لیے تالیاں بجتی رہیں۔ اشعار ختم ہو گئے، تالیاں بھی ختم ہو گئیں مگر میں وہیں کھڑا رہا کیونکہ مجھے علم نہیں تھا کہ اشعار پڑھ کر واپس اپنی جگہ پر جانا ہے۔ میری معصوم ''ہٹ دھرمی'' دیکھ کر ایک استاد آگے بڑھے اور مجھے دونوں کندھوں سے پکڑ کر میرا رخ واپس جانے والے راستے کی طرف موڑ دیا اور ساتھ ہی مجھے واپس جانے کو کہا۔ اس منظر نے تالیوں میں اضافہ کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اب تالیوں میں حاضرین کے قہقہے بھی شامل ہو چکے تھے۔ جب میں واپس جاتے ہوئے سٹیج کے قریب سے گزرا تو مسندِ صدارت پر متمکن شخصیت نے مجھے پاس بلایا اور شاباش کہتے ہوئے پانچ روپے انعام کے طور پر دیے۔ میں نے ان پانچ روپوں کو وقت ضائع کیے بغیر اپنی پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ ان پانچ روپوں نے اس وقت مجھے جو خوشی دی تھی وہ مجھے کبھی نہیں بھولی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے بہت بڑا معرکہ سرانجام دیا ہے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ میری خود اعتمادی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ جب میں انعام لے کر اپنے کلاس فیلوز کی قطار میں واپس آیا تو ہر بچہ مجھے رشک بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس دن میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وجہ اس وقت بھی پانچ روپے نہیں تھے کیونکہ ہم دونوں بھائیوں کو ہر ماہ اچھی خاصی پاکٹ منی ملا کرتی تھی۔ بات اس اعزاز کی تھی جو پورے سکول کے سامنے مجھے ملا تھا اور میری کم عمری کے باوجود وہ احساس میرے اندر خوب رچ گیا تھا۔ گھر آ کر میں نے سب کو خوشی خوشی پورا واقعہ سنایا اور چمکتی آنکھوں سے وہ پانچ روپے بھی دکھائے جو مجھے انعام میں ملے تھے۔ امی جی نے مجھے گود میں اٹھا کر خوب چوما اور شاباش دی۔ ابا جی نے بھی بہت پیار کیا اور میرا حوصلہ بڑھایا۔ بھائی جان بھی بہت خوش تھے اور مجھے ''میرا ویر میرا ویر'' کہہ کر بار بار پیار کرتے۔ بھائی جان اجمل نے بھی بہت شاباش دی۔ مجھے اس رات دیر تک نیند نہ آئی۔ اس واقعے کی حقیقت مجھ پر بہت بعد تب کھلی جب میں ایم اے کا طالب علم تھا۔ بھائی جان اجمل نے ایک دن بتایا کہ وہ پانچ روپے درحقیقت میرے والدین نے بھائی جان اجمل کو اس لیے دیے تھے کہ وہ جناب صدر کے ذریعے مجھے انعام

دلوائیں تا کہ پہلی بار ایک بڑے مجمع کا سامنا کرنیکی وجہ سے میرا اعتماد بڑھ جائے۔ اتنے برسوں بعد یہ جان کر میری آنکھیں بھیگ گئیں کہ میرے والدین نے زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے کس کس طرح میری مدد کی تھی۔ ان کے اس چھوٹے سے عمل نے مجھ میں ایک بھرپور روح پھونک دی اور میں پورے زمانۂ طالب علمی میں سکول، کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر ہر جگہ بہترین مقرر رہا۔ لاتعداد بین الکلیاتی مباحثوں، بیت بازی کے مقابلوں اور مشاعروں میں بے شمار انعامات حاصل کیے۔ ان مقابلوں نے میری عملی زندگی پر گہرے اثرات ڈالے اور مجھے کبھی بڑی سے بڑی محفلوں میں بھی کسی قسم کی جھجک محسوس نہ ہوئی۔ آج مڑ کر دیکھتا ہوں تو ان تمام کامیابیوں کے پیچھے میرے مہربان، شفیق اور دانا والدین کے مسکراتے اور ہمت بندھاتے چہرے نظر آتے ہیں۔

ادب سے محبت اور وابستگی ہمارے خاندان میں رچی بسی تھی۔ میرے محترم دادا جی کے بھائی میراں بخش منہاس پنجابی زبان کے پہلے ناول نگار تھے۔ ان کا پنجابی ناول ”جٹ دی کرتوت“ ایک حوالے کے طور پر گردانا جاتا ہے۔ وہ بہت عمدہ شاعر اور ناول نگار تھے۔ میرے دادا جی حکیم غلام حیدر بھی صاحب دیوان شاعر تھے اور تصوف ان کا محبوب موضوع تھا۔ دادا جی جن کو ہم ہمیشہ بابا جی کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ ان کی شخصیت میرے لیے ہمیشہ حیران کن رہی۔ پیشے کے لحاظ سے وہ ایک سکول ٹیچر تھے۔ ایک ایسے استاد جن کا ذکر محض کتابوں یا بزرگوں کے قصوں میں ملتا ہے۔ کسی کی چھوٹی چھوٹی بات کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی کرنا اور دوسروں کے سامنے اس کے اوصاف کو بیان کرنا ان کا وصف تھا۔ انہیں ایک دھن تھی کہ ان سے متعلق ہر شخص پڑھا لکھا ہو۔ کوئی ایک بات پوچھتا وہ سو بتاتے۔ بہت نرمی، شفقت اور انہماک سے سکھاتے۔ شوق پیدا کرتے اور رغبت دلانے کے لیے انعام دینے سے بھی نہ چوکتے۔ ان کی وفات کے بعد ایک روز ان کے اسباب کو کھنگالتے ہوئے میں نے ان کے بنائے ہوئے گرامر کے چارٹ، نصابی کھیلیں اور متنوع تعلیمی تخلیقات دیکھیں تو دنگ رہ گیا کہ میرے بابا جی اپنے شاگردوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے اور اسباق کو ان کے لیے آسان بنانے کے لیے کتنی محنت کیا کرتے تھے۔ ہمارے خاندان کے اکثر افراد کاروبار سے منسلک تھے مگر ہمارے بابا جی نے ان سب کے برعکس اپنے اہلِ خانہ کو تعلیم کی طرف راغب کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خاندان کے باقی لوگ دنیاوی لحاظ سے لعل و جواہر میں تلتے چلے گئے اور ہم کسی پچھتاوے کے بغیر اپنے بابا جی کے متعین کردہ راستے پر گامزن رہے۔ ہم مال و دولت کے انبار تو جمع نہ کر سکے مگر تمام عمر کسی ضرورت کے لیے کسی کے دستِ نگر بھی کبھی نہ ہوئے۔ اللہ نے اتنی آسودگی دی کہ کسی شے کی دستیابی کے لیے کبھی ترسنا نہ پڑا۔ آج جب میں ایک بہت آسودہ اور مطمئن زندگی بسر کر رہا ہوں تو مجھے اپنے بابا جی کی وہ دعا یاد آتی ہے جو وہ اکثر مانگا کرتے تھے۔ ”اے اللہ! میرے بچوں کو دولت کی ہوس میں مبتلا نہ کرنا بس ان کی جائز ضرورتیں خود ہی

پوری کر دینا۔"

میری دادی جی کی اس وقت کی روایات کے مطابق جب نہایت کم عمری میں شادی ہوئی تو وہ اس سے قبل کبھی سکول کے دروازے سے داخل بھی نہ ہوئی تھیں۔ بابا جی نے شادی کے بعد انہیں پڑھایا۔ بابا جی کس قدر روشن خیال اور پر اعتماد تھے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میری دادی جی کو دو سال کی ٹیچر ٹریننگ کے لیے فیصل آباد سے بہت دور ملتان بھیجا جہاں وہ ایک ہاسٹل میں رہائش پذیر رہیں۔ یہ بھی بتا دوں کہ اس وقت ان کے دو بچے تھے جن میں سے چار پانچ سالہ بڑی بچی کو بابا جی نے نگہداشت کے لیے اپنے پاس گھر رکھا اور چند ماہ کی چھوٹی بچی کو ان کے ساتھ ملتان بھجوا دیا۔ پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب میرے دادا جی اور دادی جی دونوں گورنمنٹ سکولوں میں ہیڈ ماسٹر اور ہیڈ مسٹریس کے عہدوں پر فائز تھے۔

بابا جی کی تصوف سے گہری وابستگی تھی۔ وہ ہمیشہ ایسے بزرگوں کی تلاش میں رہتے جو اللہ کے بہت قریب تھے۔ اللہ کا خوف ان کی روح میں کہیں بہت گہرائی میں بس گیا تھا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ان کو تہجد گزار پایا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جب ان کو فراغت نصیب ہوئی تو تہجد کے علاوہ بھی تمام نفلی نمازیں ان کے روزمرہ کا معمول بن گئیں۔ چاشت کی نماز میں ان کے خشوع کو میں نے زندگی میں لاتعداد بار دیکھا۔ میرے کانوں میں آج بھی وہ دلربا لحن گونجتا ہے جب وہ چاشت کی نماز کے دوران تلاوت کرتے مگر ان کے مسلسل گریے کے باعث سننے والے تک ایک ایسی لے پہنچتی جس میں ایک لگاتار "ں ں ں ں ں ں ں ں" کی نون غنہ والی آواز کے علاوہ کچھ نہ ہوتا۔ نوافل کے دوران جب سلام پھیرتے تو آنکھوں سے بہ جانے والے پانی کو رومال سے صاف کرتے، ایک ٹھنڈی آہ بھر کر "اللہ اکبر" کہتے اور پھر نیت باندھ کر قیام کی حالت میں چلے جاتے۔ اس درمیانی وقفے میں بھی وہ اپنے گرد و پیش سے مکمل بیگانہ ہوتے اور ان کو قطعاً اس بات کا اندازہ نہ ہوتا کہ کوئی ان کو کس محویت سے تک رہا ہے۔ ان کے قیام، رکوع اور سجود غیر معمولی طور پر طویل ہوتے۔ میں حیران ہوتا کہ نماز کی تسبیحات تو اتنی طویل نہیں ہوتیں پھر بابا جی اتنی دیر کیوں لگا دیتے ہیں مگر اس زمانے میں ان باتوں کی سمجھ کبھی نہ آئی اور نہ ہی آ سکتی تھی۔

بابا جی کے بارے میں ایک واقعہ بہت مشہور رہا جو بہت سے لوگوں کی زبانی میں نے ان کی وفات کے بعد سنا۔ جب وہ کسی سکول میں استاد تعینات تھے تو انہوں نے اپنی کلاس کا ٹیسٹ لیا۔ ٹیسٹ کے خاتمے پر انہوں نے سب کی کاپیاں چیک کیں اور ہر بچے کو اپنی اپنی کاپی اپنے ہاتھ میں پکڑ کر ایک قطار میں کھڑا ہو جانے کو کہا۔ انہوں نے اعلان کیا کہ جس کی جتنی غلطیاں ہوں گی اس کے ہاتھ پر اتنی ہی چھڑیاں ماری جائیں گی۔ اگرچہ وہ نرم دل ہونے کے باعث بہت ہی آہستگی سے بچوں کو چھڑی کی سزا دیتے تھے تاکہ ایذا کی بجائے

صرف نصیحت ہو مگر سزا کا خوف اپنی جگہ تھا۔ تمام بچے کھڑے ہو گئے۔ بابا جی سب بچوں سے ان کی غلطیوں کی تعداد پوچھتے جاتے اور اس کے مطابق ان کے ہاتھوں پر چھڑیاں رسید کرتے جاتے۔ ایک بچہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچے اور اس سے غلطیوں کی بابت دریافت کیا تو خوف کے مارے اس کے ہاتھ سے کاپی گر گئی اور گھگیاتے ہوئے بولا “جی میری ساری ہی غلطیاں ہیں۔” معرفت کی گود میں پلے ہوئے بابا جی اس کے اس جملے کی تاب نہ لا سکے اور ان کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ ہاتھ سے چھڑی پھینک کر زاروقطار رونے لگے اور باربار یہ جملہ دہراتے، “یا اللہ مجھے معاف کر دینا۔ میری تو ساری ہی غلطیاں ہیں۔” روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی۔ اس بچے کو ایک ہی بات کہتے، “تم نے یہ کیا کہ دیا ہے، یہ کیا کہ دیا ہے میرے بچے۔” دیگر اساتذہ ان کی اس کیفیت کو سمجھتے تھے۔ انہوں نے بابا جی کو پانی پلایا اور سنبھالا۔ بچے حیرت زدہ ہو کر بابا جی کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ اس بچے کی بظاہر ایک چھوٹی سی بات نے تصوف کی دنیا کے راہی، میرے دردِ دل رکھنے والے بابا جی کی کیا حالت کر دی تھی۔

بابا جی میانہ قامت، گندمی رنگت اور نفیس شخصیت کے مالک تھے۔ ہر کسی سے شفقت سے بات کرتے۔ امی جی کو برخوردار کہہ کر پکارتے اور میری امی جی ہر دفعہ “جی ابھی آئی” کہہ کر ان کے پاس لپک کر پہنچ جاتیں۔ میرے لیے یہ بات حیرت کا باعث رہی کہ امی جی کو پہلے سے اندازہ ہوتا تھا کہ بابا جی نے انہیں کس مقصد کے لیے آواز دی ہے۔ بابا جی کے کہنے سے قبل ہی ان کا مطلوبہ کام کر دیتیں۔ جانے انہیں کیسے علم ہو جاتا کہ بابا جی کو اس وقت کیا درکار ہے۔ کمر کے پیچھے رکھنے کے لیے گرم پانی کی بوتل کی ضرورت ہو، دوائی کے لیے پانی چاہیے ہو، قرآنِ مجید کو ان کی الماری سے نکالنا ہو، امی جی ان تک پہنچنے سے قبل ہی یہ تمام کام نہایت سرعت سے انجام دے لیتیں۔ سسر بہو کے درمیان اس حیرت انگیز ہم آہنگی میں کبھی کوئی چوک نہ ہوتی۔ کبھی ایسا نہ ہوا کہ امی جی بابا جی کے پاس کوئی کام کر کے پہنچی ہوں اور بابا جی کا تقاضا اس سے مختلف ہو۔ بابا جی جواب میں جزاک اللہ کہتے اور زندگی، صحت، اولاد کی خوشی، دونوں جہانوں میں کامیابی پر مشتمل ایک طویل دعا دیتے۔ میں کبھی کبھار امی جی سے پوچھتا کہ آپ کو کیسے علم ہو جاتا ہے کہ اس وقت بابا جی کو یہ چاہیے۔ امی جی اپنے کام میں اسی طرح مگن بڑے اطمینان سے مجھے سمجھاتی جاتیں، “دیکھو بیٹا جب ہم کسی کی خدمت میں راحت محسوس کرتے ہیں تو یہ علم خود بخود ہو جاتا ہے کہ اس وقت انہیں کیا مطلوب ہے۔ یکسوئی اور ثواب کی لگن بہت کچھ سکھا دیتی ہے۔” مجھے کم کم ہی ان کی ایسی باتوں کی سمجھ آتی مگر میں سر اثبات میں ضرور ہلا دیتا۔

بابا جی طویل عرصے سے قرآنِ مجید کی تفسیر لکھ رہے تھے۔ چاشت کی نماز کے بعد اس میں مگن ہو جاتے۔ کلامِ الٰہی کی جانے کون سی تہوں میں اترتے۔ جب قرآنی آیات ان پر منکشف ہونے لگتیں تو ان کا بدن

لرزنے لگتا۔ گریہ بار بار ان پر طاری ہوتا۔ اس دوران ہم میں سے جو بھی ان کے پاس سے گزرتا، وہ پاس بٹھا لیتے اور زیرِ مطالعہ آیت کے رموز اور مفاہیم سمجھاتے جاتے۔ ہر بات سمجھانے کے بعد سبحان اللہ کہنا نہ بھولتے۔ بابا جی کو بات سمجھانے کا ڈھنگ خوب آتا تھا۔ بات کیا کرتے تصویر بنا دیتے۔ سننے والے کے ذہن میں ہر بات متشکل ہوتی جاتی۔ بچپن میں رات کو سونے سے قبل ان سے کہانی سننا ہم دونوں بھائیوں کو بہت مرغوب تھا۔ بابا جی ہماری عمروں کے لحاظ سے الفاظ تراشتے۔ انبیاء اور اسلاف کی کہانیاں ایسے انداز سے سناتے کہ ہم تخیل کی ایک ہی جست میں اس زمانے میں پہنچ جاتے۔ ان بزرگوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور ان کے ساتھ ساتھ سفر کرتے۔ ان دنیاؤں کو اسی طرح تصور میں بسائے میں سو جاتا اور خواب میں کبھی حجاز، کبھی فلسطین، کبھی شام، کبھی عراق اور کبھی مصر کی سرزمینوں پر بلا روک ٹوک گھومتا اور صبح تک اپنے گھر لوٹ آتا۔

جمعہ کے روز بابا جی خاص اہتمام کرتے۔ صبح جلد تیار ہو جاتے۔ سفید لباس زیبِ تن کرتے، خوشبو لگاتے، سر پر ٹوپی کے ساتھ مدینہ منورہ سے لایا ہوا عربی رومال رکھتے اور جلد مسجد جانے کے لیے اصرار کرتے۔ مسجد جا کر پہلی صف میں بیٹھتے۔ امام صاحب سے مصافحہ کرتے، تقریر شروع ہونے سے پہلے قرآنِ پاک کی تلاوت میں مشغول رہتے۔ مجھے ہمیشہ ان کے ساتھ جلد مسجد جانا پڑتا اور نماز کے بعد کافی دیر تک رکنا پڑتا۔ بابا جی نماز کے بعد دیر تک جانے کیا کچھ پڑھتے رہتے اور مجھے ان کا انتظار کرنا پڑتا کیونکہ مجھے ابا جی کی طرف سے ہدایت تھی کہ بابا جی کے ساتھ گھر واپس آنا ہے۔ واپسی میں بابا جی مجھ سے پوچھتے کہ نماز کے بعد کیا کچھ پڑھا ہے۔ کتنی سنتیں اور کتنے نوافل ادا کیے ہیں۔ میرے لیے یہ ایک مشکل مرحلہ ہوتا کیونکہ میں جواب میں کچھ زیادہ سچ نہ بول پاتا اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جواب دیتا۔ میرے ان جوابات کی حقیقت تک پہنچنا ان کے لیے کبھی مشکل نہ ہوتا لیکن کبھی مجھے میرے جھوٹ کا احساس نہ دلاتے۔ مجھے جمعہ کے دن کی گئی عبادات کی فضیلت سمجھاتے اور آخر میں شاباش ضرور کہتے۔

بابا جی نے کسی زمانے میں حکمت کا امتحان بھی گولڈ میڈل کے ساتھ پاس کر رکھا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کا گولڈ میڈل میں نے ان کی وفات کے بعد ان کے صندوق میں دیکھا جس پر غالباً زبدۃالحکما کے الفاظ بھی کندہ تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ بابا جی گولڈ میڈلسٹ تھے اور کبھی انہوں نے ہمیں یہ میڈل دکھایا نہیں، نہ کسی قسم کے احساسِ تفاخر کا مظاہرہ کیا۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ وہ اکثر طبِ نبوی کے ذریعے اپنا علاج خود کرتے اور اکثر ٹھیک بھی ہو جاتے۔ ان کے پاس کئی ایسی ادویات ہوتیں جو وہ گھر میں کسی کے بیمار ہونے کی صورت میں دیتے۔ میں ان دوائیوں سے ہمیشہ دور بھاگتا۔ مجھے صرف میٹھے شربت اور خمیرے مرغوب تھے جنہیں میں ان کی اجازت سے کم کم اور بلا اجازت بکثرت کھاتا۔

بچپن میں جب کبھی میں کاغذ پر کچھ لکھتا تو اکثر ایسا گمان گزرتا جیسے بہت سے کیڑوں مکوڑوں کو مار کر کاغذ پر پھینک دیا گیا ہے۔ بابا جی بہت خوش خط تھے۔ مجھے ان سے اس بات پر کئی بار ڈانٹ پڑتی۔ میری لکھائی پر خصوصی توجہ دیتے۔ تختی منگوا کر اس پر مجھے مشق کرواتے لیکن بد قسمتی سے یہ ایک ایسا میدان تھا جس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔

مجھے انٹر کے امتحان میں بورڈ کا سکالرشپ ملا تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔ اسی وقت مٹھائی منگوا کر تقسیم کی۔ مجھے انعام دیا۔ ہر ملنے والے کو فخر سے بتاتے کہ میرے پوتے نے سکالرشپ حاصل کیا ہے اور یہ بتاتے ہوئے ان کی آنکھوں میں جو چمک آتی وہ میری یادداشت میں آج بھی محفوظ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جب بھائی جان نے سکول جانا شروع کیا تو میں بھی پڑھنے کے شوق میں بابا جی کے صوفیانہ کلام پر مشتمل کتاب ''وجدانیاتِ حیدر'' کو ہاتھ میں تھام کر ''مطالعے'' میں غرق ہو جاتا۔ بابا جی کا فارسی کلام میں اپنی ''زبان'' میں بڑی روانی سے پڑھتا اور میرے اس شوقِ مطالعہ کے باعث گھر میں سب کو تفننِ طبع کا سامان میسر آ جاتا۔ بد قسمتی سے اپنی کم عمری کے باعث تب میں وہ کم فہم تھا جسے خبر ہی نہیں تھی کہ اس کے ہاتھ کیا گوہرِ نایاب آ گیا ہے اور جب اس کی معمولی سی سمجھ آنا شروع ہوئی تو بہت دیر ہو چکی تھی اور بابا جی اپنی تمام وجدانیات سمیت منوں مٹی تلے سو چکے تھے۔

بابا جی اور دادی جی کی آخری تعیناتی ضلع فیصل آباد کی اس وقت کی تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ کے گاؤں برج منڈی کے ایک سکول میں تھی۔ یہ ایک ہرا بھرا چھوٹا سا گاؤں تھا جو ریلوے کی کسی برانچ لائن کے اسی نام کے ایک سٹیشن سے کچھ فاصلے پر آباد تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ٹرین کے رومانوی سفر کے بعد جب ہم برج منڈی کے سٹیشن پر اپنے سامان سمیت اترتے تو میرا دل خوشی سے اچھلنے لگتا۔ ہم دونوں بھائی بات بے بات چہکتے۔ گاؤں کو جانے والے تانگے پر سوار ہوتے۔ تانگے والا ہمیشہ برج کا ہی رہائشی ہوتا اور ہمیں بہت تپاک سے ملتا۔ ہمارے کنگھی سے آراستہ بالوں پر اپنے دونوں ہاتوں کے ساتھ محبت کا ایسا بے ترتیب اظہار کرتا کہ ہمارے بال آندھی کی زد میں آ کر بکھرے ہوئے دکھائی دیتے۔ اس کی طرف سے محبت کے اس بے رحمانہ سلوک کے بعد ہم دونوں بھائی ناگواری سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور اپنے بالوں کو واپس اپنی جگہ پر جمانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے۔ بھائی جان کے بال سیدھے ہونے کے باعث جلد واپس اپنی سابقہ جگہ پر پہنچ جاتے مگر میرے گھنگریالے بال ایک بار روٹھ جانے کے بعد کم ہی مانا کرتے۔ ہر بار سٹیشن سے اتر کر تانگے کی طرف لپکتے ہوئے یہ تصور ہی میرے لیے روح فرسا ہوتا کہ تانگے والا اب میرے مشکل سے سنورے بالوں کی ساری ترتیب الٹ کر رکھ دے گا۔ میں منہ بسورتا، بڑبڑاتا ہوا تانگے پر سوار ہو جاتا اور امی جی مجھے پیار

سے سمجھاتیں، ”بری بات بیٹا، وہ پیار سے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے، اس بات کا برا نہیں مانتے۔ میں تمہارے بالوں میں گاؤں پہنچنے سے پہلے پھر کنگھی کردوں گی۔“ میں اس یقین دہانی پر بال خراب ہونے کا دکھ بھول جاتا اور دور تک پھیلے سرسبز کھیتوں، ان کے بیچ کی پگڈنڈیوں، کھیتوں کو سیراب کرتے پانی کے کھالوں، ٹیوب ویلوں کے بڑے دہانے سے پھوٹتے اور کھیتوں کی جانب رواں دواں ہونے والے پانیوں، آٹا پیسنے والی چکیوں سے دل میں اتر جانے والی لے میں ”ٹھک ٹھک ٹھک ٹھک“ کرتی آوازوں اور سر پر ”اینو“ بنا کر رکھی ہوئی لسی کی گڈوی، اس کے اوپر روٹیوں کی چنگیر کو ایک مخصوص اور پر اعتماد توازن کے ساتھ تنگ پگڈنڈیوں پر چلتی ہوئی عورتوں کو دیکھنے میں مگن ہو جاتا۔ کھیتوں میں کام کرتے کسان پاس سے گزرنے پر ابا جی کو مخاطب کرتے ہوئے ہاتھ فضا میں بلند کر کے باآوازِ بلند ”السلام علیکم بھائی جی“ کہتے اور خیریت پوچھنے کے بعد پھر سے اپنے کام میں مگن ہو جاتے۔ تانگہ گاؤں کو جانے والی ناہموار کچی سڑک پر ڈولتا ہوا اپنی منزل کی جانب رواں رہتا۔

گاؤں قریب آتا تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں اور آنکھوں میں اپنے شفیق دادی جی اور بابا جی کے چہرے تیرنے لگتے۔ مجھے معلوم ہوتا کہ ہمیں دیکھنے کے بعد ان دونوں کی زبانوں پر کیا جملے آئیں گے۔ دادی جی ہمیشہ دور سے ہی کہتیں ”او میرے بچے آ گئے، ماں صدقے، ماں واری“ اور ہم دونوں بھائیوں کو اپنی باہوں میں اٹھا کر بے تحاشا چومنے لگ جاتیں۔ بابا جی ہمیشہ ”ماشااللہ اور الحمدللہ“ کہتے جاتے اور ہمیں ساتھ لگا کر پیار کرتے۔ گاؤں کا وسیع و عریض گھر گویا ہماری سلطنت ہوتا جس کے کشادہ دالان، بڑے بڑے کمروں اور وسیع صحن میں ہم دونوں بھائی حکومت کرتے۔ بھائی جان اپنی طبیعت کے پیدائشی نظم کے باعث زیادہ اچھل کود نہ کرتے مگر میرے مزاج میں بدرجۂ اتم موجود لاابالی پن، شرارتیں اور بے چینی مجھے کبھی آرام سے بیٹھنے نہ دیتے۔ میں دن بھر گاؤں کے بچوں کے ساتھ نت نئے کھیلوں میں مصروف رہتا۔ گاؤں کی ہر دکان سے بوسیدہ ناگریاں، مکھانے اور میٹھی گولیاں لے کر کھاتا۔ ان نام نہاد مٹھائیوں کو سب بچے ”چیز“ کا نام دیا کرتے۔ یہ تمام اشیا جانے کب سے ٹین کے مرتبانوں میں قید ہوتیں اور انہیں رہائی تب ملتی جب مجھ ایسا کوئی ”شہری“ ان ٹین کے ڈبوں کی شیشہ نما پلاسٹک کی دیواروں سے جھانکتی ان ”چیزوں“ کی طرف ملتفت ہوتا۔ ”چیز“ کھانے کے لیے میں روز امی جی سے پیسے لیتا اور سب گھر والوں کے سمجھانے کے باوجود مجھے دنیا کی سب سے پرکشش یہی کسیلی اور باسی مٹھائیاں ہی نظر آتیں۔ بھائی جان بھی مجھے بڑا ہونے کے ناطے سمجھانے کی کوشش کرتے ”دیکھو میرے ویر! یہ چیزیں کھانے سے بندہ بیمار ہو جاتا ہے۔“ یہی بھائی جان تمام تر نصیحتوں کے بعد اندر سے انہی مٹھائیوں پر ریجھ رہے ہوتے مگر امی جی اور ابا جی کے منع کرنے کے باعث ان کی طرف ہاتھ نہ بڑھاتے۔ کبھی کبھار جب جی زیادہ مچل جاتا تو مجھے کہتے ”ایک ناگری چکھاؤ“ میں انہیں اس ”جرم“ میں

شریک کر لیتا تا کہ میری شکایت لگنے کا کوئی امکان نہ رہے۔ بھائی جان کو یہ 'چیزیں' پسند آتیں اور مزید کھانے کی رغبت ہوتی۔ پھر وہ امی جی کی ڈانٹ اور ان مٹھائیوں کی اشتہا کی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے۔ بھائی جان اپنی کیفیت پر قابو پانے کے لیے مجھے یہ چیزیں نہ کھانے پر مائل کرتے مگر ناکامی کے بعد ان کے پاس اس کشمکش سے نکلنے کا واحد حل یہ ہوتا کہ مجھے کمینہ کہہ کر گھر کی طرف رواں ہو جاتے اور میں ان تمام جھمیلوں سے آزاد بے فکر ہو کر یہ تمام مٹھائیاں کھانے میں مگن رہتا۔

برج میں بابا جی اور دادی جی کے گھر کے سامنے ایک شاہراہ تھی یا شاید مجھے تب شاہراہ دکھائی دیتی تھی۔ گھر کے سامنے ہی ایک چوک بنتا تھا جس میں گلی پار کر کے دائیں طرف گاؤں کی سفید روغن والی مسجد تھی۔ مسجد گاؤں کے دیگر مکانوں کی نسبت ذرا اونچی تھی اور اس کے بلند مینار اس کو مزید ترفع بخشتے تھے۔ پانچ وقت اس سے اذان کی آواز گونجتی۔ میں اذان کے وقت ہمیشہ مسجد کے میناروں کی طرف دیکھا کرتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے اذان مسجد کے میناروں سے نکل کر فضا میں بلند ہو رہی ہے اور یہ پکار بہت اوپر اٹھتی جا رہی ہے۔ میرے لیے یہ منظر ہمیشہ حیرت، تجسس اور دلچسپی کا باعث ہوتا۔ اگرچہ یہ پکار اوپر ہی اوپر اٹھتی جاتی لیکن ان دنوں زمین پر بسنے والے بھی اس پکار کو سننے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اذان کے بعد گھروں میں موجود لوگ مسجد کی طرف لپکتے۔ وضو خانوں میں گوزوں سے پانی ہاتھوں، چہروں، کہنیوں اور پاؤں سے ہوتا ہوا بہاؤ کے لیے بنی ہوئی نالیوں میں بہتا جاتا اور میں پانی کے اس شور کے سحر میں کھویا رہتا حتیٰ کہ بابا جی مجھے ہوش کی دنیا میں لا پٹختے، "دھیان سے وضو کرو بیٹا، جماعت کھڑی ہونے والی ہے۔" اقامت کا آغاز ہوتا تو امام صاحب مجھے اور دوسرے بچوں کو پچھلی صفوں میں جانے کو کہتے اور مجھے یہ بات ہمیشہ ناگوار گزرتی۔ میری خواہش ہوتی کہ میں بھی بڑوں کی طرح اگلی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں۔ بابا جی میری خواہش کو بھانپتے ہوئے اکثر مجھے لے کر صف کے ایک کونے میں کھڑے ہو جاتے۔ مولوی صاحب بابا جی سے کہتے، "استاد جی! آپ تو یہیں کھڑے رہیں بچے کو پیچھے بھیج دیں" اور بابا جی کہتے، "اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ بھی اگلی صف میں نماز پڑھے۔ میں اسے لے کر صف کے ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہوں۔ آپ کی نماز بھی خراب نہیں ہو گی اور بچے کا دل بھی خوش ہو جائے گا۔" اس وقت مجھے اپنے بابا جی دنیا کے سب سے خوبصورت انسان دکھائی دیتے۔ مولوی صاحب یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ میں صف کی انتہائی سمت میں موجود ہوں، اللہ اکبر کی صدا بلند کرتے اور یوں نماز کا آغاز ہو جاتا۔ مجھے یہ تفریق ایک آنکھ نہ بھاتی اور میں ہر دفعہ بابا جی کے سامنے مولوی صاحب کے اس امتیازی سلوک کے خلاف احتجاج کرتا۔ بابا جی مجھے سمجھاتے، "یہ فقہی مسئلہ ہے بیٹا! جب بڑے ہو جاؤ گے تو سب کے ساتھ اگلی صف میں کھڑے ہو کر نماز پڑھا کرنا۔" مجھے ان باتوں کی کبھی سمجھ نہ آتی۔ نہ مولوی صاحب کی منطق کی اور

نہ باباجی کی فقہ کی۔ اس زمانے میں میری اپنی فقہ ہوا کرتی تھی۔ شاید ہر بچے کی اپنی فقہ ہوتی ہے جس کو بڑے کبھی نہیں سمجھ سکتے۔

مسجد کے عین بائیں طرف چوک میں بوہڑ کا ایک بہت بڑا درخت تھا جس کے نیچے ہمیشہ بہت سی چارپائیاں پڑی رہتیں۔ گاؤں کے لوگ اپنی مصروفیات میں سے کچھ لمحات پس انداز کر کے یہاں بیٹھ جاتے۔ حقے کی گُڑگُڑ کے ساتھ خوش گپیاں ہوتیں۔ اپنے تئیں کچھ "باخبر" افراد دوسروں کو ملکی اور بین الاقوامی حالات کی مقدور بھر خبریں دیتے اور خبروں کی ترسیل کم پڑنے پر اپنے تخیل سے کمک حاصل کر کے منہ کھول کر حیرت سے سننے والے لوگوں کو مزید حیرت سے دوچار کرتے رہتے۔ بڑے شہروں کی ترقی، کراچی اور لاہور کی چم چم کرتی ہوئی سڑکوں کے قصے، امریکہ اور برطانیہ کی سیاسی بالادستی کے احوال، انسان کی خلا میں پرواز، بھارت اور پاکستان کے مابین اختلافات کی اصل وجوہات، لائلپور سے لاہور تک چلنے والی نئی اور سبک رفتار ٹرین، مسلمانوں کے زوال کے اسباب، چک جھمرہ کے بازار میں اشیاء کے بڑھتے ہوئے نرخ اور گاؤں کے کمہاروں کے گدھوں تک ہر موضوع زیرِ بحث آتا۔ اس بحث سے اکتا جانے والا کوئی فرد اچانک حقے کی چلم گرم کرتے ہوئے دتو میراثی سے سیف الملوک سنانے کی فرمائش کر ڈالتا۔ دتو میراثی ہاتھ سے حقے کی چلم رکھ دیتا۔ بایاں ہاتھ بائیں کان پر رکھتا، دایاں ہاتھ فضا میں بلند کرتا اور آنکھیں میچ کر اپنی آواز کا تمام سوز میاں محمد بخش کے اشعار میں منتقل کر دیتا۔

قدر نبی دا ایہہ کیہ جانن دنیا دار کمینے
قدر نبی دا جانن والے سوں گئے وچ مدینے

میری نظر نہ جانے کیوں ایسے میں مسجد کے میناروں کی طرف اٹھ جاتی۔ دتو میراثی کی آواز میرے اندر ایک انجانا درد گھول دیتی اور میرا معصوم بچپن ان جانے دکھوں سے آشنا ہونے لگتا۔ گاؤں کے بزرگ کندھوں پر پڑے ہوئے بڑے بڑے رومالوں سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگتے اور میرے رقیق القلب باباجی کی سسکیاں، چیخوں اور بتدریج ہچکیوں میں تبدیل ہو جاتیں۔ دتو میراثی کی آواز سارے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی اور جب حقوں کی چلموں سے اٹھنے والا دھواں اس کی آواز کے ساتھ مل کر میری آنکھیں جلانے لگتا تو میں اس محفل سے سرک آتا۔

☆☆☆☆

محمد عارف

سنگم

''واہ'' میں میری سب سے پرانی رفاقت اسی سے ہے۔ آج سے ۱۴ برس قبل جب میں اس شہر میں وارد ہوا تو بھائی کے دوستوں کی معرفت اس سے ملاقات ہوئی۔ پہلی ملاقات کے باوجود ایک پینڈو اور اجنبی اس سے مل کر بہت خوش ہوا کہ گذشتہ کئی دنوں سے میں جن لوگوں سے مل رہا تھا ان سے مل کر اگر خوشی کا احساس ہوتا بھی تو اجنبیت بہر طور ساتھ رہتی۔ اس کی ایک وجہ عمر کا فرق تھا، دوسرا یہ میرے بڑے بھائی کے دوست تھے، تیسرا میٹرک کے امتحان میں میری غیر معمولی پوزیشن جو نیچے سے شاید دوسری یا تیسری تھی اس پر ان کے شاندار تبصرے تھے۔ اسی کے پاس میرے تاریک مستقبل کا قصہ چھیڑا گیا، بحث کی گئی، مختلف آراء سامنے آئیں لیکن یہ سنتا رہا، اس نے کسی کی بات کاٹی نہ کوئی مشورہ دیا اور نہ ہی یہ کہا کہ تم میٹرک کا امتحان دوبارہ کیوں نہیں دیتے۔ اس کی یہ ادائیں مجھے بہت پسند آئیں۔ احباب مجھے باتونی سمجھتے ہیں اور یہ درست بھی ہے۔ ہر باتونی آدمی کی طرح مجھے بھی اچھا سامع پسند ہے۔ کھانے کے بعد میرے مستقبل کا فیصلہ سنایا گیا اس پر بھی یہ خاموش رہا تو میرے احباب کی فہرست میں ایک نام کا اضافہ ہو گیا یوں واہ کینٹ میں مجھے پہلا رفیق میسر آیا۔ رفتہ رفتہ ملاقاتوں میں شدت آتی گئی۔ میں موڈ کا آدمی ہوں اور مزاج موسم کی طرح پایا ہے لیکن تحسین ہے اس پر میں جب بھی آیا جیسا بھی آیا اس کے استقبال اور گرم جوشی میں سرِ مُو فرق نہ پایا اس نفسا نفسی کے دور میں ایسے احباب کا دم غنیمت ہے اور یہی بات اسے انسانوں سے ممتاز کرتی ہے، شاید اسی باعث ''سنگم'' کی رفاقت مجھے اس کے نواح میں لگے صدیوں پرانے شاہ بلوط کے درختوں جیسی عزیز ہے۔

''واہ چھاؤنی'' انتظامی حوالے سے تین حصوں ایسٹ، ویسٹ اور سینٹرل پارک میں منقسم ہے، جہاں شاکر سویٹس، کریم کیفے، سپرز کیفے اور سنگم کیفے پر اہلیانِ علم و فن کی بیٹھکیں رہیں۔ کبھی کبھی کوئی جوڑی یا چند احباب ''گِدڑ ہوٹل'' یا ''پاکستان کیفے'' جا نکلتے ہیں۔

''سنگم کیفے'' ہیریئر ۲ سے چند گز کے فاصلے پر اسلم مارکیٹ جاتے ہوئے حیدر روڈ پر دائیں ہاتھ اور

فیکٹری مین گیٹ کے سامنے اشارے پر بائیں ہاتھ یادگارِ شہداء کی بیک پر واقع ہے۔ سنگم ---- نیچی چھت کا چھوٹا سا ہال جس کے ساتھ ایک چھوٹی سی ٹک شاپ ہے جہاں سگریٹ اور بسکٹس نمکو کے علاوہ ضرورت کی ہر شے مدارد ہے۔ ہال کی پارٹیشن کر کے بائیں ہاتھ ایک پتلا اور لمبا سرنگ نما کمرہ بنا دیا گیا ہے۔ ہال اور ٹک شاپ کے سامنے کا تقریباً دس فٹ چوڑا فرش چار چھ انچ صحن سے اونچا ہے اس پر ٹین کا شیڈ ہے، جس کا بایاں نصف اوپن کچن پر مشتمل ہے، آخری حصے میں تنور اور آگے موڑ پر اوپن ایئر کچن سنک ہے اس کے ساتھ دائیں ہاتھ پر ہال کے آخری کونے میں باتھ روم پر آج کل تالا پڑا ہے، جسے خاص خاص یا ایمرجنسی کے موقع پر ہی کھولا جاتا ہے۔ شیڈ سے باہر فرش کی ڈھال ایسی رکھی گئی ہے کہ کم سے کم بارش کے دوران بھی زیادہ سے زیادہ پانی ہال سے ہو کر گزرے۔ ہال اور ٹک شاپ کے سامنے مربع شکل کا صحن پختہ ہونے کے باوجود کٹا پھٹا ہے جس کے درمیان ایک گول کیاری میں چند پودے لگے ہیں۔ اس صحن کے بائیں ہاتھ ''ڈیلٹا'' شکل کا لان ہے جس کا باڑا حاطہ کیے ہوئے ہے کبھی اس پر گھاس ہوتی تھی، یار لوگوں نے اسے ''برمودا ٹرائی اینگل'' کا نام دے رکھا ہے۔ گرمیوں میں یہاں بیٹھنے والے مچھروں کا شجرۂ نسب ایسے ایسے کیم شحیم جانوروں سے ملاتے ہیں کہ مچھروں کو بھی اعتراض اور حیرت ہوتی ہو گی۔ اس احاطے میں مختلف قسم کے درخت ہیں۔ صحن کے اختتام اور سڑک سے اِدھر بھی کچھ پرانے اور گھنے پیڑ ہیں جن کے نیچے پارکنگ اور ایک ادھ سبزی فروٹ کا ٹھیلا لگا ہوتا ہے۔

پارکنگ والے درختوں نے صحن کے کچھ حصے کا فضائی احاطہ کیا ہوا ہے جس پر بے شمار پرندوں کا مسکن ہے۔ صبح و شام جہاں ان کی چہچہاہٹ بیٹھنے والوں کی سماعتوں کو تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی فطرت سے قریب کرتی ہے وہیں لوگ ان کی ''گل کاریوں'' کا بھی شکار ہوتے ہیں، تاہم اہم بات یہ ہے کہ یہی مرحلہ اگر کسی اور جگہ پیش آئے تو بندہ تماشا بن کے رہ جاتا ہے لیکن یہاں ایسا کچھ نہیں اس سلسلے میں لوگ سرِ عام ایک دوسرے کی حاجت روائی کرتے نظر آتے ہیں۔ صحن میں لان والی لوہے کی مضبوط کرسیاں اور میزیں جو اسی سے مخصوص ہیں مستقل پڑی رہتی ہیں۔ ان کرسیوں کا دامن اتنا کشادہ ہے کہ بڑے سے بڑے گھیر کا آدمی بھی با آسانی سما جاتا ہے نیز ان کرسیوں اور میزوں کو بوقتِ ضرورت زیادہ سے زیادہ افراد کے لیے لائن، دائرے یا مستطیل شکل میں چند لمحوں میں ارینج کر لیا جاتا ہے۔ اب پلاسٹک کی کرسیاں بھی میدان میں آ گئی ہیں جن کی اکثریت تشریف پر چٹکی کاٹنے کی اضافی صلاحیت سے بھی مالا مال ہے۔ لان میں سیمنٹ کی کرسیاں اور گول میزیں فکس

ہیں یہ کرسیاں سردیوں میں اتنی ٹھنڈی ہوتی ہیں کہ بیٹھنا محال ہو جاتا ہے۔

سوائے ساون کے صحن ہمیشہ کشادگی کا احساس دلاتا ہے۔ سردیوں میں سورج ایسے رخ پر آ جاتا ہے کہ دن کے بیشتر حصے میں ''وٹامن ڈی'' میسر رہتی ہے۔ صحن کے کچھ حصے پر ترپال ہونے کے باوجود بھی احباب سرما کی شامیں اور راتیں کھلے صحن میں ٹانگیں ہلاتے، بحث کرتے، چائے پیتے گزار دیتے ہیں۔ گرمیوں میں یہاں دھوپ کی شدت کم اور ہوا کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ خزاں میں صحن کا دامن پتوں سے بھر جاتا ہے پھر ہوا کے ساتھ ان کی سرسراہٹ جہاں زندگی کی بے ثباتی کا یقین دلاتی ہے وہیں بہار کی آمد کا پتہ بھی دیتی ہے۔ بہار کی آمد پر سامنے کے درختوں پر بیٹھنے والی کوئل کی کوک مزید نکھر جاتی ہے۔ لان کی باڑ ہری ہری اور بھری بھری ہو جاتی ہے جہاں صحن اور احاطے کے درخت سدا بہار ہونے کے باعث مزید ہرے بھرے دکھائی دیتے ہیں وہیں لان میں لگا جنگلی توت کا اکلوتا پیڑ بھی پولن الرجی میں اپنا حصہ بقدرِ جثہ شامل کرنے لگتا ہے۔

یہ کب سے ''سنگم'' پر تھا اسے بھی کچھ یاد نہیں۔ کیا تھا، شاید سب کچھ یہی تھا۔ ویٹر بھی، کک بھی، ملازم بھی، ''مالک بھی''، شاعر اور ادیبوں کا دوست بھی۔ گورا چٹا، دراز قد، جھکا جھکا، مٹا مٹا، ملگجے بالوں والا، شلوار قمیص میں ملبوس، سلیپر پہنے سارا دن دوڑ دھوپ میں مصروف۔ تھکاوٹ کے باوجود کبھی اس کے چہرے پر ناگواری یا اکتاہٹ نہ دیکھی گئی۔۔۔ مقصود۔۔۔ رانجھا تھا۔۔۔ جوگی نہ ہو سکا تو پردیسی ہو گیا۔ اس کے بغیر سنگم کی تصویر نامکمل اور ادھوری ہے کیوں نہ ہو آیا تو مسیں بھی نہ بھیگی تھیں گیا تو بالوں میں برف پڑی تھی۔ یہ بھی ایک شاہ بلوط تھا جس نے سنگم کے صحن میں گڑے کئی دہائیاں گزار دیں ہم بھی بہت عجیب ہیں حیدر روڈ پر لگے شاہ بلوط کے چند درخت تو بچا لیے لیکن اس شاہ بلوط کی حفاظت نہ کر سکے۔ یہ تو ''سنگم'' کی روح تھا۔۔۔ بلکہ روحِ رواں تھا۔

''سنگم''۔۔۔ رات گئے تک جاگتا ہے اس لیے دن چڑھے تک اونگھتا رہتا ہے، دوپہر چند فیکٹری ملازمین چائے، کھانے یا ستانے کے لیے آتے ہیں ان میں سے بھی کچھ کے ہمراہ ٹفن اپنا ہوتا ہے۔ چھٹی ہو تو دن میں بھی رونق لگ جاتی ہے، ورنہ شام کا میلہ تو ہے ہی۔ سموسے یہاں پورے ہفتے کے ایک بار ہی بنا لیے جاتے ہیں جو پورا ہفتہ چلنے کے بعد بھی بچ رہتے ہیں۔ لوگ عرصے سے بے مزہ چائے پی رہے ہیں حالانکہ اکثر چائے پینے نہیں آتے۔ کبھی کبھار کوئی کھانا کھا کر بھوک مٹا اور منہ بنا لیتا ہے۔ ٹھنڈے گرم پانی کا انتظام سارا سال رہتا ہے۔۔۔ گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں ٹھنڈا۔

صریرِ خامہ واہ چھاؤنی کا ہفتہ وار اجلاس منگل کو رات گئے ختم ہوتا تو اراکینِ حلقہ چائے کے لیے یہیں آتے، غیر رسمی گفتگو شروع ہوتی تو وقت کا پتہ ہی نہ چلتا، باقاعدہ اجلاس اور صاحبِ صدر کی موجودگی کے باعث جن انتہائی غیر ضروری پہلوؤں پر نازیبا کلمات دورانِ اجلاس ممکن نہ ہوتے ان کی تلافی بھی اسی دوران کر لی جاتی۔ چائے، سگریٹ، باتوں، جملوں اور قہقہوں کا دھواں ''منگل میں جنگل کا سماں'' بنا دیتا۔

شعر و ادب میں رسمی نشستوں کے ساتھ ساتھ غیر رسمی نشستیں بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ''واہ'' اور گرد و نواح کے اہلِ قلم کی اکثر غیر رسمی نشستیں یہاں پر ہوتی ہیں۔ سرِ شام کوئی شاعر یا ادیب ایک ٹیبل سنبھال کے بیٹھ جاتا ہے، احباب آتے، بات چلتی سیاست، مذہب، فلسفہ، تاریخ، کھیل، ادب، موسیقی، حالاتِ حاضرہ غرض کسی بھی موضوع پر، وقت کی کوئی قید نہیں، احباب چائے پیتے، منہ بناتے، بحث کرتے آتے، جاتے۔ ہاں جاتے ہوئے اپنا بل کاؤنٹر کے بجائے اسی ٹیبل پر رکھ کر چلے جاتے جسے آخر میں اُٹھنے والا کاؤنٹر پر جمع کرا دیتا اکثر اس کا اپنا بل اسی رقم سے نکل آتا لیکن کبھی کبھار کسی کا گناہ بھی اسی کے سر پڑ جاتا۔

پاکستان کا کون سا شاعر اور ادیب ایسا ہے جو ''واہ'' آیا اور اس کا مہمان نہ ہوا، اور کون ہے جو ''واہ'' نہ آیا۔ محسن نقوی، احمد فراز، انور مسعود، ممتاز مفتی، منشا یاد، احمد ندیم قاسمی، مستنصر حسین تارڑ، کس کس کا نام لوں۔

کسی بھی موسم میں اہلِ قلم سنگم ہال میں بیٹھنا گوارا نہیں کرتے ایک تو اس کی نیچی چھت تنگی اور گھٹن کا احساس دلاتی ہے دوسرا اکثر اہلِ قلم کا منہ بیٹھتے ہی سائیلنسر بن جاتا ہے اور ہال کا اپنا سائیلنسر نہ ہونے کے باعث دھوئیں سے ان سائیلنسروں کا اپنا دم بھی گھٹنے لگتا ہے، ہاں بارش میں شیڈ کے نیچے یا ہال میں آ جاتے ہیں اور مطلع صاف ہوتے ہی دوبارہ صحن میں۔

کبھی کبھار صاحبانِ ذوق موسیقی پر گفتگو شروع کر دیتے، کوئی بھولا بسرا فنکار ادھر آ نکلتا تو احباب کی فرمائش پر بغیر آرکسٹرا کے ہی راگ رنگ کی محفل جما لی جاتی۔ شوقیہ فنکار بھی میدان میں کود پڑتے تو رات گئے سنگم کی روشنیاں گل ہونے تک شمع محفل جلتی رہتی اور سگریٹ سلگتے رہتے۔

سکول اور کالج سے بھاگے ہوئے طالب علم بھی سویرے سویرے اس کی پناہ میں آ جاتے ہیں۔ خوش گپیاں اور اٹھکیلیاں کرتے، سگریٹ، چائے، کولڈ ڈرنک سے لطف انداز ہوتے۔ کچھ وقت بتا کر کسی نئے مشغلے کی راہ لیتے کہ چھٹی سے پہلے تو گھروں کو جا نہیں سکتے۔

پڑوس میں ”ویلفیئر کلب“ ہونے کے باعث کرکٹ، ہاکی، والی بال، فٹ بال غرض تمام ”مکتبۂ کھیل“ کے کھلاڑی ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ کبڈی کے کھلاڑی پریکٹس یا میچ کے بعد سنگم آتے تو لڑکے بالے بھی پہنچ جاتے اور ایک دوسرے سے شرطیں باندھ کر کھلاڑیوں کے کسرتی اور تیل سے لشکتے جسم پر چٹکیاں لینے کی ناکام کوشش کرتے کھلاڑی بھی بُرا ماننے کے بجائے اس کھیل کا حصہ بن جاتے۔۔۔ ”جانے کہاں گئے وہ دن“۔

کئی روز سے یہ مال روڈ پر غیر معمولی ہلچل دیکھ رہا تھا نعرے سن رہا تھا۔ آج سارا دن مزدوروں کی ٹولیاں مٹرگشت کرتی رہیں۔ لیڈر وقفے وقفے سے دھواں دار تقریریں داغتے اور مزدوروں کو مشتعل کرتے تو یہ کانپ کر رہ جاتا کہ یہی سب کچھ ۲۴ ستمبر ۱۹۵۷ء کو بھی ہوا تھا سرکار نے تقریروں کے جواب میں بندوقیں داغنا شروع کیں تو ان مزدوروں کے خونِ رائیگاں سے بس ایک یادگاری کتبے نے سر اٹھایا۔

۲۲ فروری ۱۹۸۴ء۔۔۔ میری پہلی سالگرہ سے ٹھیک چار دن قبل۔۔۔ شدید برف باری ہوئی۔ رات کپکپاتے گزری، صبح اس نے ”واہ“ کو سفید براق چادر میں دیکھا۔ چار فٹ تک پڑنے والی برف کئی دنوں تک پڑی رہی۔ زندگی مفلوج ہو کے رہ گئی۔۔۔ ”چٹی چادر لاہ سٹ کڑیے، پہن فقیراں لوئی۔۔۔ چٹی چادر داغ لگیسی، لوئی داغ نہ کوئی“ (بلھے شاہ) قدرت کو رحم آ گیا، بے شک محنت کشوں کو ”لوئی“ ہی زیبا ہے۔

یہ اوّل دن سے سفید گنبد اور دو فلک بوس میناروں والی سرخ مسجد بھی دیکھ رہا ہے۔ اور اس سے پانچ مرتبہ ابھرنے والی حیّ علی الصلوۃ کی صدا بھی سنتا ہے۔ یہ قاضی عبدالوحید صاحب کو بھی جانتا ہے جن کے سیاہ بال تبلیغِ دین میں سفید ہو گئے لیکن لوگوں کے دل ہنوز سیاہ ہیں۔ اسے اس سے بھی کچھ غرض نہیں کہ پڑوس کی امام بارگاہ سے صدائے صلوۃ تین بار بلند ہوتی ہے اور یہاں نمازی ہاتھ ناف یا سینے پر باندھنے کے بجائے کھلے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ حال میں اپنے پہلو میں بسنے والی مسجد کے بوڑھے اور کبھی کبھار یہیں سے اٹھ کر جانے والے اکا دکا نمازیوں کو بھی پہچانتا ہے۔ خود اس کے ہاں ہر رنگ، نسل، مسلک اور مذہب کے لوگ آتے اور رنگ جماتے ہیں یہ سب کو سنتا ہے اپنا مسلک چھوڑتا نہ کسی کو چھیڑتا ہے شاید اس کا مسلک انسانیت ہے۔

ایک رات زور کی آندھی آئی تو اس کے پڑوسی ”شاہ بلوط“ کا بازو ٹوٹ گیا میں نے اسے کئی روز تک سوگوار دیکھا حالانکہ اب تو موت پر بھی پاس پڑوس میں سوگواری کا رواج نہیں رہا۔

۱۲۲ اگست ۲۰۰۸ء۔۔۔۔ ہوٹر کی آواز پر روزانہ کی طرح آج بھی ہزارہا مزدور فیکٹری آئے، اس نے بھی کچھ دھیان نہ دیا کہ یہ معمول کی بات تھی۔ چھٹی کے ہوٹر کے ساتھ ہی ایک دھماکہ ہوا تو اس نے دیکھا کہ صبح

اپنے پاؤں پر جانے والوں میں سے آج بہت سے دوسروں کے کندھوں پر واپس آئے، ایک شخص نے اپنی جنت کی خاطر کئی گھرانوں کو زندگی کے کارزارِ جہنم میں دھکیل دیا اور۔۔۔۔ ''واہ'' عمرِ پناہ میں محصور ہو گیا۔

ماہ رمضان میں اکثر ہوٹلوں کے برعکس یہاں کا عالم ہی اور ہوتا ہے، دن دیہاڑے روزہ خور ''برموڈا ٹرائی اینگل'' میں بیٹھے اوپن ائیر سگریٹ نوشی سے لطف اندوز ہوتے ہیں افطار کے بعد رونق بڑھ جاتی، عشاء تک تو خوب گہما گہمی ہو جاتی، مجھ جیسے کئی تراویح چور نماز پڑھ کے یہاں آ جاتے اور تراویح کا وقت گزار کے گھر کی راہ لیتے۔ مرکزی امام بارگاہ کے قرب میں ہونے کے باعث محرم الحرام میں بھی اس کی رونقیں ماند نہیں پڑتیں رات گئے تک مومنین جوق در جوق آتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے مجلسِ عزا یہیں برپا ہے۔

چودہ اگست اور بارہ ربیع الاوّل کو مرکزی مسجد اور دیگر عمارتوں پر چراغاں ہوتا تو رنگ برنگ روشنیوں کے لشکارے یہاں تک آتے یہ مسکراتا اور خوش ہوتا لیکن جب یہ نوجوانوں کو بغیر سائیلنسر کے موٹر بائیک پر کرتب دکھاتے، عورتوں کو سر برہنہ نت نئے فیشنوں میں لڑکوں کو لڑکیوں کے پیچھے آوازے کستے بے ہودہ طریقے سے شور مچاتے دیکھتا تو یہ مسکراہٹ اور خوشی حیرت کا روپ دھار لیتی۔

یکا یک فرشِ صحن کی مرمت ہو جاتی ہے، رنگ و روغن کا کام دنوں میں مکمل ہو جاتا ہے، رنگ برنگے قمقمے سرِ شام ہی بہار دکھانا شروع ہو جاتے ہیں، راتوں رات کھابوں کا معیار ایسا بلند ہو جاتا ہے کہ خوشبو دور دور سے لوگوں کو بلانے لگتی ہے، گہما گہمی اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ شاعروں اور ادیبوں کا بیٹھنا دوبھر اور بات کرنا محال ہو جاتا ہے لیکن صد شکر کہ یہ دور جب بھی آیا چند مہینوں کا مہمان رہا۔

صفائی ستھرائی کا مناسب انتظام نہ ہونے کے باوجود بھی یہ صاف صاف نظر آتا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن مڈل کلاس جیسا ہے۔ بہترین لوکیشن پر ہونے کے باعث سال میں ایک دو بار کوئی ملٹی نیشنل کمپنی ''ایڈ'' کی آڑ میں اس کے رنگ و روغن کو تر و تازہ کر دیتی ہے۔ میں اسے ''واہ'' کا پاک ٹی ہاؤس نہیں کہوں گا کہ یہ ہنوز اپنے پاؤں پر خود کھڑا ہے۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر اقبال آفاقی

اڈورنو کا فلسفہ جمالیات: ایک تنقیدی جائزہ

تھیوڈور اڈورنو فرینکفرٹ کی تنقیدی تھیوری کے اسکول کا سربرآوردہ رکن ہے۔ فرینکفرٹ اسکول کے دیگر اہم اراکین میں سے میکس ہورکھیمر، والٹر بنجامن، ہربرٹ مارکیوزے اور ہیبر ماس کا نام سرفہرست ہے۔ یہ سب لوگ نو مارکسی نظریات کے دعوے دار تھے جن کے پیش نظر مقصد مارکس، فرائیڈ اور ہیگل کے افکار کا تنقیدی جائزہ لے کر روشن خیالی کی جدلیت کی تشکیل نو کرنا تھا تا کہ جدیدیت کے پیدا کردہ مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔ یہ سب لوگ نو مارکسیت کے حامی تھے۔ اور اس بات کے دعوے دار تھے کہ روایتی مارکسی تھیوری بیسویں صدی میں سرمایہ دارانہ معاشروں میں جنم لینے والی غیر متوقع ہیجانی تبدیلیوں کی وضاحت کرنے سے قاصر رہی ہے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کو بیک وقت سرمایہ داریت اور مارکسیت کا نقاد کہا جا سکتا ہے۔ انھوں نے روشن خیالی کی جدلیت کی بھی زبردست مخالفت کی۔ ان کی خواہش تھی کہ کوئی ایسا متبادل راستہ تلاش کیا جائے جو سماجی ترقی کی بے رحم سائنسی جبریت کے بغیر کارگر ثابت ہو۔ ان کو جدیدیت کے ایجنڈے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے منفی اثرات کی تمام تر مخالفت کے باوجود مابعد جدید مفکروں میں شمار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ انھوں نے بہر حال جدیدیت کے منطقی دائرہ کار میں رہ کر ہی معانی کا استخراج کیا۔ ان کو زیادہ سے زیادہ ہائر ماڈرن ازم سے منسلک قرار دیا جا سکتا ہے۔

اڈورنو نو مارکسیت کا پیش کار اور فاشزم کا زبردست مخالف تھا۔ اس کو یقین تھا کہ ایش وز (Auschwitz) کا واقعہ قدیم اخلاقیات کو استفہامیہ نظروں سے دیکھنے اور جدیدیت کے ایجنڈے کو مسترد کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کو یقین تھا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد نئے اخلاقی معیارات اور سماجی اقدار کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ وہ دور جدید کی امریکی کلچرل انڈسٹری کا بھی بہت بڑا نقاد تھا۔ اس کے نزدیک ماس کلچر تحکم کا ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے جو آرٹ کو کلچر کی منڈی میں مال تجارت بنا دیتا اور سرمایہ داریت کے غلبے کو قائم رکھتا ہے، کنزیومر ازم پھیلا رہا ہے۔ ماس کلچر نے لوگوں کو انفرادی ذوق سے محروم کر کے ان کو مطابقت پذیری کی راہ پر لگا دیا ہے۔(1)

اڈورنو اور ہورکھیمر کی مشترکہ کتاب Dialectic of Enlightemnent میں اس موضوع کو مجموعی

طور پر موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اڈورنو کے حوالے سے یہ بات خاص طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اس کی بیسویں صدی کے سوشل فلسفے کی تشکیل نو اور جمالیات کو نئی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوششیں مسلمہ حیثیت کی حامل ہیں۔ ابتدا میں اس نے موسیقی سیکھی۔ فلسفے میں اس کی توجہ کا مرکز کرکیگار اور ہسرل کے افکار تھے جن کا اس نے خصوصی مطالعہ کیا۔ اڈورنو نے پال ٹلچ کی سرپرستی میں کرکیگار کی جمالیات پر مقالہ لکھا اور دو سال تک فرینک فرٹ یونیورسٹی میں لیکچرر کی حیثیت سے کام کیا لیکن نازی نسل پرستوں نے برسر اقتدار آتے ہی اسے یہودیت سے تعلق کی بنا پر یونیورسٹی کی ملازمت سے فارغ کر دیا۔ اڈورنو نے 1934ء میں جرمنی کو خیرباد کہا اور جنگ عظیم دوم کے اختتام تک وہ آکسفورڈ، نیویارک اور جنوبی کیلیفورنیا میں مقیم رہا۔ مختلف یونیورسٹیوں میں درس تدریس کا کام بھی کیا۔ جنگ عظیم دوم کے اختتام پر وہ امریکہ سے فرینکفرٹ واپس آیا۔ یہاں اس نے فلسفہء موسیقی، ادب، ہیگل اور وجودیت پر کتابیں لکھیں۔ سوشیالوجی اور جمالیات پر مضامین تحریر کیے۔ کارل پاپر کے فلسفہء سائنس کو ہدف تنقید بنایا اور ہائیڈیگر کے فلسفہ وجودیت اور لسانی استناد کا انتقاد بھی تحریر کیا۔ وہ تا دم مرگ فرینک فرٹ میں مقیم رہا۔

اڈورنو کی جمالیات پر کتاب Aesthetic Theory اس کی وفات کے بعد 1969ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب اڈورنو کی جدید آرٹ سے زندگی بھر کی وابستگی اور لگن کا ثمر تھی جسے اس نے سیموئیل بیکٹ کے نام معنون کیا۔ اس کتاب کی تحریر کا مقصد احساس اور فہم کے درمیان جدیدیت کی قائم کردہ خلیج کو پاٹنا تھا اور فارم پر content اور تفکر پر محویت کی فوقیت کو درہم برہم کرنا تھا۔ اس نے نہ صرف آرٹ میں حسن اور ترفع کے کردار پر روشنی ڈالی بلکہ آرٹ اور سوسائٹی کے درمیان تعلق کو بھی اہمیت دی۔ اس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جب سے آرٹ نے مذہب اور بادشاہت کی طرف سے نافذ پابندیوں سے نجات حاصل کی ہے اس کی تنقیدی عمل داری میں وسعت اور خود اختیاریت میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آرٹ کی سماج پر تبصرہ و تنقید کی ذمے داری کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ آرٹ میں کھلم کھلا سیاست کا قائل ہے بلکہ وہ تو اس سلسلے میں وصداقت(Truth Content) کے بہت زیادہ مجرد تصور کا دعوے دار ہے لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ صداقت کی معروضیت کا منکر ہے۔ تاہم وہ صداقت کے اس تصور کو رد کرتا ہے جسے آرٹ فیکٹریوں میں بیٹھے ہوئے صداقت کے انسپکٹر مستند قرار دیتے ہیں۔ ان کے محاکے میں صداقت سے زیادہ تنقید کا عمل دخل ہوتا ہے جیسا کہ ہائیڈیگر کی فسطائی وجودیات (Ontology) پر مبنی کتاب ’ہستی اور وقت‘ میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آئی ہے۔ (2) کانٹ کی جمالیات کے برعکس اڈورنو آرٹ کے مواد کو آرٹ کے معروض میں تلاش کرتا ہے نہ کہ موضوع کے ادراک میں۔ اس کے نزدیک صداقت کا تصور ان متعدد رابطوں اور نسبتوں سے معرض وجود میں آتا ہے جن میں ہم زندگی کرتے ہیں۔ جب کہ آرٹ کا کام موضوع سے متعلق اور سماجی روایت

سے منسلک ہے۔ اس تعلق کو آرٹ کے کام کی داخلی جدلیات کے وسیلے سے سامنے لایا جاتا ہے۔

اڈورنو دریدا کے برعکس متن میں معنی کی موجودگی کا قائل ہے اور جدیدیت کی منہاج کے مطابق اسے تلاش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کانٹ اور ہیگل کی فلسفیانہ جمالیات کو جدید آرٹ کے تناظر میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ آرٹ کی سماجی اور تاریخی معنیات پر بھی بحث کی ہے۔ اس کی کتاب 'جمالیاتی تھیوری' کا آغاز اور انجام دونوں آرٹ کے سماجی کردار پر بحث کو محیط ہیں۔ اس حوالے سے اس کے یہاں دو سوال پیش رفت کرتے ہیں۔ پہلا سوال ترمیم شدہ انداز میں ہیگل کے ہی سوال کی بازگشت ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ادب سرمایہ داریت کی موجودہ صورت حال میں زندہ رہ سکتا ہے؟ دوسرا سوال مارکسی فلسفے کی دین ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ادب اس دنیا کو تبدیل کرنے میں مثبت کردار ادا کر سکتا ہے؟ نشان خاطر رہے کہ اڈورنو نے کانٹ کے خالص آرٹ کی ہیئتی خود اختیاریت کو تسلیم کیا ہے لیکن وہ کانٹ کی ہیئت پسندی کو ہیگل کی دانشی معنویت اور مارکس کے آرٹ کی سماجی اہمیت کے بارے میں دعوے کو باہم ملا کر آرٹ کی تھیوری تشکیل دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے یہاں آرٹ کی خود اختیاریت بیک وقت لازمی ہے اور التباسی بھی۔ اس کے نقطہ نظر کی یہ دوطرفگی (Ambivalence) جدید آرٹ کے سماجی کردار کی نشان دہی کرتی ہے۔ اسی حوالے سے اس نے آرٹ کو سوسائٹی کا سماجی جواب دعویٰ قرار دیا ہے۔ (3)

اڈورنو جدید آرٹ کے کام کو ایک مستند سوشل اکائی (Monad) قرار دیتا ہے جس میں وہ تمام ناگزیر تناؤ اور دباؤ موجود ہوتا ہے جو وسیع پیمانے پر سماجی اور تاریخی صورت حال کے تنازعات کی نشان دہی کرتا ہے۔ مستند آرٹ کا نمونہ اسی تاریخی اور سماجی تناظر سے برآمد ہوتا ہے اور اسی نسبت سے اس کی معنویت اجاگر ہوتی ہے۔ آرٹ کے نمونوں میں تناؤ کی یہ کیفیات آرٹ میں سماجی اور تاریخی مواد کے ذریعے داخل ہوتی ہیں جنہیں آرٹسٹ بروئے کار لا کر تخلیق کے عمل سے گزرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب و فن کے کام کی متنازعہ تشریحات سامنے آتی ہیں۔ بہت سے ناقدین کی تشریحات اس لیے غلط ہوتی ہیں کہ وہ تخلیق کے داخلی تناؤ کو سمجھنے میں ناکام رہتی ہیں یا مجموعی طور پر سماج کے اندر موجود تنازعات سے ان کے تعلق کی تفہیم سے قاصر رہتی ہیں۔ اڈورنو کے نزدیک آرٹ کا کام ان تنازعات اور متناقضات کو سمت اور معنویت عطا کرتا ہے لیکن یہ معنویت اجتماع ضدین اور جدلیاتی جوڑوں کی صورت میں خود کا اظہار کرتی ہے۔ اڈورنو کی تھیوری کا فوکس معنویت اور فنکشن کے باہم نقیض دو مقولات ہیں۔ ان مقولات کی وجہ سے اس کی سوشیالوجی آف آرٹ کا تعبیری اور تجربی طریقہ ہائے کار سے اختلاف سامنے آتا ہے۔ آرٹ کی تعبیری اپروچ آرٹ کے کام کے توارثی معنی اور ثقافتی اہمیت پر زور دیتی ہے، تاہم اس کے سماجی اور سیاسی کردار کو کم تر سطح پر رکھتی ہے۔ تجربی اپروچ کسی نمونہ فن کے ظہور میں آنے کی سماجی علتوں کو تلاش کرتی ہے، سماج اور آرٹ میں رشتہ جوڑتی ہے تاہم اس کی تعبیری معنویت

اور اہمیت کے بارے میں سوال نہیں اٹھاتی۔ اڈورنو کا مطالبہ یہ ہے کہ معنی اور فنکشن کے مقولات کو ایک دوسرے کے تناظر میں سمجھنا چاہیے، باوجود اس کے کہ یہ دونوں مقولات باہم متضاد ہیں۔ بہر حال جب تک آرٹ کی تعبیری معنویت کا سوال نہ اٹھایا جائے آرٹ کے عمل کی سماجی حیثیت کو سمجھا نہیں جا سکتا۔ یوں اوڈورنو اس مفہوم کو اہمیت دیتا ہے جو سماجی وسیلے سے برآمد ہونے کے باوجود دانش سے وابستہ ہوتا ہے۔

آرٹ کی ابتدا کے بارے میں اڈورنو کا خیال ہے کہ یہ صرف کسی انفرادی خواہش یا کوشش کا نتیجہ نہیں تھی۔ یہ سلسلہ عام زندگی میں فوری طور پر کام آنے والی اشیاء کی صناعت اور عباداتی رسومات اور دعاؤں سے شروع ہوا تھا۔ خصوصاً معبدوں کی تزئین و آرائش کے سامان اور عبادت میں بروئے کار آنے والے دعائیہ کلمات اس کا نقطۂ آغاز بنے ہوں گے۔ چونکہ دعاوں کو پر اثر بنانا مقصود تھا اور پھر عبادت گزاروں کو مسحور کرنا ضروری تھا اس لیے ردھم، فارم اور موسیقی کا قرینہ تلاش کیا گیا۔ اس طرح آرٹ میں ظاہری ہیئت کو قانون کی حیثیت حاصل ہوئی۔ (4) تہذیب کے معرض وجود میں آنے سے بہت پہلے اشیاء، شبیہات اور اصوات کو مخصوص انداز میں پیش کرنے کی ابتدا ہو چکی تھی۔ میدان جنگ یا شکار کے لیے جانے سے پہلے جسموں کو رنگوں اور لباسوں سے مزین کرنے کا سلسلہ بھی چل پڑا تھا۔ مذہبی رسوم ادا کی جاتیں تو ڈھول پیٹے جاتے اور پرکھوں کی شان میں حمدیہ گیت گائے جاتے۔ یہ درست ہے کہ ان جادوئی رسوم کا مقصد قبائلی معاشروں کو مربوط اور قائم رکھنے کے علاوہ آفات و بلیات سے محفوظ رکھنا تھا۔ یہ سب چیزیں، شبیہات، آوازیں اور الفاظ ماورائی قوتوں کی امداد کی طلب، قبائلی اتحاد اور تنظیم کو مضبوط کرنے کی خاطر استعمال میں لائے جاتے۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ مذہبی رسومات میں کام آنے والی اشیاء کی سماجی زندگی میں آفادی حیثیت بھی مسلم تھی مثلاً کپڑا اور برتن وغیرہ۔ اسی دوران انسانی ذہن پر مذہبی اور بعد ازاں شاہی رسومات میں بروئے کار آنے والی کچھ اشیاء کی ارفعیت واضح ہوتی چلی گئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ ان ارفع اشیاء کی صناعت میں اعلیٰ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ چنانچہ مذہبی رسومات میں کام آنے والی اشیاء بنانے والوں کے لیے عملی تربیت کا انتظام بھی کیا جانے لگا۔ اس کی مثال نیو گنی کے وہ لوگ ہیں جو طوطم کی کندہ کاری کے کام میں کمال مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

یقیناً عہد عتیق کے صناعوں میں کچھ ایسے لوگ بھی منظر عام پر آئے ہوں گے جنھیں اپنی معجزہ آسا صلاحیتوں پر تفاخر کا احساس ہوا ہوگا۔ اس امتیازی شان کا احساس کہ وہ نہ صرف ارفع اشیاء بنا سکتے ہیں بلکہ دوسروں کی بنائی ہوئی چیزوں کی قدر پیمائی بھی کر سکتے ہیں۔ ان معجزہ کاروں کی تخلیق کردہ چیزوں، شبیہوں اور حمدیہ ترانوں کی اثر کاری پر لوگ عش عش کر اٹھتے ہوں گے۔ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور ہنرمندی کے احساس اور لوگوں کی داد و دہش نے تہذیب کے عمل کو مہمیز دی ہوگی۔ ہنر اور فن کی طاقت کے احساس کا اگلا قدم فن کار

وں کو اپنی علیحدہ حیثیت منوانے کی آرزو تھا۔ عہد عتیق میں اس موڑ کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ موڑ تاریخ ساز اس لیے قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس نے ہنر مند افراد میں یہ وقوف پیدا کیا کہ اس میں ہیئت سازی اور آزادانہ معنی کی تشکیل کی امتیازی صلاحیتیں وافر مقدار میں موجود ہیں۔

جدیدیت کے دور میں اعلیٰ اور خالص آرٹ کے تصور کی شروعات سترہویں صدی کے اواخر میں ہوئیں۔ اعلیٰ آرٹ کو قدیم آرٹ کے تصور کی ترقی یافتہ صورت قرار دیا جا سکتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ انفرادی ذوق اور حسیت کو اہمیت دی جانے لگی، اب آرٹسٹ آزادی سے اپنی منشا کے مطابق تخلیقی کام کرنے لگا۔ اس کو مذہب اور دربار شاہی کے مقتضیات کی پاسداری سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جدیدیت نے اسے وہ وسعت فراہم کی جس میں وہ خودمختاری سے آرٹ اور معنی کی تشکیل دے سکتا تھا۔ انیسویں صدی میں جب شہریت، سرمایہ داریت، اور صنعت وتجارت کو عروج حاصل ہوا تو آرٹ برائے آرٹ کا تصور سامنے آیا۔ اس بات پر اصرار کیا جانے لگا کہ آرٹسٹ کسی نظریے، ہیئت یا مقصدیت کا پابند نہیں۔ وہ آزادانہ موضوع اور متن کا انتخاب کر سکتا ہے اور ہنر مندی سے کام لے کر آرٹ کے مختلف شعبوں میں کرشمے دکھا سکتا ہے۔ جدیدیت نے سیکولرازم، انفرایت اور داخلیت کے معاملات کو آرٹ میں فوقیت عطا کی۔ اور مقصدی تقاضوں کے مقابلے میں آرٹ برائے آرٹ کے تصور کو اہمیت دی جانے لگی۔ یوں آرٹ کے آوانت گاردے تصور کو رواج ملا۔ آرٹ میں تاثریت جدیدیت کی پہلی تحریک بن کر سامنے آئی۔ جدیدیت کے دور میں آرٹ کے جن معروف شعبوں کو عروج حاصل ہوا وہ یہ تھے۔ فکشن۔ شاعری، موسیقی، ڈرامہ، مصوری، سنگ تراشی، رقص اور فن تعمیر۔ ان شعبوں میں گزشتہ چار سو سالوں میں مسلسل ترقی ہوئی ہے، ان شعبوں کو انسان نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے بے پناہ اور حیرت انگیز اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ تخلیقی صلاحیتوں کے فروغ میں انسان کی منشا اور خوداختیاریت نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اس سلسلے میں امتیاز اور تفاخر کے احساس کا عمل دخل ہمیشہ اہم رہا لیکن ظاہر ہے کہ ان تخلیقی صلاحیتوں کے عقب میں موجود ثقافتی عوامل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو مذہبی رسومات اور سماج کی افادی ضروریات کے نتیجے میں تشکیل پائے تھے۔ انھیں حقائق کے پیش نظر اڈورنو ہائیڈیگر کی طرح مستند تخلیقی اظہار کو ہر چیز پر فوقیت دیتا نظر آتا ہے۔

اگرچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید آرٹ کا سلسلہ مذہبی اور افادی ہنر مندی سے جڑا ہوا ہے لیکن جدید آرٹ کی وجہ امتیاز وہ باکمال انفرادی صلاحیتیں ہیں جن کو بروئے کار لا کر جدید انسان معنویت سے بھرپور آرٹ کی نئی ہیئتیں منظر عام پر لانے میں کامیاب رہا۔ انفرادی حسیت اور خوداختیاریت کو فوقیت دینے کے نتیجے میں آرٹ کے تمام شعبوں میں ترقی کا جو سلسلہ رواں ہوا وہ ابھی تک پورے جوش وخروش سے چل رہا ہے۔ اڈورنو اس منظر نامے کو سامنے رکھ کر ہی دعوئی کرتا ہے کہ آرٹ کے وہ نمونے جو معنی کی اس واضح شکل وصورت کے ساتھ

ہمارے حسی تجربے کا حصہ بنتے ہیں صرف وہی آرٹ کہلانے کا جواز (Raison d'etre) رکھتے ہیں۔ (5) گویا آرٹ کے کام میں نئے معنی کی آزادانہ تشکیل ہی آرٹ کا جواز ہے۔ لیکن اڈورنو اس بات کو بار بار دہراتا ہے کہ آرٹ کا کام کبھی بھی نفسیاتی، سماجی، معاشی اور افادی محرکات سے آزاد نہیں رہا۔ وہ آرٹ برائے آرٹ کے تصور کو نہیں مانتا۔ لیکن اس بات کا قائل ہے کہ معنی کی تشکیل کی طرف توجہ بہر حال ایک ایسی کیفیت ہے جس کی وجہ سے کسی آرٹسٹ کو شناخت ملتی ہے۔ آرٹ کا کام مصوری، کندہ کاری، سنگ تراشی، گلوکاری یا شاعری اور فکشن کسی بھی شعبے سے متعلق ہو سکتا ہے۔ افادیت اور ثقافتی پس منظر کی اپنی حیثیت اور مقام ہے لیکن آرٹ کا امتیاز اس بات پر منحصر ہے کہ کیا اس میں معنی کی آزادانہ تشکیل ہوئی ہے یا نہیں۔ معنی کی آزادانہ تشکیل کی صلاحیت سے ایک ایسی فارم سامنے آتی ہے جو نہ صرف آنکھوں اور کانوں کو بلکہ ذہن کو بھی متاثر کرتی ہے۔ انسان تعریف کیے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اڈورنو نے ایک اور نکتہ اس سلسلے میں یہ پیش کیا ہے کہ آرٹ کو مذہبی اور شاہی رسوم اور ان کے متعلقات سے آزادی کے بعد انسانیت کی تحریک کے ذریعے آرٹسٹ کی خود مختاری کو تقویت ملی ہے۔ (6)

یہاں اس امر کی نشاندہی ضروری ہے کہ آزادانہ معنی کی تشکیل کی امتیازی صلاحیتوں کو جاری و ساری رکھنے کے لیے اپج کی تلاش آرٹسٹ کا اولین فریضہ ہے۔ اگر وہ اپنے کام کو محض نقالی اور تکرار تک محدود رکھتا ہے، کسی منصوبے کے تحت کام کرتا ہے، معاشی افادیت یا مذہبی تقاضوں کے پیش نظر رکھ کر آرٹ کا کام کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آزادانہ معنی کی تشکیل کے فریضہ سے دست بردار ہو چکا ہے۔ اس کے کام کی نوعیت صنعتی عمل تو کہلا سکتی ہے تخلیقی عمل نہیں۔ پہلے سے موجود آرٹ کے کام کی نقل یا اس کی بازیافت تخلیقی عمل نہیں ہوتا۔ اسے آرٹ کا نام دینا آرٹ کی توہین ہے۔ آرٹ نئی معنویت کی اور نئی ہیئت میں آزادانہ اظہار کا نام ہے۔ اڈورنو کے خیال میں آرٹ کو خود اپنی مخالفت کرنی چاہیے۔ اپنے تعقل کے تضاد طور پر سامنے آنا چاہیے۔ ضروری ہے کہ آرٹ اپنے بارے میں بطون کی گہرائیوں تک بے یقینی میں مبتلا ہو۔ (7) تب کہیں جا کر اوریجنل آرٹ صورت پذیر ہوتا ہے۔ اوڈورنو کا یہ دعویٰ مابعد جدیدیت کی پیداوار ہے۔

یہ درست ہے کہ آرٹ بہر طور پر کسی نہ کسی روایت کے بطن سے برآمد ہوتا ہے، اس کی ایک مخصوص صنف اور نوع ہوتی ہے۔ مراد یہ کہ مکمل طور پر روایت شکنی ناممکن ہے۔ تاہم اوڈورنو کا یہ دعویٰ بھی درست ہے کہ محض کسی روایت کے اتباع یا نوع کے اندر رہ کر کامیاب آرٹ تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ ہم کسی فارمولے کو بروئے کار لا سکتے ہیں تاہم اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس فارمولے سے ماورا کس طرح ہوا جائے کیونکہ آرٹ کا اسرار تو اس ماورائیت کے عمل میں پوشیدہ ہے۔ نئے پن کے انکشاف سے مشروط ہے۔ ایذرا پاؤنڈ کے نزدیک آرٹسٹ کا کام فارمولے کو نیا بنانا ہے۔ روایت اور نوع کے اندر رہ کر موضوع کے نئے امکانات دریافت کرنا ہے۔

جذباتی اظہار اور ہیئت کی پاسداری کرتے ہوئے معنی کی نئی جہتوں کی آزادانہ تشکیل اور تحسین اس کا فریضہ ہے۔ ان ناگزیر شرائط پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آرٹ کے کام میں تجریدیت کا عمل دخل بڑھا کر تعقلاتی اختراعات کو رواج دیا جائے۔ وہ اختراعات جن کی ہنر (Craft) کسی حالت میں اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ جدید آرٹ ماضی کی روایت کے بالمقابل مجرد ہو چکا ہے۔ یہ سحر کاری کی صلاحیت سے محروم ہے۔ مزید یہ کہ مجرد آرٹ اس حقیقت کے بارے میں کوئی بات کرنے کے قابل نہیں جس نے ابھی رونما ہونا ہے لیکن اس کے باوجود مجرد آرٹ اپج کا طلب گار ہے اور تکرار اور یکسانیت کی تذلیل کے خلاف سراپا احتجاج ہے۔(8)

آرٹ کے کام میں یکسانیت کے پریشان کن دباؤ کے خلاف احتجاج کا مطلب خاص طور پر یہ یاد دلانا ہے کہ ہماری زندگیاں محض تکرار تک محدود نہیں۔ ان کی معنویت بہت آگے تک جاتی ہے۔ یعنی یہ آزاد اور تسلی بخش معنی کی تشکیل کر سکتی ہیں۔ کم از کم اصولی طور پر اور مستقبل کی حد تک۔ محض وقت گزاری کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہنا ہی زندگی نہیں۔ ہم زندگی کو پوری جذباتی سرمایہ کاری اور تخلیقی عمل کے ساتھ آزادی سے گزار سکتے ہیں۔ ہمیں خاموش اداسی اور بے بسی کی زندگی سے بچنا چاہیے۔ اور اوریجنل آرٹ کی تخلیق زندگی کو عمومی طور پر مستقبل کی امید اور بشارت دیتی ہے۔ اوڈورنو نے اس حقیقت کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"نیاپن سماجی تخلیق نو کی جمالیاتی روح ہے اور نامختتم معموریت کے وعدے کے ساتھ وقوع پذیر ہوتا ہے --- آرٹ کا کام تجربی دنیا سے خود کو الگ کر کے ایک نئی دنیا کو سامنے لاتا ہے --- یوں آرٹ کے نمونے کتنے ہی المیہ کیوں نہ ہوں ان کا رویہ قبل تجربی طور پر تصدیق کی طرف مائل ہوتا ہے۔"(9)

اڈورنو کرافٹ کو ایک انداز میں آرٹ کی روایت کا رکن قرار تو دیتا ہے لیکن اس کے نزدیک یہ وہ رکن ہے جو اپج کے اصول سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اصولی طور پر مطابقت کا حامل ہوتا ہے لیکن مطابقت پذیری آرٹ کے مقاصد کی تکمیل نہیں کرتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جدیدیت کی داخلیت پسندی اور بت شکنی کا دفاع کرتا نظر آتا ہے۔ اڈورنو کے خیال میں جمالیاتی موضوعات زوال پذیر ہیں۔(10) اور پھر بعد میں موسیقی کے تاریخی ارتقا کے بارے میں لکھتے ہوئے وہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ آرٹ کے اوریجنل کاموں کے لیے توارثی مواد اور تیکنیکی تدابیر کو نکتہ آغاز کے طور پر لینا ضروری ہے۔ وہ جدید آرٹ کے نمونوں کی داخلیت پسندی اور بت شکنی کو اوریجنل کی مثال قرار دیتا ہے، اس کا آرٹ میں اوریجنل پر زور ایک ایسے وعدے (Promesse de bonheur) کا علمبردار ہے جو سماجی زندگی میں بڑے پیمانے پر مقبول ہے۔(11) خالص نئے پن پر نہ صرف ایمرسن اور تھوریو نے اصرار کیا ہے بلکہ کانٹ اور ہیرلڈ بلوم کے یہاں بھی اس کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ورڈزورتھ بھی خالص نئے پن یعنی اوریجنل کا زبردست قائل رہا ہے۔ اس کے نزدیک آرٹ کے کام میں نقالی اور مطابقت پذیری کے زیر اثر بنائی جانے والی اشیاء کے بالمقابل اوریجنل کام میں نجات دہندہ قوت کا غلبہ

نظر آتا ہے۔ بقول ورڈزورتھ یہ عمومی دنیا ہمہ وقت ہمارے ساتھ ساتھ ہے؛ جلد یا بدیر/ہم دنیا کے لین دین میں اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر دیتے ہیں۔ (12)اس میں روح کو جھکا دینے کا رجحان غالب ہے/گھٹیا پن کے بھاری بوجھ کے نیچے/اور موت کی کائنات کو متبادل بنا لیتے ہیں/اس کا متبادل جو روشنی اور زندگی کے ساتھ متحرک ہے/ جو حقیقی اور الوہی ہے۔ (13)لیکن سامع کی حیثیت سے آرٹ کی تشکیل میں شراکت (جو ہم فطرت کے ردِ عمل کے طور پر کرتے ہیں) کے نتیجے میں ہم وہ طاقت۔۔۔ وہ اذہان بن سکتے ہیں جن کا صدور خداوند خدا سے ہوتا ہے (14)اوریجنل کے اظہار کا تجربہ نہ صرف ترفع بخش ہوتا ہے بلکہ ان کو جو اس تجربے سے دوچار ہوتے ہیں طاقت ور بھی بنا دیتا ہے۔ یہ نقطہ نظر امریکہ میں نئی تنقید اور برطانیہ میں عملی تنقید کا مستعمل مفروضہ ہے۔ ساخت کی طرف مائل اور ڈرامے کی طرف جھکی ہوئی موسیقی، رقص، مصوری اور سنگ تراشی کے فنون سے متعلق تنقید معنی کی تشکیل کے پیراڈائم کے طور پر سامنے آئی ہے جس میں برجستگی اور حسیت کا افہام اور تعقل آپس میں گندھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ڈبلیو جی کیلی نے لکھا ہے کہ برجستگی اور تنظیم کا مکمل اتحاد ہمیشہ انسانی زندگی کے پیش نظر ایک مرکزی سوال کے طور پر رہا ہے۔ (15)وہ اس سوال کا جواب آرٹ کی عمومی تشکیل بالخصوص ورڈز ورتھ کی شاعری میں تلاش کرتا ہے اور ورڈز ورتھ کو اس کی بہترین مثال قرار دیتا ہے۔ جمالیات کے ماہرین کی زبردست خواہش رہی ہے کہ برجستگی اور تنظیم، حسیت اور تفکر، ترنگ اور ہنر مندی کا کامل وصال ہو۔ اس خواہش کی جزوی تکمیل رقص اور سپورٹس میں وقوع پذیر ہوتی ہے جس کی تعریف کیے بغیر ہم رہ نہیں سکتے اوریجنل آرٹ اس خواہش کا اظہار ہے اور اس خواہش کی آبیاری کرتا نظر آتا ہے۔ اڈورنو کے مطابق جدید آرٹ داؤ فریب سے کام لے کر عدم شناخت کو شناخت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ (16)اوریجنل آرٹ انسانیت کے مرکزی دروازے کا کام دیتا ہے۔ انسان کو اس بلندی کی طرف لے جاتا ہے جو مکمل انسان بنانے کے لیے ضروری ہے اور جو زیادہ بامعنی زندگی کا سبب ہے۔

اگر چہ اڈورنو کے فلسفہ آرٹ میں معنی کی تشکیل میں نئے پن اور اوریجنل کی اہمیت اور Truth Content پر اصرار کی بحث اس کے منفی جدلیت کے تناظر میں نہایت پرکشش ہے لیکن گذشتہ چالیس پچاس سال میں اس کے ان تصورات کو زبردست تنقید کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ مابعد جدیدیت کے حامیوں نے اس کی جمالیاتی تھیوری کو مسترد کر دیا ہے۔ چونکہ اڈورنو ہیگل اور مارکس کی Teleologies سائنسی نظریاتِ علم (Epistemologies) کا ناقد ہے، اس لیے اس کے یہاں آرٹ کا سچ جدلیاتی، انکشافی اور غیر استحضاری ہوتا ہے، نظریاتی نہیں۔ اس وجہ سے اسے بہر حال جدیدیت کے حامی فلسفیوں میں ہی شمار کیا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ استحضاریت، تعقل، سبجیکٹ، جدلیت اور صداقت کے تعقلات سے انکار کرتا ہے نہ ہی آرٹ کے سماجی کردار کا منکر ہے۔ جہاں وہ آرٹ کی تاریخی اور سماجی معنیات کے تناظر کو اہمیت دیتا ہے وہاں اس نے آرٹ

کی فلسفیانہ قدر پیمائی کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے۔ اس کے یہاں خالص نئے پن کے تصور کی معنیات میں نابغے اور ہیرو کا تصور قائم ودائم ہے۔ یہ موجودگی اس کی اپنی منفی جدلیت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ جہاں تک انفرادیت پسندی کا تعلق ہے تو یہ یورپی بورژوا طرز زیست کی دین ہے جس نے آرٹ کو تجریدی اظہاریت کا راستہ دکھایا۔ اظہاریت جو گھس پٹ کر کلیشے بن چکی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اوریجنل کا تصور بھی بے رنگ وبو اور روح سے عاری ہو چکا ہے۔ ٹام وولف نے 1975ء ہی میں شکوہ کرنا شروع کر دیا تھا کہ آرٹ بالخصوص مجرد اظہاریت پسند مصوری میں انفرادی ہیروازم کا کھیل باسی کڑی میں ابال بن چکا ہے۔ (17)

ہال فوسٹر نے ایک جگہ لکھا کہ کوئی نظم یا تصویر لازمی طور پر مراعات یافتہ نہیں ہوتی اور نہ ہی فن کے کسی نمونے کو جدیدیت کی زبان میں یکتا، علامتی اور بصیرت افروز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب تو مابعد جدیدیت کے معنوں میں یہ تو پہلے سے لکھی گئی، تمثیلی اور اتفاقیہ تخلیق کا درجہ رکھتی ہے۔ (18) اب سوال یہ کیا جا رہا ہے کہ ہم آرٹ کے نمونوں میں وژن کی یکتائیت (Originality) پر اصرار کیوں کرتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف گھسے پٹے تصورات کے حامل ہیں بلکہ جماعتی اور صنفی تعصّبات سے بھرپور ہیں۔ ان کا بصیرت افروزی سے کیا تعلق؟ بصیرت افروزی بذات خود ایک سوالیہ نشان ہے۔ کسی بھی مصنف کی تحریر کی تشکیل تفرقہ بازی، لسانی تعصّبات اور سماجی تقاضوں کی رہین منت ہوتی ہے۔ اس میں بہت کم تکملیت اور ربط ہوتا ہے۔ یہ بھی استدلال سامنے آیا ہے کہ تخلیقی آرٹسٹ کا تصور زمانہ جدید کی ایجاد ہے۔ نشاۃ ثانیہ سے پہلے آرٹسٹ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ آرٹ سے متعلق کام کرنے والوں کو کاری گر یا ہنرمند کا نام دیا جاتا۔ یہ ہنرمند عام طور پر اشرافیائی محلات کی تزئین یا گرجاؤں کی آرائش کے لیے معاوضے پر کام کرتے۔ مثلاً مائیکل انجلو، رفائیل اور لیونارڈو داونشی ایسے کمال فن کے حامل آرٹسٹوں کو ان کے زمانے کے یورپی جاگیردار ہنرمندوں کے ذیل میں ہی شمار کرتے

لیکن جب نشاۃ ثانیہ کا دور عروج کو پہنچا تو فن اور ہنر کی دنیا میں انفرادی امتیاز کو قدر اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اٹھارھویں صدی تک آتے آتے حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ اب ہنرمند مصوروں، مصنفوں اور موسیقاروں کو جاگیردار اشرافیہ اور ویٹیکن سے متعلق پادریوں کی سرپرستی حاصل نہ رہی۔ ان حالات میں انہیں اپنی تخلیقات بیچ کر گزر بسر کرنا پڑی۔ شہروں میں صنعت وتجارت کے پھیلنے سے بورژوا طبقے کو عروج حاصل ہوا تو اوریجنل اور تخلیقی آرٹ کے تصور کو مہمیز ملی۔ آرٹ کے اسی تصور کو سامنے رکھ کر ورڈز ورتھ جیسے شعراء اور کانٹ جیسے نظریہ سازوں نے جمالیات کے جدید نظریات تشکیل دیئے جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مصنف اور آرٹسٹ حسن وجمال کے ذوق کے حوالے سے امتیازی خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ وہ تخلیقی وجدان والہام سے لیس ہوتا ہے۔ عالم غیب سے اس پر مضامین خیال اترتے ہیں، اس کی حیثیت نابغے کی

ہوتی ہے۔ نوائے سروش کا تصور اسی نظریے کا تسلسل ہے۔ گویا آرٹ کی ماورائیت کے تصورات قدیم (مشرق) بھی ہیں اور جدید (مغرب) بھی۔ اٹھارھویں صدی کے بعد ان نظریات کے مسلسل فروغ کی بنا پر آرٹسٹ اور ہنر مند کے درمیان فرق بڑھتا چلا گیا۔ ہنر مند بے چارہ پاپا گل رہا اور آرٹسٹ آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرنے لگا۔ اب آرٹسٹ چونکہ ایک طرح سے آسمانی مخلوق بن چکا تھا اس لیے ہنر مند کے مقابلے میں اس کو بہت زیادہ سماجی اور معاشی پذیرائی ملی۔ ۔ اسے نابغے اور سماجی ہیرو کے سنگھاسن پر بیٹھا دیا گیا۔ ان حالات میں آرٹسٹ کی ذات میں احساس تفاخر اور نرگسیت کا زور شور سے در آنا کوئی حیران کن بات نہیں تھی۔ ہیگل نے اسے معنویت کا سرچشمہ اور مارکس نے اسے سماجی شعور کا پاسبان قرار دے کر سماجی قیادت کے تصور سے منسلک کر دیا۔

یہ تصور بیسویں صدی کی ابتدا میں ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے لگا تھا۔ پھر دو عظیم جنگوں میں جہاں اور بہت سے برتر نظریات زمیں بوس ہوئے وہاں نطشے کا ہیرو، ہیگل کا نابغہ اور مارکس کا انقلابی قائد ایسے تصورات کو بھی مشکوک قرار دیا جانے لگا۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ مغرب کے لبرل حلقوں میں نظریاتی کوچہ گردوں بالخصوص ہیگل اور مارکس حامیوں کے نظریاتی Bag and Baggage کے خلاف نفرت کا سیلاب امڈ آیا۔ وجودی فلسفہ اسی منفی ردِعمل کے بطن سے برآمد ہوا۔ لیکن مستند آدمی کی نرگسیت کو وجودیت نے بہر حال قائم رکھا۔ مارکسیت میں بھی مصنف کی مارکسی نظریہ کے پشت بان کی حیثیت سے اہمیت جوں کی توں رہی۔ تاہم اس تصور کو 1968 کے پیرس میں بائیں بازو کے طلبا کی تحریک کی ناکامی کے نتیجے شکست ریخت کا سامنا کرنا پڑا۔ بعد میں ردِ انقلاب کے فلسفے کے حامل مارکسی مفکرین نے بھی چیلنج کر دیا۔

حق اور سچ کے بارے میں نظریاتی اختلافات بھی اسی طرح منظر عام پر آئے۔ نو آبادیاتی دور میں یہ مسئلہ برتر تہذیب کے دعوے اور سامراجی سیاست سے متضمن تھا۔ سامرجی نو آبادکاروں اور مشنریوں نے حق اور سچ کی تعبیر طاقت کی بنیاد پر کی۔ اسے دنیا پر مسیحیت کے تسلط اور مغربی تہذیب کے نفوذ کے لیے متاثر کن سائنسی زبان اور منطقی لب ولہجہ عطا کیا جس کا اولیں مقصد طاقت کی بنیاد پر کئے گئے فیصلوں کو جائز اور درست قرار دینا تھا۔ پہلا دعویٰ یہ تھا کہ مسیحیت مطلق صداقت کی حامل ہے، باقی مذاہب یا تو باطل ہیں یا کم تر درجے کے ہیں۔ دوسرا دعویٰ مغربی ثقافت کی برتری سے متعلق تھا۔ انھوں نے مغربی ثقافت کی چمک دمک اور حسن و جمال کی لشک پشک سے بھی دنیا کو مرعوب کیا۔ یورپ کی فوجی اور معاشی میدانوں میں بے پناہ کامیابیوں کو مسیحی مذہب کی صداقت کی خدائی تصدیق قرار دیا۔ صداقت کا تصور سائنسی اثباتیت اور تجربی عقلیت کی اجارہ داری بن گیا۔ مسیحی نظریہ صداقت کا یہ غلغلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک کہ مارکسزم نے جنم نہیں لیا۔

مارکسی تحریک کو یورپ کے طول عرض میں جرمن فاشزم اور برطانوی سرمایہ داریت سے نبرد آزما ہونا پڑا

۔ ادھر انگلینڈ اور جرمنی کے درمیان نوآبادیاتی تنازعات کے نتیجے میں تناو بڑھتا چلا گیا۔ پھر کیا تھا؟ دیکھتے ہی دیکھتے یورپ میں نئی صداقتوں کا انبار لگ گیا۔ نظریہ سازوں نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ ہر کوئی اپنے اپنے حق اور سچ کا ڈھنڈورہ پیٹنے لگا۔ ڈارون، فرائیڈ، نطشے اور مارکس کے طاقت پرستانہ نظریات نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران مذہب، سائنس، اساطیر اور طاقت کی سیاست کے باہم ادغام کے نہایت بھیانک نتائج سامنے آئے۔ جرمنی اور جاپان عبرت کا نشان بن گئے۔ لیکن سب سے بھیانک نقصان مشترکہ انسانی اقدار کا ہوا جس کے نتیجے میں حق اور سچ کا تصور ہی مشکوک قرار پایا۔ کافکا کی کہانیاں اور ناول اسی تشکیک کے گرداب میں ڈوبتے آدمی کی کہانی ہیں۔ ہرمن ہیسے، کامیو، میلراکس موراویہ اور تھامس مان وغیرہ کی تحریریں سب اسی گرداب کے میں ڈوبتے آدمی کی کہانیاں ہیں۔ خارج کی اس گردابی صورت حال میں طے یہ ہوا کہ صداقت کا کوئی معروضی معیار ہے نہ پیمانہ۔ سارتر کے جملے Existence preceds essence کا ایک مطلب یہ بھی تھا۔ سائنس جو کبھی صداقت کا معیار فراہم کرنے کا دعویٰ کیا کرتی تھی وہ بھی مردود، مشکوک اور انسان دشمن قرار پائی۔ وہ سب دعوے جو کائنات کی ہمہ گیر تعبیر کا کام کیا کرتے تھے فرینکن سٹاین کے دیو روسیاہ کی باقیات شمار ہوئے۔

کیمبرج کے فلسفی وٹگن اسٹائین نے صداقت کو Language Games میں تبدیل کر دیا۔ یہ کام صداقت کو کبوتر خانوں میں ڈھالنے کے مترادف تھا۔ یوں صداقت کا عالمگیر تصور مجروح ہوا۔ لیکن اس ٹوٹ پھوٹ کے باوجود صداقت کا تصور کسی نہ کسی طرح قائم رہا۔ دوسری طرف فرینکفرٹ سکول نے تنقیدی تھیوری کے ذریعے روشن خیالی کی جدلیت اور مارکسی معیشت مرکز سیاست کے بخیے ادھیڑنے کا کام سرانجام دیا۔ پھر ہوتے ہوتے مابعد جدیدیت کا دور آن لگا جس نے جدیدیت کے نظام فکر کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہر قسم کے معروضی معیارات اور مہابیانیے لات و منات قرار دے دیے گئے کہ ان کی وجہ سے یورپ قتل گاہ میں تبدیل ہوا۔ ہورکھیم اور اوڈورنو نے جدیدیت پر الزامات کی تصدیق کے لیے Dialectic of Enlightenment تحریر کی۔ پھر مابعد جدیدیت اور پس ساختیات والوں۔ لیوتار، بادریلا، فوکو اور دریدا نے ثابت کر دیا کہ صداقت کا ہمہ گیر تصور انسان کی عملی فراست کا پھیلایا ہوا جال ہے تاکہ تہذیب و تمدن کا تحفظ کیا جا سکے اور انسان کو آسانی سے نظام کے دائرے کا پابند رکھا جا سکے۔

حالانکہ صداقت محض ایک اضافی حقیقت ہے جو زبان، ثقافت اور سماج سے مشروط ہے۔ ہم سیاق وسباق کے اندر رہ کر ہی اس کے بارے میں بات کر سکتے ہیں۔ مابعد جدیدیت کے حامیوں کا دعویٰ ہے کہ صداقت اور حقیقت کا ادراک ان عوامل کے باہمی تعامل سے بنتا بدلتا ہے جسے ہم زبان کے ذریعے ہی بیان کر پاتے ہیں۔ مزید یہ کہ صداقت کا تصور زمان و مکان کے تقاضوں سے بھی منسلک ہے۔ صداقت کو معروضی اور آفاقی بنانے

کی ہر کوشش دوسروں کے استحصال کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ہر مہابیانیہ یا آفاقی نظریہ صداقت طاقت اور غلبے کے حصول کا اعلامیہ ہے۔ مارکسیت ہو یا مذہب ہر مہابیانیے کا مقصد معروضی صداقت کے بہانے دوسروں پر غلبہ پانا ہے۔ ان انکشافات کے نتیجے میں حتمی صداقت کی تلاش کاروان سرائے کی کہانیوں میں موجود ہو تو ہو، عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس ساری بحث سے یہ کہنا مقصود ہے کہ پتہ نہیں وہ کون سا سچ ہے جس کی تلاش اڈورنو کے نزدیک آرٹ کی ذمے داری ہے۔ کیا ایسا تو نہیں کہ وہ انیسویں صدی کے غائی تصور جمالیات کے دائرے میں ہی سرگرم عمل ہے؟

اڈورنو کا اٹھایا ہوا معنی کی تشکیل کا سوال بھی مابعد جدید تناظر میں متنازع ہے۔ اس کا تعلق Cartesian Epistemology سے ہے۔ معنی کی تشکیل کا سوال ڈیکارٹ کے افکار کا مرکز تھا۔ جدیدیت کے دور میں اسے تقویت اور فروغ حاصل ہوا جب یورپی انسان نے 'میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں' کے اصول پر عمل کرتے ہوئے علم کے ہر میدان میں تحقیق و تدقیق کام شروع کیا جس کے نتیجے میں سائنس، جغرافیہ سماجیات، بشریات اور تہذیب و ثقافت کے شعبوں میں انقلاب آ گیا۔ نت نئی دریافتیں اور انکشافات سامنے آنے لگے۔ مستشرقین نے مختلف طریقوں سے متون کے در وا کرنے اور ان کی تعبیر و تشریح کا سلسلہ آغاز کیا۔ اس سلسلے میں سوشیور کی کلچر اور زبان کے بارے میں ساختیاتی اپروچ نے سنگ میل کردار ادا کیا جس میں متن میں معنی کی مرکزیت اور معنی کی پوشیدہ تہوں کی دریافت کی تلاش پر اصرار کیا گیا۔ جدیدیت کا سارا زور ساخت مرکزیت پر ہے؛ ساخت کے پرت کھولنے پر ہے۔ چنانچہ ڈارون، مارکس اور فرائیڈ سے لے کر، یونگ، جیمز فریزر اور ٹائیلر تک سب کی توجہ حقائق و معروضات کی ہمہ گیر توجیہ اور برتر معنی کی نقاب کشائی پر مرکوز رہی۔ اس کے برعکس مابعد جدیدیت اور پس ساختیات کے حامیوں خصوصاً دریدا کے رد تشکیل کے نظریے نے متن میں کسی مرکزی اسرار یا متعینہ معنی کی موجودگی (Presence) سے ہی انکار کر دیا۔ متن میں معنی متعین نہیں ہوتے۔ ہر نئے تناظر میں ان کا التوا وقوع پذیر ہوتا رہتا ہے۔ لوگ اپنے اپنے رجحانات کے تحت اور شعوری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ متن میں معنی کو تلاش کرتے ہیں۔ لیوتار ہمہ گیریت کے ہر تصور کی نفی کرتا اور معنی کو چھوٹے چھوٹے بیانیوں میں دیکھنے کا قائل ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک کسی بڑے دعوے یا مہابیانیے کے پرچار کا مطلب لوگوں پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش ہے اور اس کا اتباع کرنے کا مطلب دراصل خود کو مقلد، تابع فرمان عقیدت مند بنانا ہے۔ نظام کاروں اور نظریہ سازوں نے اسی میکانزم کو بروئے کار لا کر عام انسانوں کو محکوم رکھا ہے۔ اس کے نزدیک اب ہمارے سامنے نہ کوئی ہمہ گیر سوال ہے نہ ہی کسی سوال کا کوئی آفاقی حل۔ افلاطون سے ہیگل تک سب اسی مغالطے میں مبتلا رہے کہ وہ دنیا پر آفاق گیر حقائق منکشف کر رہے ہیں۔

اڈورنو کے نزدیک یورپ میں نابغے کا تصور اٹھارھویں صدی میں سامنے آیا لیکن اس میں کرشمہ کاری

کا کوئی عنصر موجود نہیں تھا۔ ہر وہ شخص Genius ہو سکتا تھا جو آرٹ یا سائنس میں غیر روایتی انداز میں چیزوں کو دیکھنے اور ان کے باکمال اظہار پر قادر تھا۔ اس تصور کی کایا کلپ اس وقت ہوئی جب کانٹ، ہیگل، شلیگل اور شلر نے آرٹسٹ کو عام لوگوں سے برتر ذات کے طور پر پیش کیا جس پر حقیقت کچھ اس انداز سے خود کو منکشف کرتی ہے کہ اس تک رسائی عام انسانوں کے بس میں نہیں ہوتی۔ اس طرح صفت نبوغ (Geniality) وہ نعمت خداوندی قرار پائی جو ہر کس و ناکس کو نصیب میں نہیں ہوتی۔ (19) اس نقطۂ نظر کے زیر اثر آرٹسٹ، ادیب اور شاعر قیاس کرنے لگے کہ چونکہ وہ وجدان اور القاء سے لیس ہوتے ہیں۔ ان کے قلب پر عالم غیب (مثال) سے پیغامات اترتے ہیں جن کو مذہبی زبان میں الہام کا نام دیا جاتا ہے۔ اس لیے وہ برتر مخلوق ہیں۔ علامہ اقبال نے انہیں دانائے راز درون خانہ کہہ کر الوہی درجے پر فائز کر دیا اور حالت کیف و مستی (سُکر) میں یہ دعویٰ فرما دیا کہ اس قسم کے نابغۂ روزگار افراد کے ظہور کے لیے تاریخ کو بعض اوقات صدیوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔

ان تصورات کے پیشِ نظر یہ بھی حکم صادر کیا گیا کہ شاعر کی حیثیت آئینے (Speculum) کی سی ہوتی ہے جس میں برتر حقیقتیں منعکس ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان کے بارے میں کسی مابعد الطبعی دنیا کی فرستادہ مخلوق کا تصور ابھرا۔ یہ بھی نشان خاطر رہے کہ مشرق کی سرزمین میں اس قسم کے دعوے کچھ نئے نہیں ہیں۔ یہ تو ویدوں کے زمانوں سے مستعمل چلے آرہے ہیں۔ دورِ جدیدیت میں بس ہوا یہ کہ کانٹ، ہیگل، شلر اور شیلنگ وغیرہ نے ان دعوؤں کو عقلی سند سے لیس کر دیا۔ چنانچہ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ نثر نگار خود کو نابغے کی حیثیت سے دیکھنے اور شاعر خود کو آسمانی ہیرو کے طور پر پیش کرنے لگا۔ عصر جدید کے انگریز رومانی شعراء بائرن، کیٹس، شیلے اور اردو کے ترقی پسند شاعر مثلاً فیض، ساحر لدھیانوی، اختر الایمان، احمد ندیم قاسمی، احمد فراز سب اسی دل فریب انداز میں خود کو دیکھتے اور پیش کرتے رہے۔ نرگسیت اور تفاخر کی ایک مخصوص کیفیت کامیاب شعراء کی رگ رگ سے خروش کرتی محسوس ہوتی۔ مشاعروں میں کچھ تو نیم پاگل ہونے کی اداکاری بھی کرتے۔ نسائی حلیوں کے حامل حضرات خود کو اس انداز میں پیش کرتے کہ دوشیزائیں پروانوں کی طرح لپکتیں۔ چنانچہ شاعری کے ساتھ ساتھ اداکاری بھی ہوتی رہی۔ شاعرانہ لباس اور ڈرامائی انداز تکلم اور سحر انگیزی کا مظاہرہ کیا جاتا تاکہ خود کو ہیرو کے روپ میں پیش کیا جا سکے۔ بمبئی کی فلمی دنیا کے ترقی پسند ہدایت کاروں کو ایک اچھا موضوع ہاتھ آیا۔ انھوں نے تو ڈرامے اور تخیل کی فراوانی کو استعمال میں لا کر شاعر کو بہت سی رومانی فلموں کا ہیرو بنا ڈالا۔ شاعر کو فلمی ہیرو بنانے میں مارکسی نظریہ سازوں نے اہم کردار ادا کیا۔

لیکن انیس سو ساٹھ کی دہائی کے نکلتے ہی یورپ میں ہر چیز الٹ پلٹ ہو گئی۔ رد انقلاب کا سلسلہ پیرس یونیورسٹی میں طلبا کے ہنگاموں اور فرانسیسی لیفٹ کی مارکسی نظریے سے مغائرت سے شروع ہوا اور ایک مکمل فکری انقلاب میں تبدیل ہو گیا۔ کائنات کی ساختیاتی تشریح کو مسترد کر دیا گیا۔ جہاں لفظ کی تخصیصی معنویت کو

مابعدالطبعی Bewitchment قرار دیا گیا، وہاں تصنیف کا logocentric تصور، مصنف کی کرشماتی شخصیت اور آرٹ کی تخلیقی پر اسراریت بھی فضول اور لغو قرار پائے۔ مصنف کی شخصیت کو تخلیق سے منہا کرنے کی ابتدا ٹی ایس ایلیٹ نے کی لیکن رولاں بارت نے تو آگے بڑھ کر چراغ ہی گل کر دیا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مصنف بے نشاں مسافتوں میں خود کو تلاش کرتا پھر رہا ہے کہ شاید واپسی کا کوئی راستہ مل جائے۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ بہر حال رولاں بارت نے اپنے ایک مضمون 'مصنف کی موت' میں لکھا:

> "اب ہم جانتے ہیں کہ متن الفاظ کی ایک ایسی قطار نہیں جس سے واحد معنی کا استخراج کیا جا سکے جیسا کہ الٰہیات میں مصنف خدا کے پیغام کا امین ہوتا ہے (بارت اس دعوے کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے) متن سے مراد وہ کثیر الجہتی سپیس ہے جس میں بہت سی تصانیف باہم مدغم ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ تصانیف بھی اوریجنل نہیں۔ متن بہت سے اقوال سے بنی ہوئی وہ بافت ہے جسے کلچر کے لاتعداد مراکز سے اخذ کیا گیا ہے۔ مصنف اس اشارے کی نقل کرتا ہے جو پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ گویا وہ کبھی اوریجنل نہیں ہوتا۔ اس کا کمال صرف یہ ہے کہ وہ مختلف تحریروں کو اس خیال اور انداز سے باہم آمیز کرتا ہے کہ ان میں سے کسی ایک پر انحصار کی صورت پیدا نہ ہو۔"(20)

رولاں بارت اس پر مصر ہے کہ ساختیاتی تجزیہ کوئی مخفی معنی دریافت نہیں کرتا۔ تخلیق تو پیاز کی طرح ہے جو بہت سے پرتوں پر مشتمل ہے، جس کا جسم کسی جوہر، کسی راز، کسی اصل الاصول سے عبارت نہیں۔ اسی طرح دریدا بھی تحریر کے عقب میں کسی سسٹم کا قائل نہیں۔ مشل فوکو تو سبجیکٹ کے تخلیقی کردار کو تسلیم ہی نہیں کرتا اس کا خیال ہے کہ اسے تخلیقی کردار سے محروم کر کے اس کا تجزیہ بطور مخاطبہ کرنا چاہیے۔(21) دوسرے لفظوں میں اس کے نزدیک کوئی تخلیقی کردار ایسا نہیں جو اصلیت اور اپج کا سرچشمہ ہو۔ یہ سب کچھ تاریخ کا منتقل کیا ہوا مواد ہے جو متراکب اور دوغلے مخاطباتی دھاروں سے وجود میں آیا ہے اور ایک ایسی تصویر کا ماخذ ہے جو کسی منصوبے یا طے شدہ محرکات کے بغیر خود رو سماجی زندگی کے دائرہ کار کی دین ہے۔ اس کی تشکیل میں تفرقاتی زبان، ثقافت اور سماجی روابط اور مفادات کا عمل دخل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی مفروضہ تخلیق مکمل اور منضبط ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

مشل فوکو نے اپنی کتاب The Archeology of Knowledge میں تصنیف کو بین المتنیت کے عمل سے منسوب کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> "کسی بھی کتاب کی سرحدیں پوری طرح واضح اور طے شدہ نہیں ہوتیں۔ اپنے عنوان

> سے آگے، پہلی سطر سے آخری فل سٹاپ تک۔ داخلی بنت سے ظاہری شکل وصورت تک--- یہ دوسری کتب کے حوالوں کے ایک نظام سے متشکل ہوتی ہے۔ دوسرے متون اور دوسروں کے جملوں سے اس کی مرہونیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کتاب جو اس وقت ہمارے ہاتھ میں ہے، سیدھے سادے انداز میں کوئی معروضی شے ہرگز نہیں--- یہ ایک ایسی وحدت ہے جو تغیر پذیر اور اضافی ہے۔''(22)

اب تک اوپر کی بحث کے تناظر میں صورت حال کی تین جہتیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ ایک یہ کہ اڈورنو نے آرٹ یا ادب میں معنی کی دریافت اور صدقت کی تلاش کے حوالے سے جو دعویٰ کیا ہے وہ از کار رفتہ بظاہر اس لیے ہے کہ ایک تو مارکسی، فاشی اور ناتسی نظام کاروں اور نظریاتی انتہاپسندوں نے حقیقت اور صداقت کے نام پر لوگوں کا جس طرح جینا حرام کیا، پہلی اور دوسری جنگ عظیم کی سیاہ کاریاں اس دعوے کی نفی کے لیے کافی ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب ہر کوئی آفاقیت، حتمیت اور Exclusivism کی تلوار لیے پھرتا۔ جو نہ مانتا وہ گردن زدنی قرار پاتا۔ دوسرا ظلم انسانیت پر سائنسی استعمار کے حامی مفکرین نے ڈھایا۔ انھوں نے ہر اس معیار اقدار کو مسترد کر دیا گیا جو سائنسیت کے معیارِ تصدیق پر پورا نہ اترتا۔ ان دونوں صداقت پسند گروہوں کے استعماری رویوں کے خلاف پہلا ردعمل وٹگن سٹائن نے Investigations میں لسانی بازیچوں کی صورت میں پیش کیا۔ گو اس نے صداقت کے تصور کو قائم رکھا لیکن اس کو بہت سے کبوتر خانوں میں تبدیل کر دیا۔ یعنی صداقت کا تکثیریت پسند نظریہ پیش کیا۔ اسی طرح سوشیور کے نظریہ ساختیات میں صداقت لسانی اور ثقافتی اکائیوں تک محدود ہو گئی۔ تاہم ان فکری تبدیلیوں کے باوجود صداقت کا تصور پھر بھی قائم رہا۔ افراط و تفریط کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب پس ساختیات والوں بالخصوص دریدا نے صداقت یا معنی کے تصور کو محض فکشن اور الیوژن قرار دے دیا۔ فن کار کی شخصیت کے بارے میں ماورائی اور تجلیلی تصور جس میں فن اور فن کار کی شخصیت کو آمیز کر دیا گیا تھا کی توڑ پھوڑ کا سلسلہ بھی مابعد جدیت کے دور میں شروع ہو۔ فوکو نے مصنف/آرٹسٹ کی متھ کو توڑتے ہوئے لکھا:

> ''ہم یہ کہنے کے عادی ہو چکے ہیں کہ مصنف کسی کتاب کا عمومی خالق ہوتا ہے۔ اس کتاب میں وہ لامحدود دولت اور سخاوت بطور معنیات جمع کر دیتا ہے۔ ہم یہ سوچنے کے بھی عادی ہو چکے ہیں کہ مصنف دوسرے لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ وہ تمام زبانوں سے کچھ اس طرح ماوراء ہوتا ہے کہ جوں ہی اس کے منہ سے الفاظ برآمد ہوتے ہیں معنی کلیوں اور کونپلوں کی طرح پھوٹنے لگتے ہیں۔ حقیقت اس خیال کے برعکس ہے--- مصنف تصنیف سے پہلے نہیں ہوتا۔ اسے ایک بنیادی اصول قرار دیا

> جا سکتا ہے جس کے ذریعے ہماری ثقافت میں کوئی شخص اپنی حدود کا تعین کرتا ہے، ان سے خود کو خارج کرتا یا منتخب کرتا ہے۔۔۔ مصنف وہ آئیڈیولاجیکل فگر ہے جس سے اس بات کی توقع کی جاتی ہے کہ اس کے ذریعے معانی کا چشمہ ابل پڑے گا۔" (23)

مصنف یا آرٹسٹ کی اس آئیڈیولاجیکل فگر کے خلاف ردعمل کا سامنے آنا کوئی حیران کن بات نہیں تھی۔ ٹی ایس ایلیٹ نے اس صورت حال کے بارے میں بہت عرصہ قبل پیش گوئی کردی تھی جس نے آرٹسٹ کی شخصیت کے انہدام (Extinction of Personality)(24) پر زور دیا تا کہ کتاب کے افہام میں مصنف کے غیر ضروری عمل دخل سے بچا جا سکے۔ مصنف کی طرف سے اس قسم کا رویہ آزاد تخلیقی عمل کے حرکی اصولوں کی نفی ہے۔ یہ بات یقیناً دل کو لگتی ہے اور منطقی طور پر درست بھی ہے کہ جب تخلیق کار متن تخلیق کر لیتا ہے تو متن اور اس کے معنی پر مصنف کی گرفت نہیں رہتی۔ متن کی تعبیر و تشریح مصنف کی منشا سے آزاد ہو جاتی ہے، بالکل ایسے ہی جیسے کمان سے نکلا ہو تیر۔ مصنف نہ تو اسے اپنی ذات کا پرتو قرار دے سکتا ہے اور نہ ہی اپنی لکھت کی مختلف تشریحات کے سلسلے میں Orbiterator کا کردار ادا کر سکتا ہے۔ یہ بات بھی درست ہے وہ تخلیق کے ہم راہ ہر قاری تک پہنچنے سے قاصر ہوتا ہے۔ علاوہ ازاں ہر قرات مختلف تناظروں میں کی جاتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر قاری متن کی تشریح اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ اس حق سے اسے کوئی محروم نہیں کر سکتا۔ جہاں تک تشریحات کے تعدد کا مسئلہ ہے تو اس حقیقت کی نشان دہی ضروری ہے کہ بہت سی تشریحات میں سے کسی ایک کو دوسری پر ترجیح نہیں دی نہیں دی جا سکتی۔ یہ ترجیح صرف اسی وقت ممکن ہے جب یہ طے کر لیا جائے کہ صداقت واحد، معروضی اور دائمی حقیقت ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ کوئی متن خلا سے جنم نہیں لیتا۔ یعنی اس پر عدم سے وجود میں آنے (Something out of noting) کی تھیوری کا اطلاق نہیں ہوتا۔ چونکہ متن کے عقب میں بہت سے متون کارفرما ہوتے ہیں؛ رشتوں، نسبتوں، اساطیری تصورات، مباحات و ممنوعات، گرائمر اور لسانی نشانات کی ایک زندہ روایت موجود ہوتی ہے جس سے متن وجود میں آتا ہے۔ زبان و ثقافت کی زندہ روایت کے بطن سے ہی ہر تحریر جنم لیتی ہے۔ اس پس منظر میں یہ کہنا بجا ہو گا کہ بین المتنی انسلاکات کی دلیل کی درایت اور صلابت سے انکار نا ممکن ہے۔ (25)

لیکن اس سب کچھ کے باوجود پیراڈاکس یہ ہے کہ کوئی تصنیف مصنف کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتی۔ یہی بات فن کے تمام نمونوں پر صادر آتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر تخلیق کار اپنی لسانی روایت اور ثقافتی ماحول کا رہین منت ہوتا ہے اور یہ بھی نا درست نہیں کہ وہ پہلے سے موجود متون سے استفادہ کرتا ہے۔ اسی طرح کوئی بھی نظریہ جسے کسی کلچر گروپ نے ادبی ترویج کے لیے تشکیل دیا ہو حتمی یا مطلق نہیں ہوتا۔ (26) اس کے ہمہ وصف جو فن پارہ بھی تخلیق ہوتا ہے اس کے پیٹرن کی تشکیل اس کی تراش خراش، اس میں موجود طرز

احساس کی لو اور اس کے انداز فکر کی تراوت مصنف کی دین ہوتی ہے۔ مراد یہ کہ مصنف کی تصنیف پر ایک مخصوص چھاپ ہوتی ہے جسے تخلیق کی زبان میں تخلیقی دستخط کا نام دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فن کار کے یہاں تجربے کی حیثیت ایک ناتراشیدہ پتھر کی سی ہوتی ہے جسے وہ اپنی مہارت سے ہفت پہلو ہیرے میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اس عمل میں فن کار کی تخلیقی چھاپ کو اہل نظر فوراً پہچان لیتے ہیں۔ اس وقت میرے ذہن میں لیونارڈو ڈاونشی کی بنائی ہوئی مونا لیزا کی تصویر ہے۔ کیا مونا لیزا کی تصویر سے لیونارڈو ڈاونشی کو الگ کیا جا سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ مصنف کی سوانحی ذات کو تصنیف سے الگ کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی تخلیقی ذات کو ہرگز نہیں۔ ادبی تاریخ کے نقاد ایم ایچ ابرامز نے مصنف اور معنی کے مسئلے پر جے ایچ ملر، رولاں بارت اور ہیرلڈ بلوم کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ اس کے نزدیک یہ نہایت انسانیت سوز حرکت ہے کہ تخلیق ادب کے بنیادی سوالات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ وہ یہ کہ ادب کس طرح معرض وجود میں آتا ہے اور اسے کس طرح پڑھا جاتا ہے، اس کا مطلب کیا ہے؟ (27) یہ طے کرنے کی بجائے کہ ادب انسانوں کے درمیان ابلاغ کا مسئلہ کس طرح حل کرتا ہے، ادب کو بے پتوار کی کشتی بنا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ابرامز کے نزدیک یہ انتہائی شرمناک ہے کہ اس صداقت کو فراموش کر دیا جائے کہ مصنف نے انسانوں اور ان کے اعمال سے متعلق مسائل کو کتنی جاں فشانی سے اجاگر کیا اور کس طرح ان قارئین کو مخاطب کیا جو اس کی بات سمجھ سکتے ہیں؟ اس کے لیے اس نے زبان پر تربیت کے ذریعے عبور حاصل کیا۔ مطلب کی بات کہنے کے گر سیکھے، تعقلاتی شعور حاصل کیا، لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانے کی جد وجہد کی۔ یہ سب باتیں تصنیف یا آرٹ کے افہام کے از بسکہ لازم ہیں۔ اگرچہ ڈیکارٹ کی علمیات کے انداز میں مصنف کی تصنیف کے اندر موجودگی ابرامز کے لیے قابل قبول نہیں، لیکن اس کا اصرار ہے کہ تصنیف کے مخاطبوں میں مصنف بہر حال موجود ہوتا ہے۔

تصنیف میں معنی اور ہیئت کی موجودگی کا مسئلہ بھی ایک پیراڈاکس ہے۔ اس میں معین معنی کے تصور کو سوالیہ نظروں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ متعین معنی کا تعلق نظریے یا تھیوری سے بنتا ہے جس میں تھوڑی سی تبدیلی پر لوگ مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں لیکن نظم، افسانے یا مصوری میں کوئی ایسی صورت حال نہیں ہوتی جسے حتمیت کا درجہ دیا جا سکے۔ یہاں معنی موجود ہوتا ہے لیکن بیانیہ کی صورت میں جس میں کسی مخصوص signified کی نشاندہی کا مطلب اس نمونہ آرٹ کی تحدید ہے۔ یعنی اس کی تشریح وتعبیر کے تسلسلی عمل کو روک دینا ہے۔ مارکسی نظریہ تنقید اور اس کے حامی تنقید نگاروں کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ آرٹ میں معنی کے آزاد کھیل کے تصور کو زندیقیت قرار دے کر اس کا سماجی محاسبہ کرتے۔ وہ تو نظریے کی چار دیواری کے اندر ہی آرٹ کے معنی کو تلاش کرتے اور اس تصنیف کو اعلیٰ قرار دیتے جو ان کی طبقاتی آویزش کی تھیوری اور سماجی ارتقا کی مارکسی تاریخیت کو فروغ دینے کے کام آتی۔ جہاں تک اڈورنو کا تعلق ہے وہ آرٹ کی سماجی اہمیت کا قائل

ضرور ہے مگر وہ آرٹ اور معنی کے کھیل میں کسی نظریاتی دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتا اور نہ ہی وہ آرٹ کی آزاد اور خود مختار حیثیت پر کمپرومائز کرنے کو تیار ہے۔

اڈورنو جب آرٹ میں Truth Content کی بات کرتا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ وہ روشن خیال عقلیت پسندی کی عطا کردہ منطقی ہیئت پسندی کو بھی مسترد کرتا ہے۔ تاہم مادر پدر آزاد موضوعیت کی نفی بھی اس کے نزدیک اہم ہے۔ اس قسم کی مادر پدر آزاد موضوعیت میں صداقت سماجی ثقافتی دائرہ کار سے بالکل باہر ہو جاتی ہے۔ فرد کی منشاء کو حتمی سمجھ لیا جاتا ہے۔ یوں کہہ لیجئے کہ صداقت کا وجود صرف آرٹسٹ یا مصنف کے ذہن تک محدود ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آرٹ کا کھیل سماجی ذمے داری سے نہیں مکمل اضافیت کے دائرے میں کھیلتا ہے۔ اس کے برعکس اڈورنو کا خیال ہے کہ جمالیات میں صداقت آرٹ کے معروض میں موجود ہوتی ہے۔ ان گنت جدلیاتی تعملات سے تعلق کی صورت میں صداقت آرٹ یا تصنیف کے اندر وقوع پذیر موضوع اور اس کی وسیع سماجی روایت سے ابھرتی ہے۔ علاوہ ازیں فن کار آرٹ کے تخلیقی عمل کی داخلی جدلیت سے بھی جڑا ہوتا ہے۔ (28) فرد کے مخصوص تجربے میں صداقت کا رشتہ کلیہ اور جزیہ سے اس طرح قائم ہوتا ہے کہ اس کے بغیر تنقید اور مزاحمت دونوں فضول ہوتے ہیں۔ اڈورنو کے فلسفے میں استحضاریت، تعقل، تھیوری، موضوع اور صداقت، یعنی جزیہ اور کلیہ کا باہمی تعلق لاینفک ہے۔ وہ جمالیات میں وجودیاتی (Ontological) طوائف الموکیت کا مخالف ہے۔ اڈورنو جانتا ہے کہ صداقت کے تعقل سے انکار کا مطلب سماجی تنقید کا استرداد ہے۔ وہ اس خطرے سے بھی آگاہ ہے کہ ذاتی امتیاز یا انفرادی امیج کے اہتمام کے نتیجے میں کلچر انڈسٹری کو فروغ مل رہا ہے۔ کلچر انڈسٹری نے استراحت اور الیوژن کے باہم وصال سے سماجی Insanity کو رواج دیا ہے جس میں صداقت اہم نہیں ہوتی، خواہشات کی تسکین اہم ہوتی ہے۔ ان حالات میں آرٹ اور آرٹسٹ اپنی خود اختیاریت اور ہنرمندانہ شناخت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ آرٹ انڈسٹری آرٹسٹ کی حیثیت ورکر یا Decorator سے زیادہ نہیں رہتی۔ (29)

اڈورنو نے ’روشن خیالی کی جدلیت‘ میں کلچر انڈسٹری کے موضوع کے لیے پورا ایک باب مختص کیا ہے جس میں اس نے استدلال کیا ہے کہ کلچر انڈسٹری صداقت کی قدر کو نظر انداز کر کے آرٹ کو مال تجارت کے طور پر اس طرح شعوری انداز میں پیش کرتی ہے کہ آرٹ کا خود مختارانہ حیثیت سے دست بردار ہونا ضروری قرار پاتا ہے۔ (30)

کلچر انڈسٹری آرٹ کے لامقصدی پہلو کی نفی کرتی ہے جو اس کی خود اختیاریت (Autonomy) کی کبھی پہچان ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ اب صورت حال یہ ہے کہ جوں ہی آرٹ منڈی کے مال میں ڈھلتا ہے، اس کا سماجی ضروریات کے تحت استعمال میں نہ آنے کا وعدہ مفقود ہو جاتا ہے جس سے حسن کی ابدیت اور

جمالیات کی پاکیزگی کے خواب بکھر جاتے ہیں۔ نتیجتاً آرٹ دنیائے اقدار سے نکل کر عزت اور توقیر کے مقام سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کا مقصد اب بقول اڈورنو خود پسندی اور جنسی ہیجان انگیزی کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ اس طرح آرٹ منڈی کا مال بن جاتا ہے اور فی نفسہ مبادلاتی قدر Exchange value کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ چونکہ اب آرٹ کی طلب اور رسد منڈی کی ضروریات کے پیش نظر طے پاتی ہے، اس لیے اصول یہ مقرر ہوتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ لوگوں کی تفریح اور تسکین کے لیے مال تجارت کے طور پر فروخت کیا جائے۔ پھر جب طلب بڑھ جاتی ہے تو آرٹ کی مینوفیکچرنگ کا سلسلہ وسیع پیمانے پر چل نکلتا ہے۔ وہ لوگ جو کلچر انڈسٹری کے صارف ہیں وہ اس قدر فریب کا شکار ہوتے ہیں کہ کبھی یہ جان نہیں پاتے کہ آرٹ بالآخر ہے کیا۔(31)

امریکہ میں جلاوطنی کے دوران اڈورنو کو کلچر انڈسٹری کے پھلنے پھولنے کا مشاہدہ کرنے کا خوب موقع ملا۔ اس کے نظریہ جمالیات کے ظہور میں آنے کی ایک وجہ یہ مسئلہ بھی تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ کس طرح ادب اور آرٹ کو Kitsch کلچر میں تبدیل کر دیا گیا ہے اور کس طرح تمام جمالیاتی ادارے غالب سرمایہ داری نظام کا حصہ بن چکے ہیں۔ اڈورنو صارف کلچر کو کلچر کے زوال اور اس کی توہین کے مترادف قرار دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کلچر سرمایہ داریت کی طاقت کے سامنے مجہول محض اور غیر مستند ہو چکا ہے۔ اس پر وہ طاقتیں غالب آ جاتی ہیں جن کے ناقد کے طور پر یہ ابھرا تھا۔ کلچر کے قدامت پسند ناقدین کے نزدیک کلچر اور تجارت کا ملاپ دراصل وہ توہین آمیز کرپشن ہے جسے مادیت پسند سماج نے رواج دیا ہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر اڈورنو کلچر انڈسٹری کو سماج کا گناہ قرار دیتا ہے۔(32) جس نے آرٹ کو شخصی امتیاز اورنفرادی اپج سے محروم کر دیا۔ مابعد جدید مفکر فرانکوا لیوتار نے بھی اسی بنیاد پر کلچر انڈسٹری کی مذمت کی ہے۔ اس نے ماس کلچر کے تصور کو اپنی کتاب ‘پوسٹ ماڈرن کنڈیشن’ کی روح کے الٹ قرار دے کر جینکس اور اولیوا کی جمالیات سے علیحدگی کا اعلان کر دیا ہے۔(33)

حواشی

(1) Glen, Ward,(2010) Understanding Postmodernism, p.195

(2) Horkheimer,Max and Adorno,Theodor,(2002) The Dialectic of Enlighenment p. XVI, 147, trans. E. Jephcott, Stanford: Stanford University Press. (GS 3)

(3) Adorno,Theodor (2004) The Aesthetic Theory, p. 8, trans.Robert Hullot-Kentor

(4) Ibid., p. 17

(5) Ibid., p. 12
(6) Ibid., p. 12
(7) Ibid., 2
(8) Ibid., p.22
(9) Ibid., pp 21,1
(10) Ibid.,199
(11) Ibid., p.12
(12) Wordsworth,"The world is too Much with Us" Selected Poems and Prefaces, p. 182 lines 1-2.
(13) Wordsworth, The Prelude and Prefaces, Book XIV, lines 157-62, pp 359-60
(14) Ibid., Book XIV, lines 111,112, p. 359
(15) Gallie, W. G. Is the Prelude a Philosophical Poem, Philosophy 22, pp. 124- 38)
(16) Adorno, Aesthetc Theory, p. 23
(17) Wolf,Tom (1975) the Painted Word, New York ,p. 15
(18) Foster,Hall (1983) "Postmodernism: A Preface". in the Anti Aesthetic Essays on Post-modern Culture, , pp.1x-xvi at pp. x-xi
(19) Adorno, Aesthetic, p. 233
(20) Barthes,Roland, (1968) The Death of the Author,, Reprinted in Philosophy of Art, ed Neil and
(21) Focault, M (1970) The order of Things,, p. 16
(22) Focault, (1972), p. 23
(23) Focault, What is Author? in Textual Strategies, pp. 158
(24) ڈاکٹر وزیر آغا (2007)، امتزاجی تنقید، صفحہ 125
(25) ڈاکٹر اقبال آفاقی (2013)، مابعد جدیدیت: فلسفہ و تاریخ کے تناظر میں، صفحہ 233
(26) ڈاکٹر اقبال آفاقی (1998)، معنی کے پھیلتے آفاق، صفحہ 35
(27) Abrams, M H (1979)How to do Things with Text, Partisan Review,pp 569-88
(28) http:/ plato. Stanford. edu/ entries adorno/no4)
(29) ڈاکٹر اقبال آفاقی (2013)، مابعد جدیدیت: فلسفہ و تنقید کے تناظر میں، صفحہ 237
(30) Adorno, Dialetic of Enlightenment, p.127
(31) Adorno, Aesthetic theory, p. 24
(32) Adorno, The Cultural Industry, Intrduction, J.M. Bernstein, p. 17
(33) Zema,Peter V (2010) Modern/ Postmodernism, p. 123

☆☆☆☆

محمد حمید شاہد

تخلیقی عمل اور تازگی

ہر تخلیق کار کو زندگی میں کم از کم ایک بار اس سوال کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے کہ اس کے ہاں تازگی اور توانائی کہاں سے آئے گی۔ یہ جو اُس کا زمانہ بعد میں پڑتا ہے، کئی زمانوں کے گزر جانے کے بعد؛ تو یہ اُس کے فن میں کیسے ظاہر ہوگا؟ یہ کیوں کر ممکن ہو پائے گا کہ اس کے احساس کے نئے پن کو سمو لینے‘ سما لینے کے لیے مروجہ اظہار و بیان کے وسائل تبدیل ہو جائیں۔ تبدیلی کی بابت سوچنا‘ خواہش اور کوشش کرنا سب کچھ ایک تخلیق کار کی فطرت میں شامل سہی‘ مگر فن کار فارم میں ایک حد تک ہی تبدیلی لا سکتا ہے۔ سو ہوتا یوں ہے کہ جب اس تبدیلی کی نوعیت کا تعین ہو جاتا ہے تو ایک اور اُلجھن سے واسطہ پڑتا ہے کہ صاحب‘ جس صنف کے لیے اُس کا مزاج موزوں ترین ہے‘ کیا وہ صنف اس کی مجوزہ تبدیلی کو قبول کر لے گی؟ یوں‘ دوسرے معنوں میں کہا جا سکتا ہے ہر تخلیق کار اپنے تخلیقی عمل کے دورانیے میں اپنی محبوب صنف کے ساتھ رہتے ہوئے‘ اپنی اور اپنی محبوب صنف کی تہذیب کر رہا ہوتا ہے۔ اگر آپ میرے ساتھ یہاں تک متفق ہو جاتے ہیں تو میں یہ کہنے کی جسارت بھی کروں گا کہ ہر عہد کا بڑا تخلیق کار جس فارم کو اظہار کے لیے چنتا ہے‘ وہ اس کا مجتہد بھی ہوتا ہے۔ تخلیقی شریعت یہ تبدیلی مانگتی رہتی ہے مگر صرف اس فن کار سے‘ جو اپنے فن کے ساتھ کامل خلوص کے جذبے سے وابستہ ہوتا ہے۔

ہر لکھنے والے کے سامنے یہ سوال بھی رہا ہے کہ اس کا تخلیق پارہ کس اعتبار سے اہم بنتا ہے؛ اتنا اہم کہ اس پر عظمت کی چھوٹ پڑنے لگے۔ ڈھنگ سے شاید ہی وہ کوئی فیصلہ کر پائے کہ اعلیٰ مضامین چننے سے فن پارہ عظیم ہوتا ہے یا ایسے قرینے رکھ دینے سے، جن سے کامل ابلاغ ممکن ہو، مگر اصل بات تو اس سوال کے مقابل ہونا ہے، ہر بار ایک سا جواب پا لینا نہیں ہے۔ اچھا، کیا کامل ابلاغ ممکن بھی ہے؟۔ جب کہ ادب کا معاملہ یہ ہے کہ اسے زبان پر تکیہ کرنا پڑتا ہے۔ زبان، جو فرد کا فرد سے بامعنی رابطہ ممکن بناتی ہے۔ لیجیے معنی بیچ میں آ گیا، تو یوں ہے کہ کم از کم ایک معنی تو ہم نے ہر لفظ سے وابستہ کر رکھا ہوتا ہے، مگر کیا ہر لفظ کا صرف ایک معنی ہوتا ہے؟، اب جو غور کرتے ہیں تو کھلتا ہے جی نہیں، ایک نہیں معنی تو کئی ہوتے ہیں۔ لفظ زبان ہی کو لے لیا

جائے، تو یہ جیبھ بھی ہے اور نطق بھی ۔ یہ بولی بھی ہے اور گفتگو بھی ۔ یہ قول اقرار بھی ہے اور بیان بھی ۔ صرف بیان نہیں بیان کرنے کا ڈھنگ بھی تو زبان ہے ۔ اچھا اور آگے بڑھیں اور اسی زبان کو دوسرے لفظوں کے ساتھ جوڑ کر دیکھیں تو زبانِ تیغ سے تیغِ زبان تک اور زبان کھلنے سے زبان لپکنے تک کے سارے مرحلے سامنے آ جاتے ہیں ۔ پھر زُبان کو لذت سے جوڑ لیں یا چٹخارے سے، اس میں بھد رک کا تصور رچا گے یا اس کے موٹے پڑنے کا ۔ اس کی لڑکھڑاہٹ، لغزش اور لکنت کو دیکھیں یا پھر اس کے حلقوم سے کھینچے جانے والے منظر کو، صرف اس ایک لفظ سے وابستہ معنی کی کئی سطحیں کھلتی چلی جاتی ہیں ۔ ابھی تو ہم نے اس ایک لفظ کو جملے میں رکھ کر دیکھنا ہے اور زبان والے اسی جملے کو کسی اور جملے کے ساتھ جوڑ کر معنی کی اور سطحوں کو کھوجنا ہے ۔ تو یوں ہے کہ زبان تو اکہری سطح پر رہ کر بھی اتنی شفاف نہیں رہتی کہ ابلاغ اور کامل ترسیل کے باب میں لکھنے والے کو مطمئن کر سکے، تو ایسے میں کیا ہو کہ جب معنی کی تہیں کھلتی چلی جائیں ۔ اب اگر میں یہ کہوں کہ ادب کا وسیلہ زبان سہی مگر اس میں خرابی یہ ہے کہ وہ ابلاغ اور ترسیل کو راہ بھی دیتی ہے اور مزاحم بھی ہوتی ہے، تو کیا آپ اسے تسلیم کر لیں گے؟

اگر ایسا ہی ہے، جیسا کہ میں نے گمان کیا ہے، تو یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ بڑا موضوع زبان میں آتے ہی اتنا بڑا نہیں رہتا جتنا کہ آپ نے اسے بڑا سمجھ کر زبان کی نذر کیا ہوتا ہے کہ اس میں سے کچھ زبان نے دبا لیا ہوتا ہے ۔ اچھا، خرابی اس سے کہیں پہلے شروع ہو جاتی ہے ۔ جسے آپ نے اپنی دانست میں بڑا موضوع خیال کر رکھا تھا، اگر ہم مان بھی لیں کہ وہ بڑا ہوگا تو کیا وہ پورے کا پورا آپ کی عقل میں سما گیا تھا ۔ اگر اس کا جواب یہ آتا ہے کہ، جی عقل نے اسے پا لیا تھا؛ تو صاحب مضمون کچھ چھوٹا نہیں ہو گیا؟، آپ کی عقل سے چھوٹا کہ اس فریم میں پوری طرح آ گیا تھا ۔ اور اگر کہا جاتا ہے، نہیں جی، اس کے کنارے اوجھل رہے؛ تو یوں ہے کہ اگر نامکمل مضمون کو آپ زبان کی نذر کریں گے تو مکمل ابلاغ کیوں کر ممکن ہوگا ۔

تخلیق کا معاملہ یہ ہے کہ یہ ان مشکلوں کا ادراک رکھتی ہے ۔ یہی سبب ہے کہ وہ اس باب میں محض اور صرف زبان پر تکیہ کرتی ہے نہ مضامین پر، اس باب میں وہ جانتی ہے کہ اسے کوئی اور وسیلہ بھی تلاشنا ہوگا ۔ ایسا وسیلہ کہ لفظ محض اپنے حصے کا مضمون اور اپنے آپ سے چپکا ہوا لغوی معنی ہی منتقل نہ کرے، معنیاتی امکانات کا ایک سلسلہ بھی پیدا کرتا جائے ۔

یاد رہے اظہار کے وسیلے یعنی زبان اور اس زبان میں فن کی تجدید کے عمل سے گزری ہوئی روایت کے ساتھ، تخلیق کار جس سطح پر جا کر جڑتا ہے، اس سے لین دین کرتا ہے یا اس سے اُٹھ کر کائنات میں بظاہر متعین مگر فی الاصل اپنے غیر متعین مقام کے حوالے سے اپنے وجود میں ردِعمل پاتا ہے، وہی اس کا اسلوب متشکل کر رہا

ہوتا ہے۔ لکھنے والا جتنا اپنے تخلیقی وجود کے آہنگ میں ہوگا اتنا ہی خالص اس کا اسلوب بنتا چلا جائے گا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ تجھ سے جب دوسرے منہا ہو جائیں تو تُو ہوگا۔ تخلیق کار بھی اپنے خالص پن سے وجود میں آتا ہے۔ اسی خالص پن سے تخلیق کار کے ہاں تشکیل پانے والا اسلوب اپنی جمالیات مرتب کرنے لگتا ہے۔

اب ہم پھر ایک بار مضمون اور اس مضمون کے لیے برتی جانے والی زبان کی طرف جاتے ہیں کہ فرد اپنے محبوب موضوع کے ساتھ زبان کی ایک سطح پر یا پھر کئی سطحوں سے جڑا ہوتا ہے۔ زبان کی ایک سطح برتنے سے موضوع کے سامنے والے علاقے روشن ہوتے ہیں اور دوسری سطحوں کو برتنے سے اس کے عقبی علاقے یا پھر اس مضمون کا جوہر گرفت میں آ سکتا ہے۔ وہ موضوع چونکہ پوری طرح حسیات کے احاطے میں نہیں آیا تھا لہٰذا نارسائی کی نذر ہو جانے والے علاقوں کی سمت کا تعین کر کے اس کے امکانات بھی زبان کی ایک سطح میں رکھ لیے جاتے ہیں۔ چوں کہ فن اس باب میں بااختیار ہوتا ہے لہٰذا آزادی سے ایک ایسا نظام وضع کر لیتا ہے جو پہلے سے موجود نظام سے متصادم ہوئے بغیر مختلف ہو جاتا ہے؛ بالکل ایسے ہی جیسے ہر پیدا ہونے والا بچہ مختلف ہوتا ہے۔ اپنے ماں باپ سا مگر ان سے مختلف۔ یوں ہر شخص کا تخلیقی وجود یا یوں کہہ لیں، تخلیقی مزاج الگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ لگ بھگ ایک جیسے ماحول میں رہنے والے، ایک ہی زمانہ پانے والے جب غزل کہتے ہیں، نظم یا افسانہ لکھتے ہیں تو ایک ہی مضمون کو ایک ہی زبان میں برتتے ہوئے بالکل الگ ہو جاتے ہیں۔

بہت سے لکھنے والوں کی نئی تحریروں میں بھی بوسیدگی کی دھول اڑتی رہتی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ ابھی تک ایسا لکھنے والے تخلیقی عمل کو محض اور صرف متن کاری سمجھے ہوئے ہوتے ہیں اور اس سوال کے مقابل ہو ہی نہیں پاتے کہ ان کے ہاں تازگی اور توانائی کہاں سے آئے گی۔ ایسے لوگوں کو مشورہ دیا جانا چاہیے کہ اُنہیں کچھ لکھنے سے پہلے یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ آخر وہ لکھتے ہی کیوں ہیں؟ اور کیا ان کا لکھنا تخلیقی آہنگ سے وابستہ ہوتا ہے یا محض اس ریاض کی عطا، جس سے ترکھان بھی کاریگر بن جاتا ہے؟ اگر اس سوال کا ان کے پاس کوئی معقول جواب نہیں نکل پاتا تو انہیں خبر ہو جانی چاہیے کہ ان کی تحریروں کے پھسپھسے یا بوسیدہ ہونے کا سبب کیا ہے۔ ادب محض کسی فنی ساخت کا نام نہیں ہے۔ تازگی اور توانائی کی بابت سوچنے سے کہیں پہلے لکھنے والے کے پاس ادب سے تخلیقی سطح پر جڑے رہنے کا جواز ہونا چاہیے۔

مجھے یاد آتا ہے جب میرے اور محمد عمر میمن کے بیچ ماریو برگس یوسا کے حوالے سے مکالمہ چل رہا تھا تو ہم دونوں اس پر متفق تھے کہ ادب میں اخلاص یا عدم اخلاص محض اخلاقی معاملہ نہیں ہے؛ جمالیاتی معاملہ بھی ہے۔

ادب کے اس جمالیاتی معاملے کو یوسا نے ادبی ووکیشن سے جوڑ کر دیکھا، تو بات دل کو لگی تھی۔ اچھا اب اگر میں یہ کہوں کہ ایک تخلیق کار پورے اخلاص کے ساتھ رواں زندگی سے جتنی سطحوں سے وابستہ ہوتا ہے اتنی ہی جمالیاتی تہوں کے بھید اپنے تخلیق پارے میں بنتا چلا جاتا ہے تو یہ بات بھی خلاف واقعہ نہیں ہے۔ یہاں میں نے رواں زندگی سے جڑنے کی بات کی تو اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ ادب ہر حال میں تازگی اور توانائی رواں زندگی کے مظاہر سے ہی اخذ کرتا ہے؛ کہ یہاں ایک بار پھر زبان اور اس کی کارکردگی کو بھی پیش نگاہ رکھنا ہوگا۔ زبان جواب تک اپنے برتے جانے کی وجہ سے ایک ساخت رکھتی ہے، اور اس ساخت کا احترام کیے جانے کا تقاضے بھی رکھتی ہے۔ یہی زبان تخلیقی عمل کے دوران غیر محسوس انداز میں بدلتی چلی جاتی ہے۔ روایت سے اکتساب لفظ کو اگر تہذیبی معنیاتی سلسلے سے منسلک کرتا ہے تو تخلیق کار کے اپنے زمانے سے رشتے لفظ کو اس پرزم کے سامنے کر دیتے ہیں جس سے یہی معنیاتی سلسلہ تازگی، معنی کی توسیع اور نئی جمالیات کی دھنک اچھال دیتا ہے۔ یاد رہے لفظ کا روایتی استعمال تحریر کو بوسیدہ کر دیتا ہے اور روایت کو یکسر مسترد کرنے اور تہذیبی معنی تلف کرنے والا اپنی تحریر کو اتھلا بنا لیتا ہے۔ اچھا، یہ تو سب جانتے ہیں کہ زبان رواں لمحے میں یا اچانک پیدا نہیں ہو جاتی۔ مگر اسے بھی تو جاننا ہوگا کہ زبان میں معنی کی، ایک اور تہہ کسی بھی وقت کے دورانیے میں بن سکتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تہیں مسلسل بنتی رہتی ہیں۔ تو یوں ہے کہ روایت کو یکسر مسترد کرنے کی بجائے اس میں توسیع کے امکانات رکھنے سے ممکن ہو جاتا ہے کہ کوئی تخلیق تازہ اور توانا ہو جائے۔

ایک سچا تخلیق کار نہ تو ایک مضمون کو سو رنگ میں باندھ کر مطمئن ہو سکتا ہے اور نہ ہی عصری حسیت کو روایتی زبان میں برت کر۔ زبان اہم ہے بجا۔ معنی اور مواد اہم ہے، یہ بھی درست، مگر جب تک کسی فن کار کے ہاں اس کا تخلیقی وجود اپنی جمالیات مرتب نہیں کرتا، اس پر تازگی اور توانائی کے بھید کا در نہیں کھل پاتا۔ دوسرے لفظوں میں تخلیقی وجود کی مرتب کردہ جمالیات تخلیقی شخصیت کا آہنگ بناتی ہیں اور یہ اسلوب، کسی تخلیق کار کی ان توفیقات کے سوا ہوتا ہی کیا ہے کہ جن کے وسیلے سے اس کی تخلیقات کا ایک خاص آہنگ مرتب ہوتا ہے اور ان میں تازگی اور توانائی کے امکانات پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

چھاچھی بولی: لسانی و ادبی جائزہ

لِسانیات ایک حد درجہ مفید مگر پیچیدہ اور مشکل علم ہے۔ دُنیا کی ترقی یافتہ اقوام نے اس علم کے ذریعے اپنی زبانوں اور ذیلی بولیوں کا گہرا لسانی مطالعہ کر کے اعلا درجے کا تحقیقی کام کیا ہے اس کے برعکس ہمارے ہاں اس علم کی تحصیل اور فروغ کے لیے کسی سطح پر کبھی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ علمِ لسانیات سے اس بے خبری کے باعث ہم کئی لسانی مسائل کا شکار ہیں۔ ہمارے ہاں زبانوں اور بولیوں کے ضمن میں کئی مغالطے مسلمات کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ پاکستان کی زبانوں اور بولیوں کے حوالے سے ہمارا مطالعہ گریئرسن کی کتاب The Linguistic Survey of India سے آگے نہیں بڑھا؛ اس تہی دامنی کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ علاقائی زبانوں کے مختلف لہجوں اور بولیوں کو الگ الگ زبان کی حیثیت سے متعارف کرنے کی رسم اب عام ہو گئی ہے۔ مختلف مقاصد کے لیے کی گئیں اس طرح کی کوششوں نے کئی لسانی گمراہیاں پیدا کر دی ہیں۔ جن کی وجہ سے زبانوں اور بولیوں کے درمیان فاصلے بڑھے ہیں اور روز بہ روز ان میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

کوئی بھی زندہ زبان ایک مخصوص جغرافیائی حصار میں مقید نہیں رہ سکتی؛ اس کا دائرۂ عمل جیسے جیسے وسیع ہوتا جاتا ہے اس میں لہجوں کا تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔ لہجہ یا بولی کسی علاقے کے مخصوص جغرافیے اور تمدنی میلانات سے ابھرتی ہے۔ لفظ کی ادائیگی اور مقامی محاورے کی شمولیت اس بولی اور لہجے کو انفرادیت کا رنگ عطا کرتی ہے۔ دُنیا کی بڑی زبانیں جیسے عربی، فارسی، انگریزی وغیرہ کے متعدد لہجے اُن زبانوں کی وسعت اور ہمہ گیریت کے عکاس ہیں۔ اگر ہر لہجے یا بولی کو ایک الگ زبان کے نام سے پکارا جانے لگے تو دُنیا میں زبانوں کی تعداد کا تعین کرنا بھی مشکل ہو جائے۔ بولی یا لہجہ انفرادی نقوش رکھنے کے باوجود کسی زبان کے ایک جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔

پنجابی زبان اپنے لہجوں اور بولیوں کے اعتبار سے دُنیا کی امیر زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ مشرقی اور مغربی پنجاب میں اس زبان کی متعدد بولیاں بولی جاتی ہیں۔ یہ بولیاں ”ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است“ کے مصداق اپنی الگ شناخت اور منفرد خصوصیات کی حامل ہیں۔ تاہم یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ ان لہجوں اور بولیوں کی بقا اور ترقی لسانی وحدت میں مضمر ہیں؛ جس طرح شاخِ بُریدہ شجر سے جُدا ہو کر اپنی حیثیت قائم نہیں رکھ سکتی اور قطرہ، قلزم سے تعلق توڑ کر اپنا بھرم کھو دیتا ہے اسی طرح لہجوں اور بولیوں کی وقعت زبان سے

وابستگی کا نتیجہ ہے۔ زبان سے الگ ہو کر بولیوں اور لہجوں کا اپنے وجود کو قائم رکھنا ممکن نہیں۔

صوبۂ پنجاب کے انتہائی شمال مغرب میں ضلع اٹک کا ایک زرخیز خطہ "چھچھ" آباد ہے جو دریائے اباسین (سندھ) کے پہلو میں شرقاً غرباً ۱۹ میل (چوڑائی میں) پھیلا ہوا ہے۔ جغرافیائی طور پر یہ خطہ ۱۹۔۷۲ سے ۳۵۔۷۲ درجے طول بلد مشرقی اور ۵۰۔۳۳ سے ۵۹۔۳۳ درجے عرض بلد شمالی کے درمیان واقع ہے۔ علاقہ چھچھ کے مشرق میں کوہ گنگر، مغرب میں اٹک قدیم کی پہاڑیاں، جنوب میں کامرہ کی پہاڑی اور جرنیلی سڑک جب کہ شمال میں دریائے سندھ واقع ہے۔ خواجہ محمد خان اسدؔ کے بقول:

> چھچھ کا پُرانا نام چھچھ چوراسی ہے کیوں کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے اس کے چوراسی {۸۴} دیہات تھے۔ (۱)

چھچھ کا سب سے بڑا قصبہ حضرو ہے جسے بھائی بالک سنگھ (سکھوں کا گیارہواں گُرو) حکیم محمد یوسف حضروی (نامور طبیب) اور اعجاز حسین حضروی (موسیقی کا ایک اہم نام) کا مولد و منشا ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ دریائے سندھ کی قُربت کے باعث علاقہ چھچھ کی زمین زرخیزی میں اپنا جواب نہیں رکھتی؛ گندم، مکئی، گنا، تمباکو اور چنے یہاں کی خاص فصلیں ہیں۔ چھچھ کا تمباکو اپنی اعلا کوالٹی کے باعث ملک اور بیرونِ ملک میں خاص شہرت رکھتا ہے۔ منشی امین چند نے ڈیڑھ سو سال پہلے اپنے سفرنامے میں اس علاقے کی زرخیزی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> علاقہ چھچھ ایک ہموار میدان ہے، پیداواری میں بڑا کامل اور زمین وہاں کی اکثر چاہی ہے مل کر تمام ضلع [اُس وقت یہ علاقہ راولپنڈی ضلعے میں شامل تھا] میں اس علاقے کے برابر دوسرا کوئی علاقہ اچھا نہیں ہے۔ باقی بھی تمام ضلع میں یا تو پہاڑ ہے یا نشیب و فراز ہے، غرض کہ اس چھچھ کے برابر کوئی مسطح قطعہ میدان کا نہیں اور یہاں کی ایک نقل مشہور ہے، وہ یہ ہے: چھچھ ماں سمندر کی جو مانگے سو لے۔" (۲)

چھچھ کی وجۂ تسمیہ کے متعلق متعدد روایات و آرا ملتی ہیں۔ بعض مؤرخین کے نزدیک چھچھ یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی دلدلی زمین کے ہیں اور اس علاقے کو سکندرِ اعظم نے یہ نام دیا؛ بعض کے خیال کے مطابق یہ علاقہ چوں کہ چھاج سے ظاہری مشابہت رکھتا ہے اس لیے چھاج یا چھج یا چھچھ بن گیا۔ کُچھ اس نام کی نسبت سندھ کے حکمران راجا داہر کے باپ راجا چچ سے ظاہر کرتے ہیں؛ جب کہ کئی ایک کے نزدیک چھچھ کا لفظ چھک، چچ، پچ، شش، شاش، چاچ، چھاپ وغیرہ کی مبدل صورت ہے۔ متذکرہ لفظوں میں سے اکثر کے معنی دلدل یا دلدلی زمین کے ہیں؛ چوں کہ علاقہ چھچھ کی زمین دلدلی ہے اس لیے ان قیاسات کو کُلی طور پر ساقط الاعتبار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس علاقے کو پہلی بار کب یہ نام ملا، ہنوز تشنۂ تحقیق ہے۔ البتہ اٹک گزیٹیئر Attock Gazetteer میں ماہرین آثار قدیمہ کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ صدیوں پہلے اس علاقے کا

نام 'چھکشا' یا 'شکشا' (Chhuksha) تھا جو ٹیکسلا کے راج دھانی کا ایک صوبہ تھا۔ (۳)

معروف چینی سیاح فاہیان نے اپنے سفرنامے میں چھچھ ہزارہ کے لیے سرشاسا ہزرہ (Shirshasa-Hasra) کا نام استعمال کیا ہے۔ جس کے معنی ہزار سر کے ہیں۔ (۴)

چھچھ اپنی بے مثال زرخیزی کے ساتھ ساتھ ہزاروں سال پُرانا تاریخی پس منظر بھی رکھتا ہے۔ یہ خطہ یونانیوں سے افغانیوں تک اکثر و بیشتر حملہ آوروں کی گزرگاہ رہا ہے۔ آثارِ قدیمہ اور نوادرات کی دریافت نے اس خطے کی تاریخی قدر و قیمت کو مزید اعتبار بخشا ہے۔ نوادرات میں کشان عہد کے دو کتبے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ کتبے خروشتی رسم الخط میں ہیں اور بالترتیب گڑھی متی اور کامرہ سے دست یاب ہوئے ہیں۔ کامرہ سے ملنے والا کتبہ کنشکِ دوم [کنشکا] کی پیدائش سے متعلق ہے۔ ۱۰۰۸ء میں سلطان محمود غزنوی اور راجا انند پال کے درمیان ایک معرکہ چھچھ کے میدان میں ہوا؛ اس معرکہ میں انند پال کو شکستِ فاش کا سامنا کرنا پڑا۔ مغلیہ عہدِ حکومت میں یہ خطہ خصوصی توجہ کا مرکز رہا؛ عہدِ جہاں گیر میں کامل خان صوبہ دار قلعہ اٹک اور نقلی شاہ شجاع کے درمیان ۱۱۷۷ھ میں ہارون (چھچھ کا ایک گاؤں) کے مقام پر ایک خوں ریز لڑائی ہوئی، میدان کامل خان کے ہاتھ رہا اور نقلی شاہ شجاع اور اس کے بہت سے ساتھی بڑی تعداد میں تہ تیغ ہوئے اور بچ کر بھاگنے والے دریائے سندھ میں ڈوب کر ہلاک ہوئے۔ ۱۸۱۳ء میں افغانوں اور سکھوں کے درمیان ایک بڑی جنگ جو "جنگِ اٹک" کے نام سے مشہور ہے اسی علاقہ میں لڑی گئی۔ یہ خطہ چوں کہ رنگا رنگ اور مختلف النوع تہذیبوں کی آماج گاہ رہا ہے اس لیے اس علاقے کا تمدنی منظرنامہ متعدد تہذیبوں کے تال میل سے وجود پذیر ہوا۔

علاقہ میں بولی جانے والی زبان کو "چھاچھی" کا نام بیسویں صدی میں دیا گیا؛ اس سے قبل اس بولی کو متعدد ناموں جیسے ہندکی، ہندی، ہندکو اور پنجابی وغیرہ سے پکارا جاتا تھا۔ اس بولی کا تعلق پنجابی زبان سے ہے اور اپنے خدوخال کے اعتبار سے پنجابی زبان کی دیگر بولیوں جیسے پوٹھوہاری، دھنی، گھیبی، ہندکو، پہاڑی اور ڈوگری وغیرہ سے مختلف اور منفرد ہے۔ تاہم اکثر ماہرینِ لسانیات اور مؤرخین نے چھاچھی بولی کے ڈانڈے انھی متذکرہ بولیوں سے ملائے ہیں اور اس کی علاحدہ حیثیت کو جھٹلایا ہے۔ زبانیں اور بولیاں ایک دوسرے سے اخذ و استفادہ کرتی ہیں اور اس لین دین سے مختلف زبانوں اور بولیوں میں لسانی، ہیئتی، لفظی اور ترکیبی سطح پر اشتراک کی کئی صورتیں جنم لیتی ہیں مگر ان مشترکہ عناصر کی موجودگی کسی زبان کی علاحدہ حیثیت کو مجروح نہیں کرتی۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ چھاچھی بولی نے قُربِ جوار کی کئی بولیوں سے استفادہ کر کے اپنے دائرے کو وسعت آشنا کیا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اُس نے اپنی جداگانہ حیثیت کو نہ صرف برقرار رکھا ہے بل کہ اس کو مزید استحکام بھی بخشا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظر ان آرا اور اقوال پر ڈال لیں جو ماہرینِ لسانیات اور مؤرخین نے علاقہ چھچھ کی بولی سے متعلق پیش کیے ہیں:

(الف) محمد آصف خاں نے پنجابی زبان کی مختلف بولیوں کو مندرجہ ذیل تین بڑے گروہوں میں بانٹا ہے۔

۱۔ پوربی ۲۔ پچھمی ۳۔ مرکزی (ماجھی)

اور چھاچھی بولی کو دوسرے گروہ پچھمی میں شامل کیا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق چھاچھی کیمبل پور (اٹک) اور ہزارہ میں بولی جاتی ہے۔ (۵)

(ب) ڈاکٹر شہباز ملک نے اپنی کتاب ''پنجابی لسانیات'' میں پنجابی زبان کی بولیوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ مشرقی اور مغربی۔ چھاچھی کو مغربی حصے میں شامل کرتے ہوئے انہوں نے چھاچھی کے ذیل میں لکھا ہے:

> چھاچھی: کیمبل پور دے علاقے نوں چھچھ آکھیا جاندا اے؛ ایہہ علاقہ ایبٹ آباد تے راول پنڈی کیمبل پور، ادھ ہزارہ تے کجھ پشاور دا علاقہ؛ ایتھوں دے لوگ چھاچھی اکھواندے نیں، ایس علاقے دی بولی اے۔ ایسے لئی گیانی ہیرا سنگھ ایس نوں پہاڑی داناں دے کے ایہدے علاقے وچ ایبٹ آباد، کوہ مری تے پونچھ وغیرہ نوں شامل کردے نیں تے ایہوں ڈوگری نال رلان دا جتن کردے نیں پر ایہہ گل شاید اوہ پونچھ رلان نگروں کہندے نیں۔ اصل وچ پونچھ ایہدے وچ شامل نہیں تے نہ ای چھاچھی بولی ڈوگری نال ملدی اے۔ ایہہ پوٹھوہاری دے کھاتے وچ ای زیادہ جاندی اے۔ (۶)

(ج) ڈاکٹر احمد حسین قریشی قلعداری کے قول کے مطابق پوٹھوہار، آزاد کشمیر، ہزارہ اور کیمبل پور کے علاقہ کی زبان ''لہندی'' کہلاتی ہے۔ جہلم اور راول پنڈی کے علاقے اسی کے زیر اثر ہیں۔ (۷) ڈاکٹر احمد حسین قریشی سے پہلے مغربی پنجاب کی زبان کو سر جارج گریئرسن نے اپنی مشہور کتاب Linguistic Survey of India میں 'لہندا' یا 'لہندی' کے نام سے یاد کیا ہے۔

(د) سلیم خان نے ''پنجابی زبان دا ارتقاء'' میں چھاچھی بولی کو چھبالی (چھبلی) بولی کا ایک لہجہ یا ذیلی بولی (پڑ بولی) قرار دیا ہے؛ مگر اسی کتاب میں انہوں نے چھبالی، چھچھیلی اور چھاچھی کو پوٹھوہاری کی ذیلی بولیاں قرار دیا ہے؛ ملاحظہ ہو ایک اقتباس:

> دریائے جہلم تے دریائے سندھ دے وچکار کیمبل پور (اٹک) دے علاقے ودی ایک بولی چھبالی، چھچھیلی یاں چھاچھی) ایہہ ہندکو توں وکھری اِک بولی اے؛ ایہدے وچ پہاڑی تے پوٹھوہاری دے لفظ ملدے نیں۔ جس طرح چلنا تو جلنا۔ اصل وچ چھبالی تے چھاچھی پوٹھوہاری دیاں پڑبولیاں نیں۔ (۸)

(ہ) سکندر خان (مؤلف تاریخ وادیِ چھچھ و دامنِ اباسین) نے علاقہ چھچھ کی زبان کو ہندکو قرار دیا ہے

اوران کے بہ قول:

> محققین کے مطابق پاک وہند کی قدیم ترین زبان ہے جو کہ اپنی اصلی حالت میں اس وقت صرف وادیِ چھچھ میں بولی جاتی ہے۔ (۹)

آگے چل کر فرماتے ہیں:

> پنجابی کی اولین شکل ہمیں ہندکو زبان میں نظر آتی ہے، اس لیے ہم ہندکو کو اُردو زبان کی بنیاد قرار دیں گے جو شورسینی زبان کی شاخ ہے اور اپنی شکل میں صرف وادیِ چھچھ میں بولی جاتی ہے۔ (۱۰)

(و) عبدالغفور قریشی اپنی کتاب میں پوٹھوہاری بولی کی ذیل میں رقم طراز ہیں:

> ایہہ جہلم توں پار پوٹھوہار دے علاقے وچ بولی جاندی اے، ایس علاقے وچ راولپنڈی، کیمبل پور، گجرات وغیرہ شامل ہیں۔ (۱۱)

(ز) نور بیگ اعوان اپنی کتاب ”دھنی ادب ثقافت“ میں لکھتے ہیں:

> کیمبل پور کا ضلع تو چھچھ میدان میں واقع ہے۔ ان کی بولی کا مخصوص لہجہ چھاچھی ہے۔ (۱۲)

متذکرہ بالا آرا محض قیاس اور اندازے پر مبنی ہیں؛ یہ آرا مصنفین و مؤرخین کے تاثراتی رُخ کی تعیین میں تو مددگار ہو سکتی ہیں مگر لسانیات کے اصولوں سے کامل طور پر ہم آہنگ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام آرا کے مطالعے سے کسی ایک نتیجے تک پہنچنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ ماہرین کے نقطۂ نظر کے باہمی اختلاف کے باعث اس بولی کے ضمن میں کئی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں جنھوں نے اس بولی کی جداگانہ حیثیت کو مشکوک بنا دیا ہے۔ چھاچھی بولی کو کیمبل پور (اٹک) اور ہزارہ کی زبان بتایا گیا ہے جو قطعی طور پر درست نہیں؛ یہ نقطۂ نظر علاقہ چھچھ کی جغرافیائی حدود سے لاعلمی اور اردگرد کی بولیوں سے اغماض کے نتیجے میں پروان چڑھا ہے۔ ضلع کیمبل پور (اٹک) میں چھاچھی کے علاوہ جندالی، گھیبی اور جنگی بولیاں بولی جاتی ہیں جب کہ ہزارہ (چند دیہات جو چھچھ پٹی میں شامل ہیں کو چھوڑ کر) میں ہندکو بولی جاتی ہے جو اپنے قواعد و لفظیات میں چھاچھی سے مختلف ہے۔ اسی طرح چھاچھی کو پوٹھوہاری کی ذیلی بولی قرار دینا بھی دونوں بولیوں سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے اور اس کا حقیقت سے کچھ علاقہ نہیں۔

چھاچھی بولی کے قُرب و جوار میں ہندکو، گھیبی، دھنی اور پوٹھوہاری بولیاں بولی جاتی ہیں۔ علاقائی قُربت کے باعث ان بولیوں کے ساتھ چھاچھی کے تعلقات اور روابط بھی انتہائی مضبوط اور گہرے ہیں۔ چوں کہ ان ساری بولیوں (بہ شمول چھاچھی) کا بنیادی لسانی تعلق ایک ہی زبان (پنجابی) سے ہے اس لیے قواعد، گرامر، صرف اور نحو کے بہت سارے قوانین اور اصول و ضوابط ایک جیسے ہیں۔ اس اتحاد اور ہم آہنگی کے

باوجود ہر بولی کے دامن میں ایسے عناصر موجود ہیں جو اس کی جداگانہ حیثیت اور انفرادی صورت کے غماز ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ماہرین لسانیات نے زبان اور بولیوں کے ان اشترا کی اور اختلافی پہلوؤں سے صرفِ نظر کیا ہے۔ مقامی بولیوں اور زبانوں کے سلسلے میں اب تک مستشرقین اور مغربی مؤرخین کی تحقیقات کو سند مانا جاتا ہے اور اس سے سرِمو انحراف کرنا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اس اندھی تقلید کے نتیجے میں کئی غلط فہمیوں کو اب مسلمات کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اور ہم اپنی زبانوں اور اُن کے لہجوں کے تمام گوشوں اور پہلوؤں سے پورے طور پر آگاہ نہیں ہو سکے ہیں۔

علاقہ چھچھ اپنے علم و فضل کے اعتبار سے ہندوستان کا بخارا کہلاتا رہا ہے۔ یہاں کے علماء و فضلا صرف ہندوستان کے لیے ہی مرجعِ فیض نہیں رہے بل کہ ان کے دامنِ تربیت سے تُرکستان، ایران، افغانستان اور دیگر اسلامی ممالک کے تشنگانِ علم نے کسبِ فیض کیا۔ علمی مراکز سے دُوری، اشاعت کی سہولیات کے فقدان اور حملہ آوروں کی اُکھاڑ پچھاڑ نے اس علاقے کے علمی نشانات اور تخلیقی کارناموں کو بڑی حد تک ضائع کر دیا ہے؛ رہی سہی کسر دریائے سندھ کے طوفانوں نے پوری کر دی جس کی منہ زور لہریں گاؤں گاؤں کا طواف کر کے نوادراتِ قلمی کو اپنے ساتھ بہا لے جاتی رہی ہیں۔ سرمایۂ شعر و ادب کے ضیاع کے باعث اس خطے کی علمی و ادبی تاریخ کا مکمل جائزہ لینا ممکن نہیں۔ امتدادِ زمانہ اور گردشِ دوراں سے جو ادب محفوظ رہا ہے وہ ایک دوسرے سے پوری طرح پیوستہ نہیں۔ اس زمانوی بُعد سے قدم قدم پر تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ چھاچھی شعر و ادب کا جائزہ لیتے ہوئے اس عدمِ تسلسل کا احساس اور زیادہ شدت اختیار کر جاتا ہے۔ بہ ایں ہمہ زیرِ نظر جائزے میں ہم نے چھاچھی شعر و ادب کو دو ادوار میں منقسم کیا ہے۔

پہلا دور (کلاسیکل): ۱۷۴۸ء تا ۱۹۴۷ء

دوسرا دور (جدید): ۱۹۴۷ء تا عہدِ موجود

چھاچھی شعر و ادب کا پہلا دور تقریباً دو صدیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس دور میں ہمیں چھاچھی بولی کی ایک بھی نثری تخلیق دکھائی نہیں دیتی۔ چھاچھی بولی کی اس نثری تہی دامنی کا ایک بڑا سبب تو وہی ہے جس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں کہ حوادثاتِ زمانہ نے اس بولی کے آثارِ قلمیہ کو بڑی حد تک ضائع کر دیا ہے۔ دوسرا سبب عربی اور فارسی جیسی توانا زبانوں کا اس علاقے میں گہرا عمل دخل قرار دیا جا سکتا ہے۔ دینی مدارس میں عربی اور فارسی کی تحصیل کے بعد علما انہی زبانوں میں مختلف موضوعات پر رسائل کی تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے۔ عربی اور فارسی جیسی بڑی زبانوں کی موجودگی میں علما نے اس محدود اور پس ماندہ بولی میں تصنیف و تالیف کے کام سے گریز کیا۔ البتہ دولتِ شعر سے اس بولی کا دامن خالی نہیں۔ شاعروں نے اپنے علاقائی لہجے کو باثروت بنانے میں عربی و فارسی کے کئی رسائل کے تراجم کیے۔ یہ بات درست ہے کہ اُن علما اور شعرا کے پیشِ نظر یقیناً بولی اور زبان کی خدمت نہ تھی بل کہ انہوں نے لوگوں کی آسانی کے لیے اس بولی کا انتخاب کیا۔ چھاچھی

شاعری کے اوّلین دور میں مقصدیت کی گہری چھاپ نمایاں ہے۔ شاعروں نے مذہبی روایات، دینی اعتقادات اور فقہی مسائل پر متعدد رسائل نظم کیے ہیں۔ کلاسیکی دور کی شاعری سے اگرچہ چھاچھی بولی کے تمام خدوخال اُجاگر نہیں ہوتے۔ تاہم چھاچھی بولی کی لفظیات، قواعد اور تراکیب شعر پاروں میں جا بجا موجود ہیں۔ کلاسیکی دور کے چیدہ شاعروں میں حافظ معز الدین فقیر، قاضی نادر دین، سید مہتاب شاہ، ملا عبدالمجید، عبدالکریم، گلاب خان، محمد یحییٰ جنگی، عبدالمجید غالب، مولوی محمد سعید، شاہ ولایت محمد عمر المعروف عُمر اانکاں والا اور راجا سید غلام خان کے نام شامل ہیں

چھاچھی شعر و ادب کا دوسرا دور قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی آغاز ہوتا ہے۔ یہ دور اس حوالے سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں چھاچھی بولی کو صفِ اول کے تخلیق کار میسر آئے جنھوں نے اس بولی کو اظہار کا ذریعہ بنا کر اس کے دامن کو وسعت آشنا کیا۔ نثری تخلیقات کی پیش کش کے لیے اس بولی پر تخلیق کاروں کی نگہِ انتخاب پڑی اور یوں پہلی بار چھاچھی بولی میں ریڈیائی ڈراموں اور بیانیہ و علامتی کہانیوں کو رواج ملا۔ کسی زبان یا بولی کی لسانی خصوصیات اور دوسری زبانوں اور بولیوں سے اس کے اشتراک و اختلاف کا صحیح اندازہ اس کے نثری ذخیرے سے کیا جا سکتا ہے۔ اس میں کچھ کلام نہیں کہ چھاچھی بولی کا نثری سرمایہ بہت کم ہے تاہم اس کی مدد سے چھاچھی بولی کے صحیح خدوخال کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔

چھاچھی بولی کی خوش نصیبی کہ دوسرے دور کے آغاز میں ہی اسے منظور عارف ایسا بے بدل شاعر میّسر آیا جس نے بولی میں نظمیں اور گیت لکھ کر اسے مُلکی سطح پر متعارف کرایا۔ منظور عارف نے ۱۹۵۰ء میں چھاچھی بولی میں سخن گوئی شروع کی اور اپنی پہلی نظم ’مینڈے منے آں بچاؤ“ سے وہ مقام حاصل کر لیا اور جو سالوں کی ریاضت کے بعد ہاتھ آتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے بجا طور پر اس نظم کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے: وہ رقم طراز ہیں:

> منظور عارف نے پنجابی زبان کے ”چھاچھی“ لہجے میں بھی بہت عمدہ نظمیں لکھی ہیں اور جس طرح اس کی اُردو نظم ”جم خانہ کلب“ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے موضوع پر لکھی گئی نظموں میں ایک شاہکار تسلیم کی جاتی ہے اور ”سرنڈر“ کو دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں کہی جانے والی اُردو نظموں میں بہت امتیازی مقام حاصل ہے اسی طرح ان کی پنجابی نظم ”مینڈے منے آں بچاؤ“ کو کم سے کم میری نظر میں، عالمی امن کے موضوع پر تخلیق ہونے والے ادب کا عنوان ہونا چاہیے۔ (۱۴)

منظور عارف کی چھاچھی شاعری مختلف رسالوں اور اخباروں میں تو چھپتی رہی مگر تا حال ان کا چھاچھی مجموعۂ کلام اشاعت آشنا نہیں ہو سکا۔ ان کی مقبول نظم ”مینڈھے منے آں بچاؤ“ کا ایک ٹکڑا دیکھیے:

اٹکاں نیاں نیارتاں تے ونج ونج کے
بیر بُلیاں ڈُھپاں وچ ساڑ ساڑ کے

اللہ چن جھولی پایا، ڈیوے بال بال کے
تیل پا پا کے ، جھنڈے چاہڑ چاہڑ کے
جدوں ہمنے چھیویں سالے وچ پیر دھریا
جوان بھیناں نیاں دلاں وچ وَس وَس کے
پنجاں پیساں نا زیارتاں تے تیل گُھس گئی
ہمنا نال چا کے، لوکاں وَس وَس کے
مینڈا سائیں ، مینڈی دھیاں مینڈے ہمنے واسطے
مویا ملکاں نیاں ڈیریاں تے رُل رُل کے
ہمنا چھیاں سالاں نا تے دھیاں جوان بُو ہے
چیکاں زور زور تے ، رووان کُھل کُھل کے (۱۴)

منظور عارف کی ایک اور معروف نظم ”چھچھے نیے کُوڑیئے“ کا رنگ دیکھیے:

چھچھے نیے کُڑیے
شہر کراچی وچ کیہی ڈاہڈی یاد آئی ایں
بھیڑا شہر چھچھے توں دُور
اپنے لیکھوں میں مجبور
دُنیا ٹکٹ کٹا کے بہہ گئی
مار کے سیٹی ٹُر پئی گاڈی، یاد آئی ایں
چھچھے نیے کُڑیے
شہر کراچی وچ کیہی ڈاہڈی یاد آئی ایں

چھاچھی بولی میں باقاعدہ ادبی نثر نگاری کی ابتدا کا سہرا بھی منظور عارف کے سر سجتا ہے۔ ۱۹۶۶ء میں ریڈیو پاکستان سے مستقل وابستگی کے بعد انہوں نے کئی ریڈیائی ڈرامے لکھے۔ یہ ڈرامے زیادہ تر اُردو میں ہیں تاہم چند ایک ریڈیائی ڈرامے چھاچھی بولی میں بھی تخلیق ہوئے۔ منظور عارف کے چھاچھی ڈراموں میں ”چنڈیوں آئی لاری“ اور ”ویاہ“ زیادہ کامیاب ہوئے جو نہ صرف ریڈیائی ڈرامے کے فن پر پورے اترتے ہیں بلکہ اپنی بولی اور موضوعات کے حوالے سے بھی انفرادیت کے حامل ہیں۔

منظور عارف کے ساتھ ساتھ چھاچھی بولی کو حکیم نائب رضوی ایسا قادر الکلام شاعر بھی میسر آیا جس نے اس بولی میں نظمیں کہہ کر اس کے مقام و مرتبہ کو اوج آشنا کیا۔ حکیم نائب رضوی نے ۱۹۵۷ء میں شاعری آغاز کی۔ آپ کے نانا شاہ ولایت اور پرنانا مہتاب شاہ چھاچھی بولی کے پُر گو اور مقبول شاعر تھے۔ حکیم نائب رضوی

کی شاعری کا ایک بڑا حصہ اگرچہ پنجابی (ٹکسالی) میں ہے تاہم اُن کی چھاچھی نظموں کی تعداد بھی کم نہیں۔ اُن کی ایک معروف نظم ''آپنا گراں'' دیکھیے:

آپناں گراں ہووے
تُوتاں نی چھاں ہووے
وانے نی منجی اُتے
سرے تلے بانہہ ہووے
اپنا گراں ہووے
جتنے دیہاڑے جیواں
خوشیاں نا سائیں تھیواں
لسیاں تے دُدھ پیواں
کِلے اُتے گاں ہووے
آپنا گراں ہووے

پروین ملک پنجابی کی خواتین افسانہ نگاروں میں بہت نمایاں مقام رکھتی ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''کیہہ جاناں میں کون'' شاہ مکھی (فارسی) اور گورمکھی رسم الخطوں میں شائع ہو کر بہت مقبول ہوا۔ اس مجموعے کا امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کے دامن میں پنجابی (ٹکسالی) کہانیوں کے ساتھ ساتھ کُجھ چھاچھی کہانیاں بھی موجود ہیں۔ پروین ملک وہ پہلی تخلیق کار ہیں جنہوں نے چھاچھی بولی میں جدید طرز کی کہانیاں لکھنے کی بنیاد ڈالی۔ پروین ملک کی کہانیوں کی تازہ مجموعے ''نِکے نِکے دُکھ'' میں بھی کُجھ چھاچھی کہانیاں موجود ہیں۔ ایک کہانی سے اقتباس دیکھیے:

> سیالے نے راتی، گھُپ ہنیرا، پورا جنگل جیہوں ٹھُٹھمرے کے کھلوتا وے۔ ہر پاسے چُپ چاں ایں۔ کِتیں کِتیں ویلے سُکیاں پتراں اُتے تریل پئی اے تاں ترپ نی ٹھُکھی واز آنی اے یا کوئی بھُکھا گِدڑ ٹھری وئی اواز کڈھ کے چُپ ہو وینا وے پر ایہہ اوازاں اُس چپ آں نئیں پگھلا سکنیاں، جیہڑی برفاں آر جنگل نے بُوٹے بُوٹے اُتے جم گئی اے۔ سارے پکھنوں آپنیاں آہلنیاں وچ لُک کے کھباں وچ موںہہ چھپا کے بیٹھے نیں، اس ویلے نے انتظار وچ جدوں دیہوں نکلسی تے اوہناں نیاں ٹھریاں ہڈاں واں ذرا جیہا سیک پہنچ سی۔ پر ہلے اوہ ویلا بہوں دورا اے اس توں سارے چھاہڑ کے بیٹھے نیں۔ (۱۵)

اُردو کے معروف افسانہ نگار ڈاکٹر حامد بیگ نے اُردو کے ساتھ ساتھ چھاچھی بولی میں بھی کہانیاں لکھ کر

اپنی علاقائی بولی کو جدید علامتی کہانی کے ذائقے سے روشناس کرایا۔ ان کی چھاچھی کہانیوں کا مجموعہ ’’قصہ کہانی‘‘ کے نام سے ۱۹۷۴ء میں پاکستان پنجابی ادبی بورڈ لاہور نے شائع کیا۔ مجموعے کی اشاعت سے پہلے یہ کہانیاں پنجابی رسائل میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ ’’قصہ کہانی‘‘ چھاچھی افسانوں کی پہلی باقاعدہ کتاب ہے۔ محمد آصف خاں نے ’’قصہ کہانی‘‘ کے افتتاحیے ’’پہلی گل‘‘ میں لکھا ہے:

> مرزا حامد بیگ ایہہ کہانیاں اپنی جوہی بولڑی وچ لکھیاں ہن، گھبر پڑھن ہاراں نوں ایہہ اوپری جاپسی، سیانے ایہناں کہانیاں دے لسانی ڈھانچے دا رنگ نکھیڑ کر کے کئی اچھے سٹے سامنے لیا سکدے ہن جیہناں ول کسے گریئرسن دا۔ جے دھیان نہیں گیا۔ (۱۶)

مرزا حامد بیگ کی چھاچھی کہانیوں میں علاقہ چھچھ کی تہذیب و تمدن کا رنگ پوری طرح جلوہ گر ہے۔ ان کا چھاچھی رنگ دیکھیے:

> اُس نی قبراں دائیں ہتھ کر لوک قسماں کھانے ہے۔ تے اپنے پیاریاں واں اس نے بھیڑے انجام توں ڈرانے ہیے۔ جدوں ساون نی پہلی کنی پئی ہئی تاں آبادی نا ہمیرا ہور ودھ وینا ہیا، ہرے اوہا دیہاڑے ہونے ہے جدوں لوک مدتاں بعد آپے چ ہس بول گھننے ہے۔ (۱۷)

پروفیسر غلام ربانی فروغ نے چھاچھی بولی میں لاجواب نظمیں اور غزلیں کہی ہیں۔ اُن کا چھاچھی کلام کا مجموعہ ’وسنا رہوے گراں‘ کے نام سے شائع ہوا۔ ان کی چھاچھی غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

لکھ لکھ شُکر خدا نا راہیو! راہ وچ ہک سراں تاں اَیہ
رات سفر نی کٹّن واسے امن امان نی تھاں تاں اَیہ
سُن اوئے گُہاڑی والیا سنگیا! ساوا بوٹا ٹُکّن گناہ وے
کیہڑی غلطی کرن لگا ویں، اُچھل سہی پر چھاں تاں اَیہ
پار سمندروں خط آیا وے دُور وسیناں سجناں نا
بھاویں میندے ناں نئیں آیا اس وچ میندا ناں تاں اَیہ
زندگی نا ورتاوا ویکھا فرقو فرقی لوکاں نال
موت ہکا جیہی سب نا ورتے موتاں کول نیاں تاں اَیہ
کدے بھرا کمزور بھی ہووے وت بھی اُس نی قدر ای کریے
بھاویں تجی وانگ نُئیں پر کھبتی بانہہ بی بانہہ تاں اَیہ

عہد حاضر کے معروف پنجابی شاعر اور افسانہ نگار توقیر چغتائی نے بھی چھاچھی بولی میں عمدہ نظمیں اور افسانے لکھے ہیں۔ ان کی چھاچھی نظموں کے چند نمونے دیکھیے:

ٹکڑے آندے ہوّن کے
دل نا ٹھوٹھا گھن کے
گُمیا گُجھ ہدراتی نا
ڈیوا چیکے راتی نا
دھواں رووے باتی نا
رہ گیا مان چواتی نا
بوٹی بوٹی رُنھ کے
ٹکڑے آندے ہوّن کے
دل نا ٹھوٹھا گھن کے (۱۸)

☆☆☆

رونیاں رونیاں راہ تکنی اکھ بج ونجسی
دیوا بُجھ ونجسی
کُرنیاں کُرنیاں پنجرہ کدھرے ڈھے ویسی
پینڈا رہ ویسی
وکنیاں وکنیاں اتھرو اکھیاں گھن ویسن
جندڑی رُنھ ویسن
جان ہکلی نہ ونجسی بہوں گُجھ ونجسی
یوا بُجھ ونجسی (۱۹)

شیخ محمد سلیمان نے اُردو کے ساتھ ساتھ چھاچھی بولی میں بھی کئی نظمیں کہی ہیں۔ اُن کی نظموں میں چھچھ کی ثقافتی اور معاشرتی زندگی اپنے تمام تر زاویوں کے ساتھ عکس انداز ہوتی ہے۔ شیخ محمد سلیمان کا ابھی تک کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ اُن کی ایک مختصر چھاچھی نظم ملاحظہ کیجیے:

اسی کیہجے لوک آں؟
اسی ایہجے لوک آں
جتھے کتھے ظلم ہووے
اکھاں نال ویکھ کے
کناں نال سُن کے
ڈورے بن وینے آں

اُٹھے ہو وینے آں
وڑ وٹ وینے آں
پرے ہٹ وینے آں
اسی کیہجے لوک آں؟
اسی ایجے لوک آں

اُردو کے معروف شاعر ملک مشتاق عاجزؔ نے چھاچھی بولی میں بھی شاعری اور افسانہ نگاری کی طرح ڈالی ہے۔ ان کی چھاچھی کہانیوں اور نظموں میں چھاچھی بولی کا کھرا اور خالص لہجہ اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے؛ ایک نظم دیکھیے:

ٹٹیہری اج بی کرلانی تے زاروزار رونی رہی
مشوماں اج بی زاری منگ کے چاہڑی دیگ چولاں نی
نمازاں اج بی میرے ونج کے بڈھیاں بابیاں پڑھیاں
دُعا منگ منگ کے تھک لتھے نہ ہاٹھاں لاہینوں چڑھیاں

جے بدل ہُن بی نئیں وسنا تاں مولا میں تاں ڈُب ویساں
تے روڑا میندیاں تاں بیڑیاں وچ وُٹے پا دیسی
جے فصلاں سڑ گئیاں ربّا تاں میندے لیکھ سڑ ویسن
تے رتیاں تونیاں وچ
نیلے پیلے سوٹ، ساوے لیپھ پڑویسن

ایہہ میندے نِکیاں نِکیاں سہکویں بالاں
تے میندے شِکیاں دِھیاں تے کھلوتے
جیہناں کُڈھ کے ہو گئے مالاں تے ان پانی نا رونا نئیں
ایہہ میندے پچھے چکے نا
تے میندے بوہے بیٹھی ہِک نمانی دھیو نے
چِتا بھاء مرینے کالیاں والاں نا رونا اے

جے اس دیہاڑی بی دھی ودھیاں نہ کیتی ساک ٹُر ویسی
کسے نی آس مُک ویسی تے کینڈھا مان تُرٹ ویسی

ایہہ گل روٹی نی نہیں رہیا!
ایہہ گل روٹی نی نہیں، روٹی تاں دو وقتاں نی اوکھی سوکھی جُڑ ویسی
ایہہ گل روٹی نی نہیں، روٹی نی نہیں رہیا
ایہہ گل روٹی نی نہیں!

حوالہ جات

۱۔ خواجہ محمد خان اسد؛ چھچھ تاریخ کے آئینے میں {مضمون}؛ سہ ماہی العلم جلد ۴۳، شمارہ ۱
۲۔ امین چند، منشی؛ سفرنامہ؛ لاہور؛ مطبع کوہ نور، بار دوم، ۱۸۵۹ء؛ ص ۱۰۹
۳۔ سی۔سی گاربٹ؛ اٹک ڈسٹرکٹ گزیٹیئر (انگریزی)؛ لاہور؛ گورنمنٹ پرنٹنگ پنجاب؛ ۱۹۳۰ء؛ ص ۳۱۸
۴۔ سکندر خان؛ دامنِ اباسین؛ ویسہ، ضلع اٹک؛ ملی کتب خانہ؛ دوم، ۱۹۹۳ء؛ ص ۳۳
۵۔ محمد آصف خاں؛ پنجابی زبان؛ اوہدیاں بولیاں تے دوجے ناں [مضمون]؛ لعلاں دی پنڈ مرتبہ اقبال صلاح الدین؛ لاہور؛ عزیز بک ڈپو؛ ۱۹۹۵ء؛ ص ۲۹
۶۔ شہباز ملک، ڈاکٹر، پنجابی لسانیات؛ لاہور؛ مکتبہ میری لائبریری، دوجی وار ۱۹۸۹ء؛ ص ۳۷_۱۳۴
۷۔ احمد حسین قریشی، پنجابی ادب کی مختصر تاریخ؛ لاہور؛ مکتبہ میری لائبریری؛ دوم، ۱۹۷۲ء؛ ص ۱۷
۸۔ سلیم خان گمی؛ پنجابی زبان دا ارتقا؛ لاہور؛ عزیز پبلشرز؛ اوّل، ۱۹۹۱ء؛ ص ۱۱۱
۹۔ سکندر خان؛ دامنِ اباسین؛ ص ۲۷۹
۱۰۔ ایضاً؛ ص ۲۸۱
۱۱۔ عبدالغفور قریشی؛ پنجابی زبان و ادب تے تاریخ؛ لاہور؛ عزیز بک ڈپو؛ اوّل ۱۹۵۶ء؛ ص ۵۹
۱۲۔ انور بیگ اعوان؛ دھنی ادب و ثقافت؛ چکوال؛ بزمِ ثقافت؛ اوّل، ۱۹۶۸ء؛ ص ۱۱۶
۱۳۔ منظور عارف؛ لہر لہر دریا؛ لاہور؛ مطبوعات؛ ۱۹۸۱ء؛ ص ۸
۱۴۔ محمد یٰسین ظفر، ڈاکٹر؛ پوٹھوہاری، پنجابی شاعری؛ لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ اوّل ۱۹۹۷ء؛ ص ۳۰۵
۱۵۔ پروین ملک، کیہہ جاناں میں کون؛ لاہور؛ سارنگ پبلی کیشنز؛ دوجی وار؛ ۱۹۹۵ء؛ ص ۹۷، ۹۸
۱۶۔ حامد بیگ، مرزا؛ قصہ کہانی؛ لاہور؛ پاکستان پنجابی ادبی بورڈ؛ ۱۹۸۴ء؛ ص ۸
۱۷۔ غلام ربانی فروغ، وسنا رہوے گراں؛ اٹک؛ پنجابی ادبی سنگت؛ ۲۰۰۴ء؛ ص ۴۰_۱۳۹
۱۸۔ محمد آصف خاں [ایڈیٹر]؛ تماہی پنجابی ادب؛ جلد ۳، شمارہ ۱۰؛ اپریل تا جون ۱۹۸۹ء؛ ص ۵۱
۱۹۔ محمد آصف خاں [ایڈیٹر]؛ تماہی پنجابی ادب؛ جلد ۴؛ شمارہ ۱۴؛ اپریل تا جون ۱۹۹۰ء؛ ص ۵۰

☆☆☆☆

ڈاکٹر ارشد معراج

پنجابی زبان: لہجے اور بولیاں

ازمنۂ قدیم سے جب انسان نے غار سے نکل کر شعور کا سفر شروع کیا اور کاشت کاری میں مہارت حاصل کر لی تو گروہوں کی صورت میں زندگی بسر کرنے لگا۔ پانی کاشت کاری کیلئے اہم جز و کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے دریاؤں کے کنارے آبادیاں بڑھنے لگیں۔ قبیلے گاؤں اور پھر شہروں کا روپ دھار گئے۔

پاکستان کا اہم ترین اور آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ پنجاب دو لفظوں ”پنج“ اور ”آب“ کا مرکب ہے یعنی ”پانچ پانی“ یہاں پانی سے مراد دریا ہیں۔ کیونکہ یہ پانچ دریاؤں، جہلم، چناب، راوی، ستلج اور بیاس کا علاقہ ہے۔ قیام پاکستان سے قبل پنجاب کا مشرقی حصہ جو کہ ضلع گورداسپور، امرتسر، کپورتھلہ، جالندھر، فیروزپور، بھٹنڈا پٹیالہ، لدھیانہ، سنگرور، ہوشیار پور، انبالہ تھا جو کہ تقسیم کے بعد بھارت کے حصے میں آیا جب کہ لاہور، سیالکوٹ، گوجرنوالہ، ملتان، ساہیوال، فیصل آباد، مظفر گڑھ، ڈیرہ غازی خان، راولپنڈی، جہلم، گجرات، سرگودھا، اٹک، میانوالی، چکوال، (بعد میں ریاست بہاولپور کو مغربی پنجاب کہا جاتا تھا) پاکستان میں شامل کر دیا گیا۔

لفظ ”پنجابی“ پنجاب کی زبان ہونے کی وضاحت کرتا ہے۔ پنجابی زبان پانچ دریاؤں کے علاوہ ستلج اور مشرق تک پھیلی ہوئی ہے اور ان پانچ دریاؤں کی مشرقی سمت میں سندھ تک پہنچ جاتی ہے۔ دریائے ستلج اور بیاس کے درمیان دوآبہ پر بھی اسکا قبضہ ہے اور چناب کے درمیان رچنا دوآب کے ایک حصے پر بھی یہی زبان راج کرتی ہے۔ اس ساری پٹی کو دریائے جہلم اور دریائے چناب سیراب کرتے ہیں۔ ستلج کے زیریں حصے میں یہ زبان نہیں بولی جاتی تاہم پنجابی پورے پانچ دریاؤں کی مکمل زبان ہے۔

ہر زبان کے مختلف علاقائی لہجے (Dialect) ہیں جنہیں بولیاں بھی کہا جاتا ہے۔ ان میں ایک بولی معیار کی حیثیت رکھتی ہے۔ پنجابی زبان میں ماجھے کے دوآبہ باری کے علاقے کی بولی جو کہ شمال مشرقی حصے گورداسپور، امرتسر، فیروزپور، لاہور کے مشرقی حصے اور دریائے ستلج، دریائے بیاس کے درمیانی، راوی، ستلج کے مکمل علاقے کے علاوہ گوجرنوالہ، سیالکوٹ اور گجرات کے علاقے میں بولی جانے والی پنجابی زبان کو مرکزی پنجابی کی حیثیت حاصل ہے۔ زبان کے معاملے میں یہ بہت مشکل عمل ہے۔ کہ کسی ”لہجے“ (بولی) کی تقسیم کے لئے کوئی لکیر کھینچ دی جائے۔ مشرقی پنجاب (بھارتی پنجاب) میں بھٹیانی، پوادھی، راٹھی، مالوی، دوآبی کے لہجوں میں پنجابی زبان بولی جاتی ہے اور مغربی پنجاب (پاکستانی پنجاب) میں پوٹھوہاری، دھنی، چھاچھی،

شاہپوری، ریاستی، سرائیکی اور جانگلی کے لہجے رائج ہیں۔

سب سے پہلے ہم مشرقی لہجوں پر غور کرتے ہیں۔ ان میں بھٹیانی لہجہ/بولی، حصار، بیکانیر کے راٹھ اور باگڑی لوگ بولتے ہیں۔ اور اس پر ہندی کے اثرات زیادہ نمایاں ہیں۔ تحصیل فاصلکا، ممدوٹ، فیروزپور کے آس پاس اسے راٹھی، راٹھوری اور باگڑی کا نام دیا جاتا ہے۔ مشرقی پنجاب کا لہجہ / بولی (Dialect) ''پوادھی'' ہے پوادھی کا مطلب مشرقی حصہ ہوتا ہے۔ اس کا اصل روپ پٹیالہ میں بولا جاتا ہے۔ حصار، انبالہ، کلیئر شریف، نالاگڑھ اور ریاست جنید کے لہجوں پر ہندی، باگڑی، اور بھٹیانی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ماہر لسانیات کی تحقیق کے مطابق راٹھی لہجہ/بولی (Dialect) پوادھی ہی کی اگلی شکل ہے کیونکہ اس کے علاقے کے تعین میں ماہرین کی رائے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ پروفیسر جوگندر سنگھ پنجابی لسانیات میں راٹھی بولی کے لئے جو علاقہ بتاتے ہیں۔ پوادھی کا علاقہ بھی وہی ہے۔ بعض محققین اس بولی/لہجے کو بھٹیانی کا حصہ بھی قرار دیتے ہیں۔ یہ ضلع حصار کے دریائے گھگر کے ساتھ ساتھ کے علاقہ میں بولی جاتی ہے۔ مالوی کا علاقہ فیروزپور، لدھیانہ، تپہ، مانسر، تلونڈی، فرید کوٹ، مالیہ، کوٹلہ، دھنولہ، بھٹنڈا، پٹیالہ، کیتھل، جگراؤں، نروانہ، رائے کوٹ، ہمرالہ، کھنہ، اچھوواڑہ، وغیرہ ہیں۔ جب کہ لدھیانے کی بولی لہجہ اپنے (Phonetic Reader) میں مختلف ہے۔

مغربی پنجاب (پاکستانی پنجاب کے لہجوں / بولیوں Dialects میں سب سے پہلے پوٹھوہاری پر بات کرتے ہیں۔ ممتاز محقق ''گریرسن'' کے مطابق پوٹھوہاری کا مطلب ''اونچا علاقہ'' ہوتا ہے۔ اس لیے یہ پہاڑی علاقوں کی بولی سمجھی جاتی ہے۔ وہ پوٹھوہاری کی دو قسمیں بتاتے ہیں۔ ایک وہ جو راولپنڈی، گوجر خان اور اسکے گردونواح میں بولی جاتی ہے۔ دوسری شمال میں خاص طور پر ''مری'' کے پہاڑی علاقوں میں رائج ہے۔ وہ پوٹھوہاری کو سرائیکی کی جنوب مشرقی شاخ قرار دیتے ہیں۔ جبکہ بعض ماہر لسانیات اسے الگ علاقائی زبان کا درجہ دیتے ہیں۔ پوٹھوہاری کی حد دریائے جہلم اور سندھ کا علاقہ قرار پاتی ہے۔ اسکا مرکز راولپنڈی ہے اور یہ ضلع جہلم کے مشرقی حصے اور گجرات کے شمالی حصے اور کوہ مری کے علاوہ ضلع ہزارہ کے کچھ حصے اور گجرات کے شمالی حصے میں بولی جاتی ہے۔ ''دھنی'' اور ''چھاچھی'' کو بھی پوٹھوہاری ہی کی شاخیں سمجھا جاتا ہے۔ دھنی کا علاقہ جہلم، تلہ گنگ، چکوال کا ایسا علاقہ ہے جو مغرب میں ''میرا تھر چک'' سے مشرق میں ''سر کال ماڑ'' تک اور شمال میں ''نیلہ ویلہ'' سے لے کر جنوب میں ''ڈھوک ناہلیاں'' تک پھیلا ہوا ہے۔ دھنی پر پوٹھوہاری اور سرائیکی کے ملے جلے اثرات ہیں۔ اس لئے اسے پوٹھوہاری کی ذیلی بولی/لہجہ کہا جاتا ہے لیکن ''دھنی'' بولنے والے الگ سے اپنی پہچان پر زور دیتے ہیں اور ''پوٹھوہاری'' سے مختلف سمجھتے ہیں۔ ''چھچھ'' کیمل پور اٹک، ہزارہ اور پشاور کے کچھ حصے پر مشتمل ہے یہاں کے لوگ چھاچھی کہلاتے ہیں اسی حوالے سے ان کی بولی / لہجے کو ''چھاچھی'' کہا جاتا ہے اور یہ بھی پوٹھوہاری کی ذیلی شاخ ہے لیکن ''چھاچھی'' بولنے والے بھی ''دھنی'' کی طرح

”پوٹھوہاری“ سے الگ بولی تصور کرتے ہیں۔

”شاہ پوری“ بولی / لہجے کا علاقہ سرگودھا، جھنگ، میانوالی، ڈیرہ اسماعیل خان اور فیصل آباد ہے۔ اسے ”لہندی“ یعنی سرائیکی کے قریب ترین تصور کیا جاتا ہے۔ مگر یہ بولی نہ تو سرائیکی ہے اور نہ پوٹھوہاری جبکہ ان دونوں بولیوں کے عناصر باکثرت پائے جاتے ہیں۔ ”گریرسن“ اسے ”تھلی“ یعنی تھل کی زبان کہتا ہے۔ ان کے مطابق ڈیرہ اسماعیل خان میں اسکا نام ”ہندکی“ یا ”ڈیرہ والی“ ہے میانوالی اور بنوں میں ”ہندکو“ یا ”نو“ ”ملکی“ اور جھنگ میں ”تھلوچاری“ ہے۔ شاہ پوری لہجے کو ایک ذیلی شاخ ”گوندل بار“ کے علاقے میں بولی جانے والی بولی کی صورت میں سامنے آتی ہے جو کہ پھالیہ، گجرات، سرگودھا، خوشاب، جوہرآباد، چنیوٹ، فیصل آباد، جھنگ کے کچھ علاقوں میں رائج ہے۔ یہی بولی ”ساندل بار“ میں بولی جاتی ہے۔ کمالیہ، ساہیوال اور پاک پتن کا علاقہ جنگل بیابان تھا۔ اس لئے اس علاقے کے لوگوں کو جنگلی (جانگلی) کہا جانے لگا اور اسی مناسبت سے یہاں کی بولی کو ”جانگلی“ کہتے ہیں یہ نیلی بار اور گنجی بار کے علاقے بھی کہلاتے ہیں۔ یہ بولی سرائیکی کے بالکل قریب ترین ہے۔

پنجاب میں جیسے جیسے جنوب کی طرف سفر کریں ویسے ویسے پنجابی زبان پر سندھی زبان کے گہرے اثرات مرتب ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ جو سرائیکی کا روپ دھار لیتے ہیں محققین لسانیات میں یہ بات وجہ تنازع بن چکی ہے کہ سرائیکی خود ایک مکمل زبان ہے۔ یا یہ پنجابی کا ایک لہجہ ہے۔ سرائیکی کو زبان قرار دینے والے بعض ماہر لسانیات حضرات داتا گنج بخشؒ کی کتاب ”کشف المحجوب“ کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ لاہور کے بارے میں جو کہ پنجابی زبان کا مرکز ہے کو حضرت صاحبؒ نے ملتان کے مضافات میں واقع ایک گاؤں قرار دیا ہے۔ اسی مناسبت سے ان کا دعویٰ ہے کہ ملتان چونکہ قدیم تہذیب وثقافت اور تمدن کا گہوارہ ہے اس لئے یہاں کی بولی ایک مکمل زبان کی حیثیت رکھتی ہے۔ سرائیکی ملتان، ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ، لیہ، راجن پور، بھکر، کلورکوٹ میں بولی جاتی ہے جبکہ بہاولپور، رحیم یار خان، صادق آباد کی سرائیکی کو ”ریاستی لہجہ“ قرار دیا جاتا ہے۔

پنجابی کی علاقائی بولیوں / لہجوں (Dialects) میں دو طرح کے واضح فرق ملتے ہیں پہلا ادائیگی، لہجہ یا تلفظ کے فرق کا معاملہ دوسرا (Phonetic Reader) کا۔ جہاں تک لہجہ یا تلفظ کے فرق کا معاملہ ہے تو بعض اوقات ایک ہی لفظ سفر کرتا ہوا مختلف جگہوں لہجوں میں بولا جاتا ہے۔ پنجاب کے شرق میں پنجابی کا جھکاؤ اردو و ہندی کی طرف ہے۔ اور مغرب میں جیسے جیسے جنوب کی طرف جائیں ویسے ویسے پنجابی پر سندھی کا رنگ غالب آجاتا ہے۔ جنوب کی طرف پنجاب سے باہر پشاور کی جانب پنجابی پر پشتو کے اثرات مرتب ہوئے ہیں اور پہاڑی بولیوں میں کشمیری کے اثرات کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ تمام لہجے مرکزی پنجابی سے کسی نہ کسی طرح فطری طور پر مختلف ہیں۔

قاسم یعقوب

ادب اور اسلوبیات

''اسلوب''اور''اسلوبیات''میں بنیادی فرق متن کے تجزیاتی حربے کا ہے ۔ ''اسلوب''میں متن کے تجزیے میں اُن اوصاف کو زیرِ مطالعہ لایا جاتا ہے جو ایک اضافی جمالیات کے طور پر متن کا حصہ بنائی گئی ہوتی ہیں ۔ جب کہ ''جدید اسلوبیات'' تجزیے میں متن کی زبان کی کارکردگی کو بنیاد بناتی ہے یعنی ایک متن کس طرح کی بنت سے گزر کر دوسرے متون سے الگ یا اپنی موجودہ حالت میں تشکیل پایا ہے ۔ اُسلوب متن میں موجود اوصاف کی نشان دہی تک کا محدود مطالعہ ہے جب کہ اسلوبیات میں زبان کو مرکز بنا کر فن پارے پر اثرات انداز ہونے والے شعوری اور لاشعوری محرکات کو زیرِ مطالعہ لا کر مصنف کی تخلیقی صلاحیت کو جانچنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ دونوں کا مدعا ایک ہے مگر Treatment مختلف ہے ۔

اُردو میں اسلوب اور اسلوبیات میں کوئی واضح فرق نہیں کیا جاتا ۔ بلکہ اُسلوب کے ضمن میں ہی اُسلوبیات کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے ۔ جے اے کڈن نے اُسلوب [Style] اور جدید اُسلوبیات [Stylistics] میں فرق بتاتے ہوئے اسلوب کو Characteristics manners of expression کہا ہے جب کہ اسلوبیات کو زبان کے بنیادی اجزا کا مطالعہ بتایا ہے ۔ کڈن اسلوب پر لکھتا ہے:

> "The analysis and assessment of style involves examination of a writer's choice of words, his figures of speech, the devices(rhetorical and otherwise), the shape of his sentences(whether they be looser or his periodic), the shape of his paragraphs indeed, of every conceivable aspect of his language and the way in which he uses it" (۱)

اور اُسلوبیات کی وضاحت میں لکھتا ہے:

> "Akin to linguistics and semantics, it is analytical science which covers all the expressive aspects

> of language: phonology, prosody, morphology, syntax and lexicology."

(۲) ادب کی ماہیئت کو جاننے اور جانچنے کے لیے عملی تنقید میں اُسلوبیات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اُسلوبیات، اُسلوب کا لسانی مطالعہ ہے جس میں یہ جاننے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ایک فن میں کون سے خصائص پس منظر سے ابھر کے مصنف کی امتیازی حیثیت کی نمائندگی کرنے لگے ہیں۔ اُردو میں اسلوبیات پر جو لکھا گیا ہے اُس کا معیار محض تشریحی نوعیت کا ہے۔ اُردو شعر و نثر کے جمالیاتی طرزِ فکر و ادا کو جانچنے کے لیے مشرقی محسناتِ شعری کا سہارا لیا جاتا رہا ہے جو "اسلوب" کی نمائندگی کرتی ہے۔ اسلوب کو شخصیت اور ذات کا لازمی جز و سمجھا گیا ہے۔ یعنی ذات کا تخلیقی اظہار اسلوب میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ کوئی فن پارہ اپنے مصنف کی تخلیقی شخصیت کے اندازِ جمال کا احاطہ کیے ہوتا ہے۔ اندازِ جمال سے مُراد ایک شاعر یا نثر نگار اپنی ذات یا تصورِ جمال کے اظہار کے لیے کس قسم کے فکری اور لسانی خصائص کو بروئے کار لاتا ہے۔ جدید اسلوبیات نے اپنا دائرہ کار اسلوب کی بنیاد پر الگ سے بنایا ہے۔ جدید اُسلوبیات کا دعویٰ ہے کہ فن پارے کے ادبی خصائص متن کے لسانی ڈھانچے میں موجود ہیں۔ مصنف اپنے اسلوب کی تشکیل میں لسانی پیرایے کا محتاج ہے۔ جب کہ زبان اپنے کلچر کی زائیدہ ہے جس میں تمام ثقافتی سرگرمیاں، زبان کی لانگ اور عصر میں موجود معاشرتی و تہذیبی شعور بھی شامل ہوتا ہے جو مصنف پر زبان کے ذریعے حاوی ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ جدید اُسلوبیات نے "اُسلوب" کی اِس شق کو من و عن قبول کر لیا کہ اُسلوب لسانی امتیازات کی بنیاد پر فن پارے کی انفرادی طرزِ نگارش کو سامنے لاتا ہے۔ مگر اسلوب اور اسلوبیات کا دائرہ کار یہاں سے مختلف ہو جاتا ہے کہ اس انفرادی طرزِ نگارش کو کیسے جانچا جائے؟ اسلوب" اس سلسلے میں اُن امتیازی خصوصیات کو احاطے میں لاتا ہے جو کسی فن پارے میں کسی دوسرے فن پارے کی نسبت اضافی طور پر یا مختلف انداز میں موجود ہوتے ہیں مگر جدید اسلوبیات میں تمام لسانی ڈھانچے کا ہی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہاں اوصاف سے زیادہ اُس بنت کاری کو مرکزِ موضوع بنایا جاتا ہے جس سے گزر کر کوئی فن پارہ وجود میں آتا ہے۔ "جدید اُسلوبیات" میں "کیوں اور کیسے" کا سوال نمایاں ہوتا ہے جب کہ اسلوب کے مطالعے میں "کیا" کا سوال مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو دونوں کا مرکزی نقطہ ایک ہی طرح کا ہے یعنی فن پارے کا معروضی مطالعہ جدید اُسلوبیات میں "اُسلوب" کی بھی خوبیوں کو سمیٹ لیا جاتا ہے مگر "اسلوب" کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم اس کے لسانی امتیازات سے محروم رہتے ہیں اور خود کو محض طرزِ نگارش اور اندازِ بیاں کی آرائشی خوبیوں کی داد تک محدود کر لیتے ہیں۔ آپ اندازہ کریں کہ ن م راشد جیسے شاعر نے بھی اسلوب کی شناخت کے لیے زبان کو غیر ضروری قرار دیا ہے:

> "جب زندگی کسی ادیب کے اندر جذبات پیدا کرنے سے بے بس رہ جائے یا جب کوئی

> ادیب زندگی سے الہامات کا اکتساب کرنے کی بجائے الفاظ سے کرنے لگے تو اس کی نگارشات میں تصنع پیدا ہونے لگتا ہے۔ یعنی جس وقت جذبات کی تحریک اور ان کا ہیجان موجود نہیں ہوتا تو اکثر ادبا اس کی تلافی کرنے کے لیے ارادی اور شعوری طور پر استعارات کی نمائش کرنے لگتے ہیں یا اپنی ہی طرز نگارش کے حسن پر وہ اس قدر فریفتہ ہو جاتے ہیں کہ ان کے لیے جذبات میں کوئی دلکشی باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ اسلوب بیان کا انحصار کسی طرح زبان پر نہیں بلکہ ادیب کے رجحانات پر خصوصی پر ہے۔ جن کے سبب سے اس نے اپنے لیے خاص اسلوب بیان اختیار کیا۔ یہ رجحاناتِ خصوصی اسی وقت کامیابی سے اپنا عمل کرتے ہیں جب ادیب زبان کو اپنے اوپر طاری کرنے کی بجائے خود اسے اپنے جذباتی اور ذہنی تجربات کے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔‘‘(۳)

یہاں گوراشد اپنی وضاحت بھی پیش کر رہے ہیں کہ زبان میں طرزِ نگارش کی بناوٹ میں جب آرائشی استعارات کا استعمال کرنے لگیں تو اسلوب بے رس ہو جاتا ہے۔ مگر راشد اس حقیقت سے بے خبر رہے کہ زبان ہی سے مصنوعی اور سچے اُسلوب کا دارومدار ہے۔ اسلوب خواہ شعوری بنایا جا رہا ہو یا لاشعوری، جمالیات کا مرقع ہو یا غیر جمالیاتی اظہار، زبان ہی کے ذریعے اپنی تخلیقی قوت کی نمو لیتا ہے۔ زبان سے مُراد زبان کا ثقافتی، شعریاتی texture ہے۔ زبان کوڈ زدر کوڈ کا سلسلہ ہے جس کی غیر موجودگی میں خیالات یا تصورات کا وجود ناممکن ہوتا ہے۔

اُردو میں ’’جدید اُسلوبیات‘‘ ایک دو دہائیاں ہی پرانا موضوع ہے۔ اُسلوبیات پر جو سب سے بڑا اعتراض کیا جاتا رہا ہے وہ اس کا غیر اقداری ہونا بتایا جاتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی اس حوالے سے اپنا موقف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ’’اُسلوبیاتی تنقید خاصی حد تک قطعی ہوتی ہے لیکن یہ بتانے سے قاصر ہے کہ جس فن پارے کا وہ تجزیہ کر رہی ہے اس میں اچھائی کیا ہے، یعنی وہ کیوں اچھا یا اہم ہے۔‘‘(۴)

گوپی چند نارنگ بھی اپنے مضمون ادبی تنقید اور اسلوبیات میں لکھتے ہیں:

> ’’اُسلوبیات اس طرح سے جمالیاتی قدر سے علاقہ نہیں رکھتی جس طرح ادبی تنقید رکھتی ہے۔ اُسلوبیات کا کام بس اس قدر ہے کہ وہ لسانی امتیازات کی حتمی طور پر نشان دہی کر دے۔ ان کی جمالیاتی تعین قدر ادبی تنقید کا کام ہے۔‘‘(۵)

اُسلوبیات کے ضمن میں یہ سوال سب سے اہم نوعیت کا ہے کہ کیا اُسلوبیات کا دائرہ کار محض اشارے

تک ہے یا امتیازات کی نشان دہی اسلوبیات کا آخری ہدف ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں اُسلوبیاتی مطالعوں کے اطلاقی نمونوں سے رجوع کرنا پڑے گا۔ ہم مندرجہ ذیل قسم کے سوالات سے دو چار ہو سکتے ہیں:

- اُسلوبیاتی مطالعہ کس تنقیدی کمی کو پورا کرنے کی غرض سے کیا جائے؟
- ادبی تنقید کے کن تقاضوں کو اسلوبیات پورا کر رہی ہے؟
- اُسلوبیاتی تنقید کے نتائج تعینِ قدر میں مدد فراہم کرتے ہیں یا خود ہی کسی قدر کے تعین کا اعلان کرتے ہیں؟

ان سوالات کے احاطے میں ادبی تنقید اور اُسلوبیاتی تنقید کا دائرہ کار متعین ہوتا نظر آتا ہے۔ اسلوبیات جب کسی فن پارے کا مطالعہ کرتی ہے تو وہ ادبی تنقید کا ہی کوئی بنیادی سوال لے کر اپنے تجزیے میں اُترتی ہے اور جب اپنے نتائج مرتب کرتی ہے تو وہ اقداری نوعیت کے بھی ہو سکتے ہیں یا بڑی حد تک ہوتے ہیں۔ گویا ہم اُسلوبیاتی مطالعوں میں اقداری فیصلوں کی توقع بھی کر سکتے ہیں۔

کچھ سوالات دیکھیے جو ادبی تنقید کے دائرہ کار سے اسلوبیاتی تنقید کے دائرہ کار میں داخل ہوتے ہیں:

- میر اور غالب کے عہد کی زبان میں بنیادی فرق محض لسانی انحراف و انتخاب ہے یا فکری انتخاب و انحراف بھی وقوع پذیر ہُوا ہے؟
- غالب کا اپنے آخری ادوار میں سادہ اظہار اپنے مشکل پیرایے سے کس حد تک مختلف ہے؟
- اقبال کے عہد میں لکھی جانے والی کثیر تعداد میں غزل، لسانی حوالے سے کیوں اہم مقام نہ بنا سکی؟
- اقبال نے اپنے فکری انحراف کی بنیاد کس طرح لسانی انحراف سے تیار کی؟ اس سلسلے میں اقبال کے صوتی، قوافی، معنیاتی اور قواعدی مطالعے کیا ہوں گے؟
- مجید امجد، راشد اور میرا جی کے درمیان کون سے امتیازات ہیں جنھوں نے ان شعرا کو فکری اور لسانی سطح پر جدید نظم نگار بنا دیا؟

ایسے سوال پہلے سے تیار کیے جا سکتے ہیں جن کا تعلق براہِ راست اقداری فیصلوں سے ہے اور وہ اسلوبیاتی تجزیوں ہی کے مرہونِ منت کوئی نتائج نکال سکتے ہیں۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ اسلوبیات کیا ہر تنقید کا معروضی ڈھانچہ صرف نتائج مرتب کرتا ہے اُن نتائج کی بنا پر کوئی فیصلہ کرنا نقاد کے قاری کا کام ہوتا ہے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ اسلوبیات کوئی نتیجہ مرتب کرے اور دو مختلف نقاد دو مختلف فیصلے صادر کر دیں۔ مثلاً:

- اس شاعر کے ہاں استعاروں اور تشبیہات کا وسیع نظام موجود ہے جو پہلے سے موجود فن پاروں

سے انحراف کرتا ہے

نتیجہ۱: (اس لیے یہ شاعر بہت مختلف اور جدید شعریات کی تشکیل کرنے والا شاعر ہے اسی لیے بڑا شاعر بھی ہے۔)

نتیجہ۲: (چوں کہ اس شاعر کے ہاں استعاروں اور تشبیہات کی بھرمار ہے اور وہ بھی نئی طرز کی، اس لیے فکر کا ظہور دب گیا ہے، آرائش غلبہ پا گئی ہے۔ اسی لیے شاعر کوئی بڑا فن پارہ قائم نہیں کر پایا اور نہ ہی بڑا شاعر قرار پاتا ہے۔)

یہاں دیکھیے، دو نقاد ایک ہی طرح کے نتیجے سے دو مختلف نتائج اخذ کر رہے ہیں۔ 'نقاد' اور 'نقاد کا قاری' دو مختلف حالتوں کا نام ہے۔ اس لیے کسی تنقیدی ڈسپلن کا اقداری یا غیر اقداری کہنا نا مناسب ہے۔

اسلوبیات کے حوالے سے سب سے اہم کتاب 'ادبی تنقید اور اسلوبیات (گوپی چند نارنگ)' ہے۔ اس میں موجود گوپی چند نارنگ کا مضمون 'اسلوبیاتِ اقبال: نظریہ اسمیت اور فعلیت کی روشنی میں)' نے اقبال کی فکر کو لسانی مطالعے میں پکڑنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور ہمیں ان نتائج سے آگاہ کیا ہے کہ ''سچے فعلیہ اسلوب کی تخلیق سچے اسمیہ اسلوب کی تخلیق سے زیادہ مشکل ہے۔ اس میں تہ داری اور معنی آفرینی کی گنجائش زیادہ ہے۔'' اقبال کے شعری مزاج کو عموماً اسمیہ اسلوب کا آہنگ کہا جاتا ہے مگر اقبال کا اصل مزاج فعلیہ آہنگ ہے۔ چوں کہ بلند آہنگ اس کا تقاضا کرتا تھا۔ اس طرح اقبال نے بھاری لفظوں کے انتخاب اور غیر مانوس اور غیر روایتی تراکیب کو کارآمد کر لیا۔

فیض اور ترقی پسند فکر کے نمائندہ شعرا کا مطالعہ بھی اس ضمن میں بہت مفید ہو سکتا ہے۔ ترقی پسند شعرا اپنی فکر کی پسپائی اور انتشار کے بعد اپنے اسلوب کے بھی زوال کا شکار ہوتے گئے حالاں کہ ترقی پسند فکر کے عروج کے دور میں اُسلوب کی حد تک بہت سے ترقی پسند شعرا اپنی فکر اور اسلوب میں حد درجہ مختلف اور امتیازی ہیں۔ اس طرح کی بازیافت کے لیے ادبی تنقید اپنا قضیہ ''اُسلوبیاتی تنقید'' کو سونپتی ہے۔ یہاں اسلوبیاتی تنقید اپنے نتائج میں ناقد کے ہاں خود بخود ''اقداری نوعیت'' اختیار کر گئی ہے۔ اُسلوب اور جدید اُسلوبیات کے فرق میں یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ جب ''اُسلوب'' فن پاروں کی جمالیاتی تعینِ قدر بھی کرتا ہے اور اُن کے ادبی مقام کو نشان زد بھی کرتا ہے تو اُسلوبیات نے کس نئی چیز کی کمی کو پورا کیا ہے؟

اس کا جواب ''اسلوب کے مطالعے' اور ''اسلوبیاتی تنقید'' کے طریقے کار میں موجود فرق میں نظر آتا ہے۔ اُسلوب فن پاروں کو ذات کا عکس قرار دے کر اظہاری طریقے سے فن پاروں میں موجود جمال و آرائش کی نشان دہی کرتی ہے جو معروضی نوعیت کی ہونے کی بجائے قاری کے اپنے جمالیاتی ذوق کا اظہار بن جاتا

ہے۔ مثلاً مجید امجد کی نظم ''بن کی چڑیا'' کیوں خوبصورت نظم ہے اس کا جواب انشائی طرز کا ہونے کا امکان زیادہ ہے۔ لیکن اگر ہم اِسی نظم کا اُسلوبیاتی تجزیہ کریں تو جمالیاتی بیان لسانی معروضی تجزیات کے ذریعے، قاری یا نقاد کی ذات کے بغیر، اپنی شکل اختیار کرتا ملے گا۔ قاری یا نقاد اُسلوبیاتی مطالعے میں لسانی تجزیے کا کوئی بھی پہلو منتخب کر کے اپنے اختیار کو استعمال کر سکتا ہے مگر نتائج کے حصول تک اُسے زبان کے خودکار طریقوں کے سپرد ہونا پڑتا ہے۔

اُردو میں اسلوبیاتی مطالعوں کی ایک بڑی خامی ہی یہی رہی ہے اُن کے نتائج ہمیں کسی اہم ادبی مسئلے کے حل کی طرف گامزن نہیں کرتے۔ مرزا خلیل احمد بیگ نے اسلوبیاتی تجزیوں کی داغ بیل تو ڈالی ہے مگر وہ بڑے نتائج اخذ کرنے میں اتنا کامیاب نظر نہیں آتے جتنا ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اہم کام سرانجام دیا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مرزا خلیل کے اسلوبیاتی تجزیوں میں کوئی ادبی تنقید بنیاد نہیں بنتی یا ان تجزیوں کے بعد اسلوبیاتی نتائج سے کوئی فکری بنیاد کھڑی نظر نہیں آتی۔

حوالہ جات

1- Literary Terms and Literary Theory: J.A Cuddon,The panguin, page 872

۲۔ ایضاً

۳۔ ن م راشد: اُسلوب بیان، مقالاتِ راشد (مرتب: شیما مجید)، الحمرا پبلشرز، اسلام آباد، ص ۸۶

۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی: ''مطالعہ اسلوب کا ایک سبق'' شعر، غیر شعر اور نثر، قومی کونسل برائے فروغ اُردو، ۱۹۷۳ء، ص ۱۱۲

۵۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر: ادبی تنقید اور اُسلوبیات، سنگِ میل پبلشرز لاہور، ص ۱۲

☆☆☆☆

گبرئیل گارشیا مارکیز
لاطینی امریکن ادب سے ترجمہ: حمزہ حسن شیخ

اگست کے بھوت

ہم دوپہر سے کچھ دیر پہلے اریزو پہنچے اور وہاں پر قلعہ رینائزنس کو دیکھتے ہوئے دو گھنٹے گزار دیے۔ وینز ویلا کے ادیب میگوئیل اوٹیرو سیلوا ہمیں جو سسیین کے گردونواح کے اس سادہ و دلکش کونے میں لائے تھے۔ یہ اگست کے ابتدائی دنوں کی ایک جلتی اور سُلگتی اتوار تھی اور وہاں پہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرنا آسان نہ تھا جو ان سیاحوں سے اٹی گلیوں کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔

کئی لاحاصل کوششوں کے بعد، ہم واپس کار کی جانب گئے اور بغیر کوئی نشان چھوڑے اُس سڑک سے شہر کی جانب نکلے جو قد آور سرو کے درختوں سے سجی تھی۔ ایک بوڑھی عورت جو بطخوں کی دیکھ بھال کر رہی تھی، اس سے ہم نے قلعے کا پتہ پوچھا۔ خدا حافظ کہنے سے پہلے اس نے ہم سے پوچھا کہ کیا ہمارا وہاں رُکنے یا سونے کا ارادہ ہے اور ہم نے جواب دیا کہ ہم صرف دوپہر کے کھانے کے لیے جا رہے ہیں جو کہ ہمارا اصل مقصد تھا۔

’’یہ بہت اچھی بات ہے۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’کیوں کہ اس گھر پر جن بھوتوں کا قبضہ ہے۔‘‘

میری بیوی اور میں جو کہ ان چیزوں پر بالکل یقین نہیں رکھتے، ہمیں اس کی ضعیف الاعتقادی پر ہنسی آئی۔ لیکن ہمارے سات سالہ اور نو سالہ دو بیٹے حقیقت میں بھوت سے ملنے کے خیال پر بہت محظوظ ہوئے۔

میگوئیل اوٹیرو سیلوا جو ایک شاندار میزبان اور خوش خوارک ہونے کے ساتھ ساتھ عمدہ ادیب بھی ہیں، ایک ناقابلِ فراموش کھانے کے ساتھ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ چوں کہ ہم دیر سے پہنچے اس لیے کھانا کھانے سے پہلے ہمارے پاس قلعہ دیکھنے کا کوئی وقت نہ تھا لیکن اس کی بیرونی حالت بالکل بھی خوفناک نہ تھی اور اس پورے شہر کے بارے میں کسی بھی قسم کی بے چینی دُور ہو گئی۔ پھولوں کی روش سے سجی جگہ پر ہم نے کھانا کھایا۔ یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ اتنے ذہین و فطین لوگ اس پہاڑی پر پیدا ہوئے تھے جو کہ گھروں سے گھری تھی اور جس کی آبادی بمشکل 90 ہزار لوگوں پر مشتمل تھی تاہم میگوئیل نے قریباً مزاحیہ لہجے میں کہا کہ ان میں کوئی بھی اریزو کا قابلِ ذکر شہری نہ تھا۔

’’ان سب میں سے عظیم،‘‘ اس نے کہا، ’’لڈوویکو تھا۔‘‘

اسی کی طرح کوئی بھی خاندانی نام تھا۔ لڈوویکوفنون اور جنگ کا ایک عظیم بانی تھا جس نے اپنے دکھ و مصائب سے یہ قلعہ تعمیر کیا اور جس کے بارے میں میگوئیلکھانے کے دوران بولتا رہا۔

اُس نے ہمیں لڈوویکو کی لازوال طاقت کے بارے میں، اُس کی مشکلات سے بھرپور محبت اور اس کی خوفناک موت کے بارے میں بتایا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ دل کی دیوانگی کے لمحے میں کیا ہُوا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو بستر پر خنجر گھونپ دیا اور پھر پاگل اور غصیلے کتے خود پر چھوڑ دیے تھے اور ٹکڑوں میں تقسیم ہوگیا تھا۔ اس نے پوری سنجیدگی کے ساتھ ہمیں یقین دلایا کہ آدھی رات کے بعد لڈوویکو کا بھوت اس گھر کے اندھیرے میں بھٹکتا ہے اور وہ اپنی محبت کے اضطراب کو سکون دینے کی کوشش کرتا ہے۔

قلعہ واقعی ہی بہت اداس اور بڑا تھا۔ لیکن دن کی روشنی میں بھرے ہوئے پیٹ اور مطمئن دل کے ساتھ میگوئیلکی یہ کہانی بھی اُن باتوں کی صرف ایک جھلک دکھائی دی جو اکثر وہ اپنے مہمانوں کو لطف اندوز کرنے کے لیے کرتا تھا۔ ہمارے قیلولے کے بعد ہم نے اس بدقسمتی کے احساس کے ساتھ ان بیاسی کمروں کو دیکھا جو کہ مالکان کی کامیابی کے ساتھ کئی تبدیلیوں سے گُزر چکے تھے۔

میگوئیلنے پہلی منزل کو مکمل طور پر نئے سرے سے تعمیر کیا تھا اور اس میں ماربل کے فرش، ایک چھوٹے تالاب اور ورزشی آلات کے ساتھ جدید طرز کے کمرے بنائے تھے۔ اس کے علاوہ بالکونی دلکش پھولوں سے اَٹی تھی جہاں پر ہم نے کھانا کھایا تھا۔ دوسری منزل جو کہ صدیوں تک استعمال ہوئی تھی، بے ترتیب کمروں پر مشتمل تھی جس کا سازوسامان مختلف وقتوں کا تھا جن کو اُن کی اپنی قسمت پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ لیکن سب سے اوپر والی منزل پر ہم نے ایک کمرہ دیکھا جس کو دراصل محفوظ کیا گیا تھا اور جسے وقت نے بالکل ہی بُھلا دیا تھا اور یہ لڈوویکو کا سونے کا کمرہ تھا۔

یہ لمحہ جادوئی تھا، وہاں پر بستر تھا اور اس کے پردوں پر سنہری دھاگے سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ بستر کی چادر اور اس کے کنارے اس کے قربانی دینے والے عشق کے سوکھے خون کے ساتھ سجے تھے۔ انگیٹھی میں ٹھنڈی راکھ موجود تھی اور اس کی لکڑی پتھر کی ہوچکی تھی۔ زرہ بکتر اپنے ہتھیاروں کے ساتھ سجے تھے اور ایک سنہرے فریم میں سوچ میں ڈوبے ہوئے ایک نواب کی آئل پینٹنگ لگی تھی۔ جس کو فلورینٹائن کے ماہر نے بنایا تھا اور جو اچھی قسمت نہ ہونے کی وجہ سے اپنا وقت یہیں گذار سکا تھا۔ تاہم جس چیز نے مجھے بہت متاثر کیا تھا وہ تازہ اسٹر بریز کی ناقابلِ بیان خوشبو تھی جو کہ اس سونے کے کمرے میں مکمل طور پر چھائی ہوئی تھی۔

تیوزکیلی میں موسم گرما کے دن لمبے اور سُست ہیں اور اُفق اپنی جگہ پر رات کے نو بجے تک منجمد

رہتا ہے ۔ جب ہم قلعے میں گھومنا پھرنا بند کر چکے تو پانچ بج چکے تھے لیکن میگوئیل ہمیں سین فرانسسکو کے گرجا گھر میں تجی بیریروڈیلا فرانسسکا کی تصاویر دکھانے کے لیے لے جانے پر اصرار کرتا رہا ۔ پھر ہم چوک پر بنی آرام گاہ کے نیچے کافی پینے کے لیے بیٹھ گئے ۔ اور جب ہم اپنے سوٹ کیس لینے کے لیے آئے تو ہم نے کھانے کو اپنا منتظر پایا ۔ اور ہم شام کے کھانے کے لیے رُک گئے ۔

جب ہم زرد آسمان پر صرف چمکتے ہوئے تارے کے ساتھ کھانے کے لیے بیٹھے تو لڑکوں نے کچن سے برقی روشنیاں اُٹھائیں اور اوپر والی منزل پر اندھیرے کو کھوجنا شروع کر دیا ۔ میز پر بیٹھے ہوئے ہم جنگلی گھوڑوں کے سرپٹ دوڑنے کی آوازیں سُن سکتے تھے ۔ ماتم کرتے دروازے، خوشی کی چیخیں جو کہ غم زدہ کمروں سیلاڈوویکو کو بُلا رہی تھیں ۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے وہاں سونے کا منحوس خیال پیش کیا تھا ۔ ایک خوش خرم میگوئیل اوٹیرو سیلوا نے اُن کی حوصلہ افزائی کی اور ہم نے بھی انکار کرنے کی اخلاقی جرأت نہ کی ۔

اس کے برعکس مجھے جو خوف تھا، ہم نے بھرپور نیند کے مزے لیے، میں اور میری بیوی پہلی منزل کے سونے کے کمرے میں سوئے جب کہ بچے اس سے ملحقہ کمرے میں سوئے ۔ دونوں کمرے جدید طرزِ تعمیر کے تھے اور اُن میں کچھ بھی عجیب و غریب محسوس نہ ہوا ۔ جیسے ہی میں نے نیند کے لیے انتظار کیا ۔ میں نے ڈرائنگ روم میں لگے گھڑیال کے ساتھ بارہ بے خوابی کے دورے محسوس کیے اور مجھے بطخوں کی دیکھ بھال کرتی اس عورت کی خوفزدہ شبیہ یاد آئی ۔ لیکن ہم اتنے تھک چکے تھے کہ ہم جلدی ہی نیند کی وادی میں کھو گئے ۔ ایک نا ختم ہونے والی نیند میں اور جب سات بجے کے بعد میری آنکھ کھلی تو تابندہ سورج کھڑکی کے راستے اندر جھانک رہا تھا ۔ میرے ساتھ میری بیوی معصومیت کے پُرسکون سمندر میں غوطے لگا رہی تھی ۔ ''یہ کیا بیوقوفی ہے؟'' میں نے خود کو کہا، ''کہ اس زمانے میں اور دنوں میں بھی بھوتوں پر یقین ہونا چاہیے ۔ '' لیکن اسی لمحے مجھے رس بھریوں کی تازہ خوشبو نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور میں نے چونک کر انگیٹھی کو دیکھا جس میں راکھ ٹھنڈی ہو چکی تھی اور اس کی لکڑی پتھر کی ہو چکی تھی اور سنہری فریم میں تجی غمزدہ نواب کی تصویر ہمیں تین صدیوں سے گھور رہی تھی کیونکہ ہم پہلی منزل کے سونے کے کمرے میں نہ تھے جہاں ہم پچھلی رات سوئے تھے لیکن اب ہم لڈوویکو کے بستر پر لیٹے تھے، ایک مسہری اور گرد آلود پردوں تلے اور جس کے منحوس بستر کی چادریں ابھی بھی اس کے تازہ اور گرم خون سے بھیگی ہوئی تھیں ۔

☆☆☆☆

ایلس منرو

کینیڈین ادب سے ترجمہ: حمزہ حسن شیخ

سُرخ لباس

میری ماں میرے لیے، نومبر کے پورے مہینے میں ایک لباس بناتی رہی تھی۔ مَیں سکول سے آتی تو وہ کچن میں کام کر رہی ہوتی اور اس کے اردگرد کٹے ہوئے سرخ ریشمی کپڑے کے ٹکڑے اور ٹشو پیپر کے بنے ہوئے نمونے پڑے ہوتے۔ وہ کھڑکی کی روشنی میں اپنی پرانی سینے والی مشین رکھ کر کام کرتی اور ساتھ ساتھ باہر بھی دیکھتی رہتی کہ ہرے بھرے کھیتوں اور سبزیوں کے باغات کے ساتھ والی سڑک سے کون کون گذرا ہے۔ وہاں سے کبھی کبھار ہی کوئی گذرتا تھا۔

سُرخ مخملی کپڑے کے ساتھ کام کرنا کوئی آسان نہ تھا کیونکہ یہ بار بار کھینچ جاتا اور میری ماں نے اس لباس کے لیے جو ڈیزائن منتخب کیا تھا، وہ انتہائی مشکل تھا۔ اس کے علاوہ وہ اچھا سینے پرونے والی عورت نہ تھی۔ ہاں یہ اور بات تھی کہ وہ چیزیں بنانا پسند کرتی تھی۔ جب کبھی بھی اُسے موقع ملتا وہ بخیہ گری اور استری کرنے سے جان چھڑانے کی کوشش کرتی اور اُس نے کبھی بھی اچھے سلیقے سے سینے، بٹن ٹانکنے اور لباس کے جوڑ گانٹھنے میں فخر محسوس نہیں کیا تھا جس طرح کہ میری پھوپھو اور دادی محسوس کرتی تھیں۔ اُن کے برعکس، وہ ایک جذبے کے ساتھ کام شروع کرتی۔ ایک خوبصورت اور چونکا دینے والے خیال کے ساتھ اور اُس لمحے کے بعد، اُس کا جذبہ کم ہونا شروع ہو جاتا۔ پہلی بار تو وہ کوئی ڈیزائن ہی پسند نہ کر پاتی۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں، کوئی ڈیزائن ایسا تھا ہی نہیں جو اُس کے ذہن میں گردش کرتے خیالات سے مطابقت رکھتا۔ جب میں چھوٹی تھی تو اُس نے کئی بار میرے لیے کپڑے بنائے تھے، ایک پھول دار لباس جس کے گلے پٹی پر اچھی خوبصورت وکٹورین لیس کھردرے انداز میں لگی تھی، ایک تھیلا نما ٹوپی، ایک شاندار اسکاٹش قمیص جس کے ساتھ مخمل کی جیکٹ اور ٹوپی تھی اور ان کے علاوہ ایک کشیدوالا کسانی لباس جس کے ساتھ سُرخ رنگ کا اسکرٹ اور سیاہ لیس دار قمیص تھی۔ میں نے ان کپڑوں کو بہت شائستہ انداز میں پہنا تھا اور میں دنیا کی رائے جانے بغیر ان دنوں بہت خوش تھی۔ اب چونکہ میں سمجھدار ہو گئی تھی تو میں نے ایسے لباسوں کے لیے خواہش کرنا شروع کی جس طرح میری دوست لوئی کے تھے جو اُس نے بیلے کے اسٹور سے خریدے تھے۔ میں نے بھی وہ کئی بار پہنے تھے۔ کبھی کبھار لوئی اسکول سے واپسی پر میرے ساتھ میرے گھر آتی اور وہ کرسی پر بیٹھ کر مجھے دیکھتی۔ میں اُس وقت

بہت پریشان ہو جاتی جب ماں میرے اردگرد چکر لگاتی، اُس کے گھٹنے چٹختے اور اُس کی سانسیں تیز ہو جاتیں۔ وہ خود سے بڑبڑاتی رہتی۔ گھر کے اردگرد، وہ کوئی موزے یا انگیا نہ پہنتی۔ وہ گھٹنوں تک جرابیں اور لمبی ہیل والے جوتے پہنتی اُس کی ٹانگیں سبز و نیلی رگوں کے نشانات سے اٹی ہوئی تھیں۔ میں نے اُس کے بے شرمی سے گھٹنے اُٹھا کر بیٹھنے کے انداز کے بارے میں سوچا جو کہ مجھے بہت بے ہودہ لگا۔ میں نے لوئیسے بولنا جاری رکھا تا کہ جتنا بھی ممکن ہو اس کی توجہ میری ماں کی جانب نہ جائے۔ لونیا یک شائستہ، قابلِ تعریف اور سنجیدہ انداز اپنائے بیٹھی رہی جو بڑوں کی موجودگی میں اُس کا روپ بدلنے کا مخصوص انداز تھا۔ وہ اُن پر ہنسی اور یہ ایک غصیلا تمسخراتی انداز تھا جس کا کسی کو پتہ نہ چلا۔ میری ماں نے مجھے اُٹھایا اور مجھے لطف سے بھر دیا۔ اُس نے مجھے تھوڑا سا جھلایا اور پھر سیدھا کھڑا کر دیا۔

‘‘لوئیتمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟’’

‘‘یہ بہت خوبصورت ہے۔’’ لوئیسنے اپنے مخلص اور نرم لہجے میں کہا۔ لونیکی ماں مر چکی تھی۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ رہتی تھی جس نے اُس کی کبھی پرواہ نہ کی تھی اور اس وجہ سے وہ میرے نزدیک محترم اور قابلِ رحم تھی۔

‘‘ہاں یہ ہو جائے گا، اگر میں نے اس کی ناپ ٹھیک کر لی،’ میری ماں نے کہا،’’ہاں، اچھا۔’’ میں نے ڈرامائی انداز میں اپنے پاؤں پر دردناک آہوں اور آوازوں کے ساتھ گھومتے ہوئے کہا۔

‘‘مجھے شک ہے، پتہ نہیں یہ اس کی تعریف بھی کرتی ہے یا نہیں۔’’ اُس نے لوئیسے بات کرتے ہوئے مجھے غصے سے گھورا، جیسے لوئیتو ایک عورت تھی جبکہ میں صرف ایک بچی تھی۔ ‘‘سکون سے کھڑی رہو۔’’ اُس نے میرے سر کے اوپر سے لباس کو کھینچتے ہوئے کہا۔ میرا سر مخمل میں چھپ گیا اور کاٹن کے پرانے یونیفارم میں چھپا میرا جسم نمایاں ہو گیا اور مجھے اپنا آپ بہت ہی کھر درا، ڈھیلا ڈھالا اور بلوغ کے بھیگے بدن کی طرح محسوس ہوا۔ میں نے خواہش کی کہ میں بھی لونیکی طرح ہلکی پھلکی، کمزور اور زردی ہوں جیسے وہ ایک نیلے رنگ کی بچی تھی۔

‘‘کسی نے بھی مجھے لباس بنا کر نہیں دیا تھا جب میں ہائی سکول جا رہی تھی۔’’ میری ماں نے کہا۔

‘‘میں نے خود بنایا تھا اور کسی نے بھی میری مدد نہ کی۔’’ میں ڈر گئی کہ وہ دوبارہ وہی کہانی شروع کر رہی تھی کہ وہ سات میل دُور پیدل سکول جاتی تھی اور پھر بورڈنگ ہاؤس کی میزوں پر بیٹھ کر نوکری کی تلاش کرتی تھی تا کہ وہ ہائی سکول جا سکے۔ میری ماں کی زندگی کی ساری کہانیاں جو کبھی مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوتی تھیں، اب مجھے صرف ڈرامائی، غیر ضروری اور تھکا دینے والی محسوس ہونے لگی تھیں۔

‘‘ایک دفعہ، مجھے ایسا لباس ملا تھا، اُس نے کہا۔’’ یہ کریم کلر کا اُونی کپڑا تھا۔ جس کے سامنے والے حصے پر نیلی لائنیں نیچے کی جانب جا رہی تھیں اور اس کے خوبصورت موتی نما بٹن تھے، میں حیران ہوں کہ یہ کیسے بنایا گیا تھا؟’’

جب ہم فارغ ہوئے تو میں اور لونیا اوپر اپنے کمرے میں آ گئیں۔ وہاں ٹھنڈ تھی لیکن ہم وہیں رُک

گئے۔ ہم نے اپنے کلاس کے لڑکوں کے بارے میں باتیں کیں، باری باری ساری قطاروں کا جائزہ لیا اور ایک دوسرے سے پوچھتی رہیں، "کیا تم اُسے پسند کرتی ہو؟ اچھا کیا تم اُسے آدھا پسند کرتی ہو؟ کیا تم اس سے نفرت کرتی ہو؟ کیا تم اس کے ساتھ باہر جاؤ گی اگر اُس نے تمھیں کہا تو؟ لیکن کسی نے ہم سے نہیں پوچھا تھا۔ ہم تیرہ سال کی تھیں اور ہم دو ماہ سے ہائی سکول جا رہی تھیں۔ ہم نے مختلف رسائل کے سوالنامے بنائے تھے، یہ جاننے کے لیے کہ کیا ہم بھی شخصیت بنیں گی یا ہم بھی مشہور ہوں گی۔ ہم اپنے چہروں کو سجانے، اپنی اچھی عادات کو نمایاں کرنے، اپنی پہلی ملاقات پر گفتگو شروع کرنے اور جب لڑکا دُور جانا شروع ہو تو اُس کو منانے کے بارے میں کئی مضامین پڑھتیں۔ ہم نے اور بھی بہت سے مضامین پڑھے مثلاً حیض کے بارے میں، بچہ گرانے یا یہ کہ خاوند اپنے گھر سے باہر اطمینان کیوں تلاش کرتے ہیں؟ جب ہم نے اسکول کا کام نہیں کرنا ہوتا تھا تو ہمارا زیادہ تر وقت غلہ صاف اور ذخیرہ کرنے میں گذرتا اور ساتھ ساتھ ہم جنسیات کی باتیں بھی کرتی رہتیں۔ ہم نے آپس میں وعدہ لیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو ہر بات بتائیں گی۔ لیکن ایک بات جو میں نے نہیں بتائی تھی وہ اس ڈانس کے بارے میں تھی۔ ہائی سکول کا کرسمس ڈانس جس کے لیے میری ماں میرے لیے لباس بنا رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں جانا نہیں چاہتی تھی۔

ہائی سکول میں مَیں ایک منٹ کے لیے بھی آرام دہ نہ تھی۔ مجھے لونیکے بارے میں کوئی خبر نہ تھی۔ امتحانات سے پہلے مجھے اُس کے یخ ہاتھوں اور تیز دھڑکن کا معلوم ہوا تھا لیکن مجھے ہر وقت مایوسی گھیرے رکھتی۔ جب مجھ سے کلاس میں کوئی سوال پوچھتا، بالکل ایک چھوٹا اور معمولی سا سوال، تو جواباً میری لرزتی پتلی سی چیخ نما آواز نکلتی۔ جب مجھے بلیک بورڈ کی جانب جانا ہوتا تو مجھے یقین ہوتا۔ اگرچہ ان مہینوں میں بھی جب کہ اس کا امکان بھی نہ ہوتا کہ قمیص پر خون لگا ہوا ہے۔ میرے ہاتھ پسینے کی وجہ سے پھسلتے جب میں بلیک بورڈ پر پرکار سے زاویہ لگانے کی کوشش کرتی۔ میں والی بال میں بال نہ اُچھال سکتی۔ دوسروں کے سامنے کوئی کام کرنے کا کہا جاتا تو میری ساری ہمت جواب دے جاتی۔ مجھے بزنس پریکٹس سے نفرت تھی کیونکہ آپ کو ایک کھاتہ کتاب کے کئی صفحات ایک ہی قلم سے بھرنے پڑتے تھے اور جب بھی کوئی استاد میرے کندھے کے اوپر سے مجھ پر جھانکتا تو میری ساری سیدھی لائنیں خراب ہو جاتیں اور آپس میں گڈمڈ ہو جاتیں۔ مجھے سائنس سے بھی نفرت تھی کیونکہ ہم نازک اور ان جانے آلات کی میزوں کے پیچھے اور تیز روشنیوں کے نیچے اسٹولوں پر بیٹھے بیٹھے جھلس جاتے اور ہمیں اسکول کا پرنسپل یہ مضمون پڑھاتا جس کی آواز بہت ہی سرد مُہر اور خود پسند قسم کی تھی۔ وہ روزانہ ہی صحیفے پڑھتا اور ذلت پر سزا دینے میں ماہر تھا۔ مجھے انگریزی سے نفرت تھی کیونکہ لڑکے اس کلاس میں پیچھے بیٹھ کر موسیقی بجاتے جبکہ ایک خوبصورت شریف اور مغروری ہلکی سی بھینگی اُستانی سب کے سامنے ورڈز ورتھ پڑھتی۔ اُس نے اُن کو دھمکی دی، اُن کی منت سماجت کی، اُس کا چہرہ سُرخ تھا اور اُس کی آواز بھی اتنی ہی کمزور اور نا قابلِ اعتبار تھی جتنی میری۔ وہ اس کی التجاؤں کا تمسخر اُڑاتے اور جب وہ دوبارہ پڑھنا شروع

کرتی، تو وہ اس کی عجیب و غریب نقلیں اُتارتے، قسم قسم کے منہ بناتے، اپنی آنکھوں کو بھینگا کر لیتے اور اپنے دلوں پر ہاتھ پھیراتے رہتے۔ کبھی کبھار وہ رونے لگتی۔ کوئی بھی اُس کی مدد نہ کرتا اور وہ بھاگتے ہوئے کلاس سے چلی جاتی۔ پھر لڑکے اونچی اونچی آواز میں رونے کی آوازیں نکالتے اور بلند قہقہے لگاتے۔ کبھی کبھار میرا قہقہ بھی اُس کا تعاقب کرتا۔ ایسے وقت میں کمرے میں بربریت پر رنگ رلیاں مناتا ماحول ہوتا جو مجھ جیسے کمزور اور ڈرے ہوئے لوگوں کو زیادہ ڈرا دیتا۔

لیکن اسکول میں درحقیقت کیا کچھ ہو رہا تھا وہ صرف بزنس پریکٹس، سائنس اور انگریزی نہ تھی۔ وہاں پر اور بھی کچھ نہ کچھ تھا جس کی چمک دمک یا اہمیت تھی۔ وہ پرانی عمارت جس کے چٹانی دیواروں کے لیس دار تہ خانے تھے، سیاہ چغا بدلنے کے کمرے، گذرے ہوئے شاہوں اور کھوئے ہوئے فوجیوں کی تصاویر، جنیاتی مقابلوں کی پُرلطف اور پریشان کُن فضا اور اس کے علاوہ بڑی کامیابیوں کے کُھلی آنکھوں سے دیکھے خواب اور میرے لیے وہاں اپنی شکست قبل از اطلاع موجود تھی۔ کسی چیز کا ہونا تھا جس نے مجھے اس ڈانس سے باز رکھا۔

دسمبر میں برف باری شروع ہو گئی اور مجھے ایک خیال سوجھا۔ اس سے پہلے میں اپنے بائیسکل سے گرنے کا تصور کر چکی تھی۔ اپنا ٹخنہ ٹوٹنے کا اور میں نے اس پر قابو پانے کی کوشش کی تھی جیسے میں سخت سردی میں دوبارہ سوار ہو کر گھر کی جانب چلی تھی۔ ملک کی سڑکوں پر اپنے سائیکل کے گہرے نشان چھوڑتے ہوئے۔ لیکن یہ بہت مشکل تھا۔ تاہم مجھے گلے اور حلق کی نالیاں خطرناک حد تک کمزور محسوس ہوئیں۔ میں نے راتوں کو بستر سے اُٹھنا شروع کر دیا۔ اور اپنی کھڑکی کو تھوڑا کھول کر میں تھوڑا سا نیچے جھکتی اور ہوا کو اندر آنے دیتی جس کے ساتھ کبھی کبھار برف بھی چمٹی ہوتی جو کہ میرے ننگے گلے پر حملہ آور ہوتی۔ میں اپنے پاجامے کا اوپری حصہ ہٹا دیتی اور خود کو یہ الفاظ کہتی۔ ”سردی سے نیلا‘ اور میں جیسے ہی وہاں پر جھکتی، میری آنکھیں بند ہو جاتیں، مجھے اپنا سینہ اور گلا نیلا اور ٹھنڈا ہوتا محسوس ہوتا جس کے نیچے گھوری نیلی رگوں کا جال جلد میں چھپا ہوتا۔ میں اتنی دیر وہاں پر ٹھہری رہتی جب تک مجھ میں سکت ہوتی۔ اور پھر میں کھڑکی کی دہلیز سے مٹھی بھر برف اُٹھاتی اور اس کو اپنے سینے پر ڈال دیتی، اپنے پاجامے کے بٹن بند کرنے سے پہلے۔ یہ فلالین کے کپڑے کی گرمی سے پگھل جاتی اور میں ساری رات بھیگے کپڑوں میں ہی سوئی رہتی جو کہ سب سے خطرناک اور بدترین بات تھی۔ صبح کو جیسے ہی میں جاگتی، میں اپنا گلہ صاف کرتی کہ کہیں یہ سوجھا ہوا تو نہیں، یہ دیکھنے کے لیے کھانستی، یہ امید کرتے ہوئے اپنی پیشانی پر ہاتھ لگاتی کہ مجھے بخار تو نہیں۔ یہ بالکل ٹھیک نہ تھا۔ ہر صبح ڈانس کے دن بشمول، میں شکست خوردہ اُٹھتی اگرچہ اچھی صحت کے ساتھ۔ ڈانس والے دن میں اپنے بال بالکل سیدھے گھنگریالے کرتی لیکن آج زنانہ رسومات کی تمام ممکنہ حفاظت چاہتی تھی۔ میں کچن میں پڑے صوفے پر لیٹ گئی اور کتاب ”پومپائی کے آخری ایام‘ پڑھنے لگی اور یہ خواہش کی کہ کاش میں وہاں ہوتی۔ میری ماں کبھی بھی مطمئن نہ ہوتی، وہ ہر وقت لباس کے سفید کالر کی لیس سیتی رہتی، اُس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس کا پہناوا بڑی عمر کا لگنا چاہیے۔ میں

نے گھنٹوں اُس کو دیکھا۔ یہ سال کے مختصرترین دن تھے۔ اِس صوفے کے اوپر، ایک چارٹ لگا ہوا تھا جس میں او ایس اور ایکس ایس کی پرانی گیمز کے بارے میں لکھا تھا۔ بڑی تصاویر لگی تھیں اور میرے اور میرے بھائی کے خطوط جب ہم دونوں آنتوں کی بیماری میں مبتلا تھے۔ میں نے اُن کو دیکھا اور پھر گذرے ہوئے بچپن میں حفاظت کے ساتھ رہنے کی خواہش کی۔

جب میں نے اپنے بال گھنگریالے کر لیے اور دونوں قدرتی اور مصنوعی طریقے اپنا لیے اور اُن کو چمکدار جھاڑی کی بہت سی شاخوں کی طرح پھیلا دیا تھا۔ میں نے ان کو گیلا کیا، کنگھی کی اور ان کو برش سے بار بار ٹھیک کیا اور ان کو نیچے کی جانب اپنے رخساروں کے ساتھ لٹکا دیا۔ میں نے چہرے پر پوڈر لگایا جو کہ میرے گرم چہرے پر چاک کی طرح چپک گیا۔ میری ماں نے اپنا لوشن "ایشز آف روزز" نکالا جو اُس نے کبھی نہیں لگایا تھا اور اُس کو میرے بازوؤں پر لگا دیا۔ پھر اُس نے میرے لباس کی زپ بند کی اور مجھے آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ لباس بالکل شہزادیوں جیسا تھا اور درمیان سے یہ بہت فٹ تھا۔ میں نے دیکھا کہ کیسے میری چھاتیاں نئی انگیا میں بھری ہوئی مگر حیران کن حد تک باہر کو اُبل رہی تھیں، سن بلوغت کی پختگی کے ساتھ۔

”میرا دل چاہ رہا ہے کہ کاش میں تصویر لے سکتی۔“ میری ماں نے کہا ”مجھے اس کی سلائی پر فخر محسوس ہو رہا ہے اور تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔“

”شکریہ۔“ میں نے کہا۔

جب میں نے دروازہ کھولا تو لوئیجے سب سے پہلے کہا، ”ہائے اللہ، تم نے اپنے بالوں کو کیا کر دیا ہے؟“

”یہ میں نے بنائے ہیں۔“

”تم بالکل بھوت لگ رہی ہو لیکن فکر نہ کرو۔ مجھے کنگھی دو اور میں سامنے سے اِن کو ٹھیک کر دیتی ہوں۔ پھر یہ بالکل ٹھیک نظر آئیں گے۔ ان میں تو تم بالکل بوڑھی نظر آ رہی ہو۔“

میں آئینے کے سامنے بیٹھ گئی اور لوئیجے میرے پیچھے کھڑی ہو کے میرے بال ٹھیک کرنے لگی۔ میری ماں نے ہمیں اکیلا نہ چھوڑا۔ میری خواہش تھی کہ وہ چلی جائے۔ اُس نے گھنگریالے بالوں کو دیکھا اور کہا، ”لوئیجی! تم نے تو مجھے حیران کر دیا۔ تمہیں تو ہیرڈریسر بننا چاہیے۔“

”اچھی سوچ ہے!“ لوئیجے جواب دیا۔ اُس نے زرد نیلے رنگ کا کریپ کا لباس پہنا ہوا تھا جس پر مختلف ڈیزائن بنے تھے۔ یہ لباس مجھ والے سے کہیں زیادہ اچھا تھا اگرچہ اس کے کالر نہیں تھے۔ اس کے بال اس طرح باہر نکلے ہوئے تھے جیسے گڑیا کے ہوں۔ میں نے چوری چھپے ہمیشہ یہ سوچا تھا کہ لوئیجو بصورت نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے دانت ٹیڑھے تھے لیکن میں نے اب دیکھا کہ چاہے اُس کے دانت ٹیڑھے تھے یا نہیں، اُس کے اسٹائلش لباس اور نرم بالوں نے اُس کو ایک طلسماتی گڑیا میں تبدیل کر دیا تھا جو کہ سرخ ریشم سے بھری ہوئی تھی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں تھیں، بکھرے ہوئے بال جس پر جوش مسرت چھائی ہوئی تھی۔

میری ماں دروازے تک ہمارے ساتھ آئی اور اندھیرے میں پکارا، ’’خدا حافظ‘‘۔ یہ میرا اور لوئی کا روایتی سلام تھا۔ یہ بالکل ہی بیوقوفانہ سا محسوس ہوتا اور اُس کی جانب سے یہ بے کس سا انداز مجھے عجیب محسوس ہوتا اور مجھے اُس پر شدید غصہ آتا کہ جب میں جواب ہی نہیں دیتی وہ یہ الفاظ کیوں استعمال کرتی ہے۔ لیکن صرف لوئی تھی جو خوش دلی سے جواب دیتی اور بہت ہی ہمت سے کہتی، ’’شب بخیر۔‘‘

ورزش گاہ میں چیڑ اور صنوبر کی بُو پھیلی تھی۔ باسکٹ بال کے پولوں کے ساتھ کاغذ کی خوبصورت سُرخ اور سبز بالیں لٹک رہی تھیں۔ بڑی کلاسوں کے زیادہ تر طلباء جوڑوں میں نظر آتے تھے۔ بارھویں اور تیرھویں کلاس کی کچھ طالبات اپنے ساتھ اپنے بوائے فرینڈز لائی تھیں جو پہلے ہی یہاں سے گریجویشن کر چکے تھے یا شہر کے اطراف میں کاروبار کرتے تھے۔ یہ نوجوان ورزش گاہ میں سگریٹ پیتے اور کوئی بھی اُن کو نہیں روک سکتا تھا، وہ آزاد تھے۔ لڑکیاں اپنے ہاتھ آہستگی سے مردانہ آستینوں پر جمائے اُن کے ساتھ کھڑی تھیں اور اُن کے چہرے تھکے، الگ الگ سے اور خوبصورت تھے۔ مجھے خواہش ہوئی کہ میں بھی اُن کی طرح نظر آؤں۔ اُن کا رویہ ایسا تھا جیسے صرف وہی بڑے ہوں جن کو صرف ڈانس کرنا آتا ہے اور جیسے ہم باقی سب جن کے درمیان وہ گذر اور گھوم رہے تھے، وہ اُن کو نہ نظر آ رہے تھے اور نہ ہی اُن کے لیے اہم تھے۔ جب پہلے ڈانس کا اعلان کیا گیا وہ سُستی سے باہر کی جانب گئے، ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے جیسے اُن کو بچپن کے کسی بھولے ہوئے کھیل میں حصہ لینے کا کہا گیا ہو۔ ہاتھ پکڑے اور آہستگی سے کانپتے ہوئے وہ آپس میں اکٹھے ہو رہے تھے، میں، لوئی اور نویں کلاس کی دوسری طالبات اُن کے پیچھے چل رہی تھیں۔

میں نے بیرونی دائرے کو دیکھنے کی جرأت نہ کی۔ جب وہ میرے پاس سے گذرا، اس خوف سے کہ کہیں میں کوئی جلدی میں بدتہذیبی نہ دیکھ لوں۔ جب موسیقی رُکی تو میں اپنی جگہ پر رُکی رہی جہاں میں ٹھہری تھی اور اپنی آدھی آنکھیں اُٹھاتے ہوئے میں نے ایک لڑکے کو دیکھا جس کا نام میس ولیمز تھا اور وہ آہستگی سے میری جانب آ رہا تھا۔ اس نے آہستگی سے میری کمر اور انگلیوں کو چھوا اور میرے ساتھ ڈانس کرنے لگا۔ میری ٹانگیں کھُل گئیں اور میرا بازو کندھوں سے تھرکنے لگا اور میں نے ابھی ایک لفظ بھی نہ بولا تھا۔ میس ولیمز کا شمار سکول کے چند ایک ہیروز میں ہوتا تھا۔ وہ باسکٹ بال اور ہاکی کھیلتا تھا۔ اور وہ ایک شاہانہ غرور اور وحشیانہ انداز میں مختلف جگہوں پر گھومتا نظر آتا۔ مجھ جیسی غیر اہم لڑکی کے ساتھ ڈانس کرنا اُس کے لیے اتنا ہی غیر اہم تھا جتنا اُس کے لیے شیکسپیئر یاد کرنا۔ اُس نے بھی اس بات کو شدت سے محسوس کیا جتنا کہ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے دوستوں کو ناگواری کے تاثرات دے رہا تھا۔ اس نے فرش کے کنارے کو ٹھوکر لگاتے ہوئے مجھے زور سے گھمایا۔ اُس نے میری کمر سے اپنا ہاتھ ہٹایا اور میرا بازو جھٹک دیا۔

’’پھر ملتے ہیں۔‘‘ اُس نے کہا اور چلا گیا۔

مجھے ایک دو منٹ بات سمجھنے میں لگے کہ کیا ہُوا ہے اور وہ اب دوبارہ واپس نہیں آئے گا۔ میں دیوار کے

ساتھ اکیلی کھڑی ہوگئی۔ فزیکل ایجوکیشن کی ایک اُستانی دسویں کے طالب علم کی بانہوں میں خوش دلی سے ڈانس کرتی ہوئی جب میرے قریب سے گذری تو اُس نے مجھے متجسس نگاہوں سے دیکھا۔ پورے سکول میں وہ واحد اُستانی تھی جو کہ معاشرے میں ہونے والی ساری حرکات اور الفاظ کو خوب سمجھتی تھی اور مجھے یہ خوف تھا کہ اگر اُس نے سب کچھ دیکھ لیا ہے یا اُس کو پتہ چل گیا تو وہ ضرور ماسن کو لوگوں کے سامنے مجبور کردے گی کہ وہ میرے ساتھ ڈانس نہ کرے۔ مجھے ماسپر کوئی غصہ یا حیرت نہ تھی۔ میں سکول میں اُس کی حالت سمجھ گئی تھی اور اپنی بھی اور میں نے دیکھا کہ جو کچھ بھی اُس نے کیا تھا، وہ حقیقت پر مبنی تھا۔ وہ واقعتاً ایک ہیرو تھا، وہ سکول کونسل قسم کا کوئی ہیرو نہ تھا کہ جس کی کامیابی صرف سکول کی دیوار تک محدود ہو۔ اُن میں سے کئی لڑکوں نے میرے ساتھ بڑی جراُت اور سلیقے کے ساتھ ڈانس کیا تھا اور مجھے کسی خوشگوار لمحے کے بغیر چھوڑ گئے تھے۔ تاہم ابھی بھی مجھے امید تھی کہ مجھے کافی لوگوں نے دیکھا تھا۔ مجھے لوگوں کے دیکھنے سے نفرت تھی۔ میں نے اپنے انگوٹھے کی جلد کو کاٹنا شروع کردیا۔ جب موسیقی رُکی تو میں ورزش گاہ کے ایک کونے میں جمع لڑکیوں کے گروپ میں شامل ہوگئی۔ میں نے یہ تاثر دیا کہ جیسے کچھ ہُوا ہی نہیں اور خود سے کہا کہ سب کچھ ابھی شروع ہونے والا ہے۔

موسیقی دوبارہ شروع ہوگئی تھی۔ کمرے میں ہماری جانب کے گھنے ہجوم میں حرکت پیدا ہوئی اور جلد ہی یہ ہجوم کم ہونے لگا۔ لڑکے آئے اور لڑکیاں ان کے ساتھ ڈانس کے لیے چلی گئیں۔ لُوئی بھی چلی گئی اور میرے ساتھ ٹھہری لڑکی بھی چلی گئی۔ کسی نے مجھ سے نہیں پوچھا۔ میں نے رسالے کے اس مضمون کو یاد کیا جو میں نے اور لُوئی نے پڑھا تھا جس میں لکھا تھا۔ خوش رہو اور لڑکوں کو اپنی چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھنے دو! ان کو اپنی آواز میں خوشی کے قہقہے محسوس کرنے دو! بالکل سادہ اور واضح، لیکن کتنی ہی لڑکیاں بھول گئیں؟ یہ سچ تھا، میں بھی بھول گئی تھی۔ میرے آبرو پریشانی کی وجہ سے تن گئے تھے، میں خوفزدہ اور بدصورت دکھائی دینے لگی تھی۔ میں نے ایک سانس لیا اور اپنا چہرہ ڈھیلا چھوڑنے کی کوشش کی، میں مسکرائی لیکن مجھے کسی پر بھی مسکراتے ہوئے بہت عجیب سا محسوس ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ ڈانس کرتی ہوئی لڑکیاں، مشہور و معروف لڑکیاں، ان میں سے کوئی بھی نہیں مسکرا رہی تھی، ان میں سے زیادہ تر کے چہرے نیند سے بھرے اور آزردہ تھے اور وہ بالکل نہیں مسکرا رہی تھیں۔ لڑکیاں ابھی تک ڈانس کرنے کے لیے جا رہی تھیں، کچھ نے مایوس ہوکر آپس میں جوڑے بنا کر ڈانس شروع کردیا تھا لیکن زیادہ تر لڑکوں کے ساتھ گئی تھیں۔ موٹی لڑکیاں، کیل مہاسوں والی لڑکیاں، ایک غریب لڑکی جس کے پاس پہننے کے لیے اچھا لباس نہ تھا اور نہ کوئی خوبصورت اسکرٹ یا سویٹر، وہ بھی ڈانس کے لیے چلی گئی تھی، ان کو بلایا گیا تھا اور وہ ڈانس میں مشغول تھیں۔ وہ ان کو کیوں لے گئے تھے اور مجھے کیوں نہیں؟ کیوں باقی سب اور میں کیوں نہیں؟ میں نے سرخ مخمل کا لباس پہنا تھا۔ میں نے اپنے بال گھنگریالے بنائے تھے اور میں نے خوشبو بھی لگائی تھی اور لوشن بھی۔ دعا کروں، میں نے سوچا میں اپنی آنکھیں بند نہ کر سکی لیکن میں اپنے دماغ میں بار بار منصوبے بناتی رہی۔ پلیز میں، ''پلیز میں، پلیز میں' اور میں نے اپنی انگلیاں اپنی پیٹھ

کے پیچھے جمادی تھیں۔ ایک ایسا انداز میں جو صلیب کے نشان سے زیادہ طاقتور تھا، وہی خفیہ نشان جو میں اور لُونی ریاضی کی کلاس میں بلیک بورڈ کی جانب نہ جانے کے لیے استعمال کرتی تھیں۔

اس نے بھی کام نہ کیا جس کا مجھے خوف تھا، وہ سچ ثابت ہوا میں اکیلی ہی پیچھے رہنے والی تھی۔ اس معاملے میں میرے ساتھ کچھ عجیب وغریب معما تھا، بالکل ایسا ہی جیسے کہ غلط سانس کو ٹھیک نہیں کیا جا سکتا یا کیل مہاسوں والے چہرے کو خوبصورتی نہیں لوٹائی جا سکتی۔ ہر شخص یہ جانتا تھا اور میں بھی جانتی تھی اور میں کافی عرصے سے یہ جانتی تھیں۔ لیکن مجھے یقینی طور پہ کچھ بھی معلوم نہ تھا میں نے غلط ہونے کی امید کی تھی۔ یقین میرے اندر بیماری کی طرح ابھر رہا تھا۔ میں ایک یا دو لڑکیوں میں سے جلدی سے گزری جو کہ جگہ چھوڑ کر لڑکیوں کے واش روم کی جانب چلی گئیں تھیں۔ میں نے خود کو اپنی خوابگاہ میں چھپا لیا تھا۔

یہ وہ جگہ تھی جہاں میں ٹھہری تھی۔ ناچنے والی لڑکیاں جلدی میں وہاں سے آتی جاتی رہیں۔ وہاں پہ بہت سے کمرے تھے، کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ میں وہاں پہ عارضی رہنے والی تھی۔ ڈانس کے دوران میں موسیقی سنتی رہی جو کہ مجھے پسند تھی لیکن اب میں نے مزید اس میں کوئی حصہ نہیں لینا تھا۔ اور اب مجھے کوئی اور کوشش بھی نہیں کرنی تھی۔ میں صرف یہاں چھپا رہنا چاہتی تھی اور یہ چاہتی تھی کہ یہاں سے خاموشی کے ساتھ اپنے گھر چلی جاؤں اور کوئی بھی مجھے نہ دیکھے۔

ایک بار پھر جب موسیقی شروع ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے پیچھے کھڑا ہے۔ وہ زور زور سے پانی کے چھینٹے مار رہی تھی، اپنے ہاتھ دھو رہی تھی اور بالوں کو کنگی کر رہی تھی اسے یہ بات مضحکہ خیز لگ رہی تھی کہ میں اتنی دیر سے یہاں بیٹھی ہوں۔ مجھے باہر جانا چاہیے تھا، ہاتھ دھونے چاہئیں تھے اور شاید جبکہ میں وہ دھو رہی تھی، وہاں سے چلی جاتی۔

اس کا نام میری فارچیون تھا، میں اسے نام سے جانتی تھی کیونکہ وہ گرلز اتھلیٹکس سوسائٹی کی ایک آفیسر تھی۔ وہ آج کل اعزازی طور پہ کام کر رہی تھی اور ہر وقت مختلف کاموں کو مکمل کرنے میں لگی رہتی تھی۔ اس کو اس ڈانس کے منعقد کرنے میں بھی کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ وہ تمام کلاسوں میں باری باری گئی تھی کہ سجاوٹ کے لیے مددگار تلاش کیے جا سکیں۔ وہ شاید گیارہویں یا بارہویں جماعت کی طالبہ تھی۔

”یہاں بہت اچھا اور ٹھنڈا ماحول ہے“ اس نے کہا۔ ”میں یہاں آرام کرنے آئی ہوں، وہاں بہت گرمی لگ رہی تھی“۔

وہ ابھی تک اپنے بالوں کو کنگھی کر رہی تھی جب تک میں اپنے ہاتھ دھو چکی۔

تمہیں موسیقی پسند آئی، اس نے پوچھا۔

”ہاں اچھی ہے“ مجھے خود پتہ نہیں تھا کہ کیا کہنا ہے۔ مجھے اس پر حیرت ہو رہی تھی کہ اتنی سینئر لڑکی مجھ سے باتیں کرنے کے لیے اتنا وقت ضائع کر رہی تھی۔

میں نہیں، میں نہیں ٹھہر سکتی۔ جب مجھے موسیقی پسند نہ ہو تو مجھے ڈانس سے بھی نفرت ہو جاتی ہے۔ سنو وہ اتنا تلاطم خیز اور شور والا ہے۔ اور میں اس پر کسی صورت بھی ڈانس نہیں کر سکتی۔

میں نے اپنے بالوں میں کنگھی کی۔ وہ مجھے دیکھتے ہوئے بیسن کی جانب جھک گئی۔

''میں ڈانس نہیں کرنا چاہتی اور نہ ہی میں یہاں پر اب زیادہ دیر رکنا چاہتی ہوں۔ آؤ چلیں اور سگریٹ پئیں۔

کہاں؟

آؤ میں تمہیں بتاتی ہوں!

واش روم کے آخر میں ایک دروازہ تھا جو کھلا تھا اور ایک اندھیری الماری کی جانب جاتا تھا جس میں جھاڑن اور بالٹیاں رکھی تھیں۔ اس نے مجھے دروازہ کھلا رکھنے کو کہا تا کہ واش روم کی روشنی آتی رہے جب تک کہ وہ دروازے کی مٹھ تلاش نہ کرے۔ یہ دروازہ اندھیرے میں کھلتا تھا۔

''میں بتی نہیں جلا سکتی، کہیں کوئی دیکھ نہ لے'' اس نے کہا، یہ دربار کا کمرہ ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ کھیل کود میں حصہ لینے والے لوگوں کو ہمیشہ اس اسکول کی عمارت کے بارے میں ہم سب سے زیادہ معلوم تھا ان کو معلوم تھا کہ چیزیں کہاں رکھی جاتی تھیں اور وہ ہمیشہ غیر قانونی دروازوں سے بہادری کے ساتھ آتے جاتے تھے۔ ''دیکھو تم کہاں جا رہے ہو؟

اس نے کہا۔ ''بالکل آخری حصے میں، وہاں پر کچھ سیڑھیاں ہیں۔ وہ دوسری منزل تک ایک الماری تک جائیں گی، اوپر والا دروازہ بند تھا لیکن کمرے اور سیڑھیوں کے درمیان ایک تقسیم تھی، اگر ہم ان سیڑھیوں پر بیٹھیں، ویسے ہی اتفاقاً کوئی یہاں آ جائے تو وہ ہمیں دیکھ نہ پائے گا۔''

کیا ان کو سگریٹ کی بو نہیں آئے گی؟ میں نے کہا۔

''او، اچھا۔۔۔ خطرے میں جینا سیکھو''

سیڑھیوں کے اوپر ایک اونچی کھڑکی تھی جس سے ہمیں تھوڑی سی روشنی آ رہی تھی۔ میری فارچیون کے پاس پرس میں سگریٹ اور ماچس تھی۔ میں نے اس سے پہلے سگریٹ نوشی نہیں کی تھی سوائے ان سگریٹ کہ جو میں نے اور لُوئی نے مختلف اوراق اور لوئی کے باپ کے چرائے ہوئے تمباکو سے خود بنائے تھے، وہ بہت ہی مختلف ہوتے اور اس سے کئی درجہ بہتر ہوتے۔

''آج رات کو یہاں آنے کی صرف ایک وجہ تھی'' میری فارچیون نے کہا کہ میں یہاں کی سجاوٹ کی ذمہ دار ہوں اور میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ یہ سب کیسا دکھائی دیتا ہے جب لوگ ایک بار یہاں پر آتے ہیں ورنہ مجھے کیا پرواہ۔ مجھے لڑکوں سے کوئی دلچسپی نہیں''۔

اونچی کالی کھڑکی سے آتی ہوئی روشنی میں، میں اس کا تنگ، حقارت آمیز چہرہ دیکھ سکتی تھی، اس کی سیاہ

جلد جو مہاسوں سے بھری ہوئی تھی، باہر کی جانب اس کے نکلے ہوئے دانت جو اس کی شخصیت کو بڑا اور رعب دار بنا رہے تھے۔

"زیادہ تر لڑکیاں، تم نے محسوس نہیں کیا؟ کہ تم لڑکوں پر مرنے والی لڑکیاں، سب سے زیادہ اس اسکول میں تلاش کر سکتی ہوں"۔

میں اس کی توجہ، اس کے ساتھ اور سگریٹ کی بھی ممنون تھی۔ میں نے کہا اور شاید سوچا بھی یہی۔

"اس دوپہر کی طرح۔ اس دوپہر میں ان سے گھنٹیاں اور دوسری چیزیں لٹکانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ صرف سیڑھیوں پر چڑھ گئی اور وہاں سے لڑکوں کو گھورنے لگی۔ ان کو پرواہ بھی نہ تھی کہ سجاوٹ مکمل ہوتی ہے یا نہیں۔ یہ صرف ایک بہانہ تھا، ان کی زندگی میں صرف ایک ہی مقصد ہے کہ وہ لڑکوں کے پیچھے بھاگیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے ساری بیوقوف ہیں"۔

ہم نے اساتذہ کے بارے میں باتیں کیں اور اسکول کے بارے میں بھی۔ اس نے کہا کہ وہ فزیکل ایجوکیشن کی استانی بننا چاہتی ہے اور اس کے لیے اسے کالج جانا پڑے گا لیکن اس کے والدین کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ اس نے اپنے لیے خود کام کرنے کا فیصلہ کیا اور وہ ہر صورت آزاد ہونا چاہتی تھی۔ وہ کینٹے میں کام کرے گی اور گرمیوں میں کھیتوں میں کام کرے گی جس طرح تمبا کو چننے کا کام۔ اس کو سن کر مجھے اپنے اندر دکھ کا احساس ہوا۔ یہاں پر کوئی اور بھی تھا جس کو مجھ جیسی شکست ملی تھی۔ میں نے اسے دیکھا لیکن وہ خودداری اور جذبے سے بھرپور تھی۔ اس نے دوسرے کام کرنے کا سوچ لیا تھا کہ وہ تمبا کو چننے کو چنے گی۔

ہم وہاں پر موسیقی کے وقفے کے دوران کھڑے باتیں کرتے اور سگریٹ پیتے رہے۔ جب باہر وہ کافی اور کیک وغیرہ کھا رہے تھے۔

جب موسیقی دوبارہ شروع ہوئی، میری فارچیون نے کہا "دیکھو! کیا ہمیں مزید بھی یہاں پر رکنا ہے؟ آؤ اپنے کوٹ لیں اور چلیں۔ کیوں نہیں، ہم نیچے لیٹی کی جانب چلے گئے، گرم گرم چاکلیٹ کھائی اور آرام سے باتیں کرتے رہے۔

سگریٹ کے ٹکڑے اور راکھ اپنے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے ہم نے دربار کے کمرے کے درمیان سے اپنا راستہ تلاش کیا، الماری کے قریب ہم رکے اور یہ یقین کرنے کے لیے توجہ کی کہ واش روم میں کوئی نہیں تھا۔ ہم دوبارہ روشنی میں آئے اور راکھ کو واش روم کے ٹائلٹ میں پھینک دیا۔ ہمیں باہر جانا تھا اور سامان گاہ کی جانب ڈانس والے کمرے سے ہو کر گزرنا تھا جو کہ بیرونی دروازے کے بالکل ساتھ تھا۔

ڈانس شروع ہونے والا تھا، "کمرے کے کنارے کی جانب جاؤ" میری فارچیون نے کہا "کسی کو ہمارا پتہ نہیں چلے گا" میں نے اس کا پیچھا کیا اور کسی بھی شخص پر نظر نہ ڈالی۔ میں نے لوئی کو تلاش نہ کیا۔ آج کے بعد لوئی میری اتنی دوست نہ رہی تھی جتنی کہ پہلے تھی وہ ویسی ہی تھی جیسی میری فارچیون لڑکوں کا دیوانہ کہتی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ میں زیادہ ڈری ہوئی نہ تھی اور اب میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں نے اپنے پیچھے ہونے والے ڈانس کو چھوڑ دینا ہے۔ میں کسی کا بھی انتظار نہیں کر رہی تھی کہ وہ میرا انتخاب کرے۔ میرے اپنے منصوبے تھے، مجھے اب کسی پر مسکرانے یا قسمت آزمانے کے لیے اشارے کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ یہ میرے لئے اہم نہ تھا، میں اپنے دوستوں کے ساتھ چاکلیٹ کھانے جا رہی تھی، ایک لڑکے نے مجھے کچھ کہا تھا، وہ میرے راستے میں تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ مجھے کہے گا کہ میری کوئی چیز راستے میں گر گئی ہے یا میں اس راستے پر نہیں چل سکتی یا یہ کہ یہ کمر بند ہے۔ مجھے سمجھ نہ آئی کہ وہ میرے ساتھ ڈانس کرنے کے لیے کہہ رہا ہے جب تک کہ اس نے دوبارہ مجھ سے نہ کہا۔ یہ ہمارا کلاس فیلو ریمنڈ بوٹنک تھا جس سے میں نے اپنی زندگی میں کبھی بات نہیں کی تھی۔ اس نے سوچا کہ شاید میں رضامند ہوں، اس نے میری کمر پہ ہاتھ رکھا اور بغیر کسی اعتراض کے میں نے اس کے ساتھ ناچنا شروع کر دیا۔

ہم کمرے کے پیچھے نہیں پہنچے، میں ناچ رہی تھی، میری ٹانگوں نے لرزنا اور ہاتھوں میں پسینہ ختم ہو چکا تھا میں ایک ایسے لڑکے کے ساتھ ناچ رہی تھی جس نے مجھے منتخب کیا تھا، کسی نے اسے بتایا نہیں تھا اور اسے ضرورت بھی نہ تھی، اس نے صرف مجھ سے پوچھا تھا۔ کیا یہ ممکن تھا؟ کیا میں اس پر یقین کر سکتی تھی؟ کیا میرے ساتھ کوئی بھی مسئلہ نہ تھا۔

میں نے سوچا کہ مجھے اسے بتانا چاہئے کہ یہ ایک غلطی تھی کہ میں چھوڑ کے جا رہی تھی، میں اپنی دوست کے ساتھ گرم چاکلیٹ کھانے جا رہی تھی، لیکن میں نے کچھ نہ کہا۔ میرے چہرے پر خوشگواری کے تاثرات ابھر رہے تھے، بغیر کسی کوشش کے، ان غیر دماغ اور سرد مہر لوگوں کے لیے جن کو ڈانس کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ یہ وہ چہرہ تھا جو کیمبری فارچیون نے دیکھا تھا، جب اس نے سامان گاہ کے کمرے سے باہر کی جانب دیکھا تھا اور اس کا اسکارف اس کے سر پر جما تھا، میں نے اپنے ہاتھ سے ایک کمزور سا اشارہ کیا جو کہ لڑکے کے کندھے سے لگا، یہ بتانے کے لیے کہ میں معافی چاہتی ہوں کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ کیا ہوا تھا؟ اور یہ کہ اب میرا مزید انتظار کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ پھر میں نے اپنا سر اس جانب موڑا اور جب میں نے دوبارہ دیکھا تو وہ چلی گئی تھی۔

ریمنڈ بوٹنک مجھے اپنے گھر لے گیا اور ہورولڈ مسن لوئی کو۔ ہم اکٹھے لوئی کے گھر کے نکڑ تک پیدل آئے۔ لڑکے ہاکی کے کھیل پر بحث کر رہے تھے جس کی مجھے اور لوئی کو کوئی دلچسپی نہ تھی پھر ہم جوڑوں میں بٹ گئے اور ریمنڈ نے میرے ساتھ گفتگو جاری کر دی جو وہ ہورولڈ کے ساتھ کر رہا تھا اس کو یہ محسوس تک نہ ہوا کہ اب وہ اس کے بجائے مجھ سے بات کر رہا تھا ایک دو بار میں نے کہا ”اچھا مجھے معلوم نہیں، میں یہ کھیل نہیں دیکھتی“ لیکن کچھ دیر کے بعد جب میں نے یہ کہنے کا فیصلہ کیا، ہاں ہاں اور یہ ایسے معلوم ہوا جیسے یہ بہت ضروری تھا۔

ایک اور بات جو اس نے کہی وہ یہ تھی ”مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اتنی دور رہتے ہو“ اور وہ ناک سے، سردی کی وجہ سے میرے ناک کچھ زیادہ ہی بہہ رہی تھی اور میری انگلیاں بار بار میرے کوٹ کی جانب میں ٹشو پیپر تلاش کر

رہی تھیں یہاں تک کہ جب میں نے ایک پرانا پھٹا ہوا رومال تلاش کر لیا۔ مجھے سمجھ نہ آئی کہ کیا مجھے یہ رومال اسے بھی دینا چاہیے یا نہیں لیکن وہ اتنے زور سے ناک سے چھینکا کہ آخر مجھے کہنا پڑا "میرے پاس صرف یہی ایک رومال ہے اور یہ اتنا صاف بھی نہیں ہے، شاید اس پر سیاہی لگی ہوئی ہے، لیکن اس کو میں نے دو ٹکڑوں میں تقسیم کیا تو ہم دونوں ایک ایک رکھ سکتے ہیں" "شکریہ، اس نے کہا "یقیناً میں اسے استعمال کر سکتا ہوں"۔

یہ اچھی بات تھی، میں نے سوچا کہ میں نے ایسا کیا ہے۔ گیٹ پر پہنچ کر جب میں نے کہا "اچھا، شب بخیر" اور اس کے بعد اس نے کہا "او اچھا، شب خیر" وہ میری جانب جھکا اور مجھے چوما۔ پھر وہ واپس شہر کی جانب مڑا، یہ جانے بغیر کہ وہ میرا بچانے والا تھا، کہ وہ جھیمیری فارچیون کی دنیا سے واپس اس عام سی دنیا میں لے کر آیا تھا۔

میں پچھلے دروازے سے گھر میں داخل ہوئی، یہ سوچتے ہوئے کہ میں ایک ڈانس پارٹی میں گئی تھی اور ایک لڑکا میرے ساتھ میرے گھر تک آیا تھا اور مجھے چوما تھا، یہ سب کچھ سچ تھا، میری زندگی ممکن تھی، میں کچن کی کھڑکی سے گزری اور اپنی ماں کو دیکھا۔ وہ تندور کے پاس پاؤں کے بل بیٹھی تھی اور پیالے سے چائے پرچ میں انڈھیل کر پی رہی تھی، وہ شاید وہاں میرا انتظار کر رہی تھی کہ میں گھر آؤں اور اس کو سب کچھ بتاؤں۔ میں ایسا نہیں کروں گی کبھی بھی نہیں۔ جب میں نے اپنے لیے منتظر کچن کو دیکھا اور ماں کو وہاں پرانے اور مبہم مگر اپنے نیند سے بھرے لیکن مستقل مزاج چہرے کے ساتھ بیٹھا دیکھا تو سمجھ گئی کہ ماں کی خوشنودی کے حصول کے لیے مجھے کس قسم کے پراسرار اور مختلف فرض کو نبھانا ہوگا۔ شاید اس میں ناکام تھی اور شاید میں ہر وقت ناکام ہونا ہی پسند کروں گی اور اسے کبھی معلوم بھی نہ ہوگا۔

☆☆☆☆

اُورحان پاُموک
ترکی ادب سے ترجمہ: نجم الدّین احمد

معروف ہستیاں

اگر سُننے کو کوئی کہانی یا دیکھنے کو کچھ نہ ہو تو زندگی بے کیف ہوتی ہے۔ جب میں بچہ تھا تو ہم کھڑکی سے باہر گلی سے گُزرنے والوں کا نظارہ کرتے، سامنے کی عمارت کے، کہ جس کی چھت پر ہمیشہ ایک چینی مٹّی کا بنا ہوا کتا سویا ہوتا تھا، اپارٹمنٹس میں تانکا جھانکی نہ کر رہے ہوتے تو ریڈیو سُن رہے ہوتے۔ ۱۹۵۸ء میں ترکی میں ٹیلی ویژن نہیں ہوا کرتا تھا لیکن ہم یہ اعتراف کبھی نہیں کریں گے کہ ٹیلی ویژن نہیں ہوتا تھا بلکہ ہم خُوش گُمانی سے وہی کہیں گے جو ہم نے ہالی وُڈ کی اُس داستانی فلم کے بارے میں کہا تھا جسے استنبول پہنچنے میں کچھ برس لگ گئے تھے: وہ ابھی آئی ہی نہیں۔

کھڑکی سے باہر تکنے کی عادت اِتنی پختہ ہو چکی تھی کہ بالآخر جب ٹیلی ویژن کی آمد ہوئی تو لوگ اُسے بھی یُوں دیکھتے گویا کھڑکی سے باہر تک رہے ہوں۔ میرے والد، چچا اور دادی ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ کر ایک دُوسرے کی طرف دیکھے بغیر بالکل اُسی انداز میں باتیں اور بحث کرتے رہتے جس میں وہ کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کرتے تھے۔

مثال کے طور پر صبح سے ہونے والی برف باری کو دیکھتے ہوئے میری پھوپھی تبصرہ کرتی۔ ’’اگر برف اِسی رفتار سے پڑتی رہی تو خُوب موٹی تہہ جمے گی۔‘‘

’’وہ حلوہ فروش دوبارہ نشانتاشی پہنچ گیا ہے۔‘‘ وہ دُوسری کھڑکی سے ریل کی پٹڑی کو تکتے ہوئے کہتا۔

اتوار کی اتوار ہم اپنی پھوپھیوں اور چچاؤں کے ہمراہ، جو ہماری ہی مانند عمارت کی نچلی منزلوں پر رہائش پذیر تھے، اُوپری منزل پر دادی کے ہاں دوپہر کے کھانے کے لیے جاتے۔ میں کھانے کے انتظار کے دوران کھڑکی سے باہر تکتا رہتا۔ عزیز و اقارب کے اُس شور مچاتے اکٹھ سے میں اِس قدر مسرور ہوتا کہ کھانے کی میز پر لٹکے شمع دان سے مدہم روشن نشست گاہ بھی میری آنکھوں میں جگمگ جگمگ کرنے لگتی۔

دُوسری منزلوں کی نشست گاہوں کی مانند میری دادی کی نشست گاہ میں بھی ہمیشہ نیم اندھیرا ہوتا تھا لیکن وہ مجھے نسبتاً زیادہ اندھیری لگتی تھی۔ شاید اِس کا سبب جھروکوں کے سروں پر سدا بند رکھے جانے والے دروازوں پر لگے خوف ناک سایوں والے جالی دار پردے اور آراستہ کی ہوئی چنٹوں والی بھاری بھرکم جھالریں

تھیں۔ شاید مجھے اس بنا پر ایسا لگتا تھا کہ وہ کمرے بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے، جن سے دُھول کی مہک اُٹھتی تھی اور وہ لکڑی کے قدیمی خستہ صندوقوں، شیشوں پر سیپیوں کی بُنت کاری، خُوش وضع پنجوں جیسے پایوں والے جہازی حجم کے بلوط کے میز اور تین نسلوں پُرانا چھوٹا سا پیانو، جس کا ڈھکن چوکھٹے میں جڑی تصویروں سے ڈھنپا ہوا تھا، سے ٹھنسے ہوئے تھے۔

ایک اتوار کو دوپہر کے کھانے کے بعد چچا نے، جو کھانے کے کمرے میں کھلنے والے ایک اندھیرے کمرے میں تمبا کو نوشی کر رہے تھے، بہ آوازِ بلند کہا۔ ‘‘میرے پاس فٹ بال میچ کے دو ٹکٹ ہیں لیکن میں نہیں جا رہا۔ تمھارے والد تم دونوں کو کیوں نہیں لے جاتے؟’’

‘‘ہاں ابا جان، ہمیں کھیل دِکھانے لے جائیں۔’’ میرا بڑا بھائی دُوسرے کمرے سے بولا۔

‘‘اِس سے لڑکوں کی ہَوا خوری بھی ہو جائے گی۔’’ امّی نے کہا۔

‘‘تم ہی اِنھیں کیوں نہیں لے جاتیں؟’’ ابا جان بولے۔

‘‘میں اپنی ماں کے ہاں جا رہی ہوں۔’’ ماں نے جواب دیا۔

‘‘ہم نانی کے گھر نہیں جانا چاہتے۔’’ بھائی نے کہا۔

‘‘آپ گاڑی لے جا سکتے ہیں۔’’ چچا بولے۔

‘‘چلو نا، ابا جان۔’’ بھائی نے تر لا کیا۔

ایک طویل اور تکلیف دِہ خاموشی یُوں چھا گئی گویا ابا جان اندازہ لگانا چاہ رہے ہوں کہ وہاں موجود ہر شخص اُن کے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔

‘‘ٹھیک ہے، مجھے چابیاں دے دو۔’’ ابا جان نے چچا سے کہا۔

کچھ دیر بعد ہم زمینی منزل پر تھے۔ والد تمبا کو نوشی کرتے ہوئے طویل ڈیوڑھی میں جا رہے تھے۔ ہماری ماں نے ہمیں منقّش اُون کی موٹی موٹی جُرابیں اور دو دو سویٹر پہنا دیے تھے۔ چچا کی ۱۹۵۲ء موتیا رنگ کی شان دار ڈاج کارٹیئش وِکیے مسجد کے سامنے کھڑی تھی۔ والد ہم دونوں کو اگلی نشست پر بٹھانے پر رضامند ہو گئے۔ انجن پہلی مرتبہ چابی گھماتے ہی چالُو ہو گیا۔

سٹیڈیم میں داخلے پر قطار نہیں تھی۔ ‘‘یہ ٹکٹ اِن دونوں کی ہے۔’’ میرے والد نے چگّر دار دروازے پر موجود شخص سے کہا۔ ‘‘ایک آٹھ سال کا ہے اور دُوسرا دس کا۔’’ ہم ٹکٹ والے سے نظریں چراتے ہوئے اندر چلے گئے۔ قطاروں میں بے شمار نشستیں خالی پڑی تھیں۔ ہم بیٹھ گئے۔

ٹیمیں پہلے سے کچے میدان میں موجود تھیں۔ مجھے سفید کچھے پہنے کھلاڑیوں کا اپنے آپ کو گرمانے کے لیے اِدھر اُدھر دوڑنا بھاگنا اچھا لگا۔ ‘‘اُس چھوٹے کھلاڑی کو دیکھو۔’’ بھائی نے اشارہ کیا۔ ‘‘اُسے جونیئر ٹیم سے لیا گیا ہے۔’’

’’مجھے پتا ہے، شکریہ۔‘‘

کھیل شروع ہونے کے بعد جب سٹیڈیم کے سب تماشائی پُراسرار طور پر خاموش ہو گئے تو میں نے کھلاڑیوں سے دھیان ہٹا کر اپنے ذہن کو بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ فٹ بال کے تمام کھلاڑی ایک ہی جیسی وردی پہنتے ہیں تو پھر اُس پر اپنے اپنے نام کی پٹی کیوں لگاتے ہیں؟ وہ جیسے ہی بھاگ دوڑ کے دوران قریب آتے میں اُن کے نام دیکھنے لگتا۔ دھیرے دھیرے اُن کے گچھے دُھول میں اُٹنے لگے۔ کچھ دیر بعد مجھے ایک بحری جہاز کی آہستہ آہستہ حرکت کرتی ہوئی میدان کے پنجوں کے عقب میں دِکھائی دی، جو باسفورس سے گُزر رہا تھا۔ کھیل کا آدھا وقت بیتنے تک کسی ٹیم نے کوئی گول نہیں کیا تھا اور ہمارے والد ہمارے لیے مخروطی شکل کے کاغذ میں لپٹے ہوئے بُھنے ہوئے خستہ دانے اور پِتا (pitta) ڈبل روٹی لے آئے۔

’’ابا جان، میں اپنی ساری پِتا ختم نہیں کر سکتا۔‘‘ میں نے اُنھیں اپنے ہاتھ میں بچی ہوئی پِتا دِکھاتے ہوئے کہا۔

’’نیچے پھینک دو۔‘‘ اُنھوں نے کہا۔ ’’کوئی دھیان نہیں دے گا۔‘‘

آدھے وقت کے وقفے کے دوران کھڑے ہو کر سب کی مانند اپنے آپ کو گرم رکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ اپنے والد کی طرح بھائی اور میں نے بھی پتلون کی جیب میں ہاتھ اُڑسے اور میدان کی جانب پیٹھ کر لی۔ ہم دُوسرے تماش بینوں کو دیکھ رہے تھے کہ تبھی ایک آدمی نے میرے والد کو پُکار کر کچھ کہا۔ ابا جان نے کان پر ہاتھ کو بھونپو بنا کر اشارہ دیا کہ وہ شور کے باعث اُس کی بات سُن نہیں سکے۔

’’میں اِس وقت تو نہیں آ سکتا۔‘‘ اُنھوں نے ہماری سمت اشارہ کیا۔ ’’میرے ساتھ بچے ہیں۔‘‘

وہ شخص بنفشی گلوبند پہنے ہوئے تھا۔ وہ قطاروں سے نیچے، نشستیں پھلانگتا، راہ میں رُکاوٹ بننے والے لوگوں کو دھکیلتا ہوا ہمارے پاس بیٹھنے کے لیے آ گیا۔

’’کیا یہ تمھارے بچے ہیں؟‘‘ اُس نے ابا جان سے معانقہ کرنے اور اُن کے دونوں گالوں پر بوسہ دینے کے بعد دریافت کیا۔ ’’کافی بڑے ہو گئے ہیں۔ یقین نہیں آتا اس بات پر۔‘‘

ابا جان نے کوئی جواب نہیں دیا۔

’’یہ سب تم نے کیسے کر لیا؟‘‘ وہ آدمی بولا۔ ’’کیا سکول سے فارغ ہوتے ہی فوراً شادی کر لی تھی؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ ابا جان نے اُس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ اُنھوں نے کچھ اَور باتیں بھی کیں۔ اُس کے جانے کے بعد ابا جان چُپ ہو کر بیٹھ گئے۔

صاف ستھرے کپڑے پہنی ٹیمیں میدان میں دوبارہ اُتری ہی تھیں کہ ابا جان بولے۔ ’’آؤ، واپس گھر چلتے ہیں۔ تمھیں ٹھنڈ لگ رہی ہے۔‘‘

’’مجھے سردی نہیں لگ رہی۔‘‘ بھائی نے کہا۔

”نہیں لڑکو، تمھیں ٹھنڈ لگ رہی ہے۔“ ابا جان نے بہ اصرار کہا۔ ”علی کو لگ رہی ہے۔ چلو، اُٹھو یہاں سے۔“

آپس میں گھٹنے ٹکراتے اور ٹھڈے مارتے ہوئے وہاں سے اُٹھے تو ہم نے زمین پر اپنے پھینکے ہوئے پنیر لگی پِٹا کو پیروں تلے روند ڈالا۔ سیڑھیاں اُترتے ہوئے ہم نے کھیل کا دُوسرا حصہ شروع کرنے والی ریفری کی سیٹی سُنی۔ ”کیا تمھیں ٹھنڈ لگ رہی ہے؟“ بھائی نے مجھ سے دریافت کیا۔ ”تم نے یہ کیوں کہا کہ تمھیں سردی لگ رہی ہے؟“

میں نے جواب نہیں دیا۔

”تم احمق ہو۔“ بھائی نے کہا۔

”کیا تم کھیل کا آدھا حصہ ریڈیو پر نہیں سُن سکتے؟“ ابا جان بولے۔

”یہ ریڈیو پر نشر نہیں ہو رہا۔“ بھائی بولا۔

”ہُش۔“ ابا جان بولے۔ ”واپسی پر میں تمھیں تاکسم چوک کے راستے لے کر جاؤں گا۔“

ہم خاموش رہے۔ چوک پار کرنے کے بعد ابا جان نے ہمارے قیاس کے عین مطابق کار سڑک سے ہٹ کر بنی ہوئی جوئے کی کھڑکیوں کے ساتھ کھڑی کی۔ ”کسی کے لیے بھی دروازہ مت کھولنا۔“ وہ بولے۔ ”میں جلد لوٹ آؤں گا۔“

وہ باہر نکل گئے۔ اُن کے دروازوں کو باہر سے تالے لگانے سے قبل ہی ہم نے اندر سے تالوں کے کُل نیچے گرا لیے لیکن ابا جان جوئے والی کھڑکیوں کی طرف نہیں گئے۔ وہ سنگریزوں پر دوڑتے ہوئے سڑک کے پار ایک ایسی دُکان میں گئے جہاں کھڑکیوں میں بحری جہازوں کے اشتہار، ہوائی جہازوں کے پلاسٹک سے بنے بڑے بڑے نمونے اور ساحلوں کی تصاویر لگی ہوئی تھیں۔

”ابا جان کہاں جا رہے ہیں؟“ میں بولا۔

”جب ہم گھر پہنچیں گے تو تم ’اوپر یا سب سے نیچے‘ کھیلنا چاہو گے؟“ بھائی نے پُوچھا۔

جب ابا جان لوٹے تو بھائی گیئر کے دستے سے کھیل رہا تھا۔ ہم تیز رفتاری سے نشانتاشی پہنچے۔ انھوں نے کار دوبارہ مسجد کے سامنے کھڑی کی۔ جب ہم اللہ دین کی سستے داموں والی دُکان کے پاس سے گزرنے لگے تو ابا جان کہنے لگے۔ ”کیوں نہ میں تم دونوں کو کچھ لے دوں؟ لیکن وہ ’معروف ہستیاں‘ والی سیریز نہیں لے کر دوں گا۔“

”اوہ براہِ مہربانی، ابا جان، براہِ مہربانی۔“ ہم کودتے ہوئے بولے۔

ابا جان ہم دونوں کے لیے دس دس چیونگمیں خرید کر دیں جن میں مشہور لوگوں کی تصاویر تہہ کی ہوئی نکلیں۔ گھر واپسی کے راستے میں مجھے لگا جیسے مارے جوش کے میرا پیشاب خطا ہو جائے گا۔ اپارٹمنٹ گرم تھا

اور ہماری والدہ ابھی تک نہیں لوٹی نہیں تھیں۔ ہم نے جلدی سے چپکے ہوے ٹکڑے کھولے اور اُن پر لپٹے ہوے کاغذ فرش پر پھینک دیے۔ میرے پاس مارشل فیوزی کیکمیکس اور اتاترک کی دو دو اور چیپلن، پہلوان ہیمت کیپلان، گاندھی، موزارٹ اور گریٹا گاربو کی ۲۱ نمبر تصاویر نکلیں جو میرے بھائی کے پاس نہیں تھیں۔ میرے پاس کل ۱۷۳ معروف ہستیوں کی تصاویر ہو چکی تھیں لیکن اب بھی مجھے سلسلہ مکمل کرنے کے لیے ستائیس تصاویر کی ضرورت تھی۔ میرے بھائی کے پاس مارشل فیوزی کیکمیکس کی چار، اتاترک کی پانچ اور ایڈیسن کی ایک تصویر تھی۔ ہم دونوں نے اپنے مُنھوں سے گوند اُتارا اور تصویروں کے عقب میں لکھی سُرخی پڑھنے لگے:

مارشل فیوزی کیکمک
ترکی کی جنگِ آزادی کا کمانڈنگ آفیسر
(۱۸۷۶-۱۹۵۰)
مامبو کینڈی اینڈ گم کمپنی
تمام معروف ہستیوں کی تصاویر جمع کرنے والے
خُوش نصیب کو چمڑے کا ایک فٹ بال دیا جائے گا۔

میرے بھائی کے پاس جمع کی ہوئی ۱۶۵ تصاویر ڈھیر کی صورت میں اُس کی مٹھی میں پکڑی ہوئی تھیں۔

”آؤ اُوپر یا سب سے نیچے کھیلیں۔“ وہ بولا۔

”نہیں۔“

”میں تمھیں گریٹا گاربو کی ایک تصویر کے بدلے میں مارشل کیکمس کی بارہ تصاویر دوں گا۔“ اُس نے کہا۔ ”اِس طرح تمھارے پاس کل ۱۸۴ تصاویر ہو جائیں گی۔“

”لیکن تمھارے پاس گریٹا گاربو کی دو تصاویر ہیں۔“

”میں نے یہ بات نہیں کی۔“

”کل سکول میں جب ہمیں حفاظتی ٹیکے لگیں گے تو تمھیں بہت زیادہ تکلیف ہوگی۔“ وہ بولا۔ ”لہٰذا مجھ پر مت چلاؤ، سمجھے؟“

”نہیں ہوگی۔“

رات کا کھانا خاموشی سے کھانے کے بعد ہم نے سپورٹس ورلڈ پروگرام سُنا تو ہمیں پتا چلا کہ کھیل دو دو گول سے برابر رہ کر ختم ہوا ہے۔ جب امّی ہمیں اپنے اپنے بستروں پر ڈالنے کے لیے ہمارے کمرے میں آئیں تو بھائی اپنا بستہ تلاش کر رہا تھا۔ میں نشست گاہ کی طرف دوڑا۔ میرے والد باہر سڑک کی جانب تک رہے تھے۔

”ابا جان، میں کل سکول نہیں جانا چاہتا۔“ میں نے کہا۔

''اِس کی وجہ؟''

''ہمیں ٹیکے لگتے ہیں۔'' میں بولا۔ ''جس سے مجھے بخار چڑھ جائے گا اور میرے لیے سانس تک لینا دشوار ہو جائے گا۔ امّی کو یہ بات معلوم ہے۔''

اُنھوں نے کوئی جواب نہیں دیا بس میری طرف دیکھتے رہے۔ میں دوڑا گیا اور دراز سے کاغذ قلم نکال لایا۔

''تمھیں یقین ہے کہ تمھاری ماں کو یہ بات پتا ہے۔'' اُنھوں نے کاغذ کو کیر کے گا (Kierkegaard: ۱۸۱۳-۵۵ء، معروف ڈینش فلسفی اور ماہرِ مذہب۔ مترجم) پر رکھتے ہوئے دریافت کیا جسکا وہ ہمیشہ مطالعہ کرتے تھے لیکن کبھی ختم نہیں کر پائے تھے۔ ''تم سکول جاؤ گے لیکن تمھیں ٹیکہ نہیں لگایا جائے گا۔'' وہ بولے۔

''میں یہی بات لکھ رہا ہوں۔''

اُنھوں نے رقعے پر دستخط کیے۔ میں نے روشنائی پر پُھونک ماری، کاغذ تہہ کیا اور جیب میں رکھ لیا۔ میں بھاگتا ہوا اپنے سونے کے کمرے میں گیا، رقعے کو بستے میں رکھا اور اپنے بستر پر اُچھلنے کودنے لگا۔

''تمیز اختیار کرو۔'' امّی نے کہا۔ ''اور اب سو جاؤ۔''

سکول میں ساری جماعت دو رَووں میں بٹ کر بدبودار قہوین کے عقب کی جانب ٹیکے لگوانے چل پڑی۔ ہم میں سے کچھ رَو رہے تھے تو دیگر وقت سے پہلے ہی خوف کا شکار تھے۔ جب سانس کے راستے آئیوڈین کی مہک میرے اندر پہنچی تو میرے دِل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں قطار سے نکل کر سب اُوپر والی سیڑھی پر کھڑی معلّمہ کی طرف گیا۔ جماعت میں افراتفری اور ایک ہنگامہ برپا تھا۔

میں نے جیب سے والد صاحب کا لکھا ہوا رقعہ نکالا اور معلّمہ کے حوالے کر دیا۔ اُس نے تیوریاں چڑھا کر اُسے پڑھا۔ ''لیکن تمھارے والد ڈاکٹر نہیں ہیں۔'' وہ بولی۔ اُس نے لمحہ بھر کے لیے غور کیا اور پھر کہا۔ ''اُوپر چلے جاؤ اور ۲-الف میں انتظار کرو۔''

اُوپر ۲-الف میں میری ہی طرح کے چھے یا سات حیلہ ساز بچے موجود تھے۔ ایک بچہ سخت دہشت کے عالم میں کھڑکی سے باہر گھورے جا رہا تھا۔ باہر برآمدے مسلسل ہنگامہ اور شور برپا تھا۔ چشمے والا ایک موٹا بچہ سُورج مکّھی کے بیج چباتے ہوئے، کنووا کی کارٹونوں والی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے دروازہ کھولا تو گنجا مددگار مدرسہ اندر داخل ہوا۔

''تم میں سے جو واقعی بیمار ہیں اُنھیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔'' وہ کہنے لگا۔ ''سزا صرف اُن کو ملے گی جو جھوٹ بول رہے ہیں۔ ایک روز تم سب کو اپنے وطن کی حفاظت بلکہ اِس پر اپنی جان قربان کرنے کے لیے بھی بلایا جائے گا۔ اگر تم میں سے اُنھوں نے آج حفاظتی ٹیکہ لگوانے سے گُریز کیا جن کے پاس معقول وجہ نہیں ہے تو وہ غداری کے مرتکب ہوں گے۔ شرم آنی چاہیے تمھیں!''

ہم چُپ رہے۔ اتاترک کی تصویر کو دیکھتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

بعد میں ہم خاموشی سے اپنی اپنی جماعت کے کمروں میں چلے گئے۔ ٹیکے لگنے والوں کے مُنھ لٹکے ہوئے تھے۔ کچھ نے اپنی آستینیں تہہ کر کے اُوپر چڑھا رکھی تھیں تو کچھ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور وہ ایک دُوسرے کو دھکّے اور کندھے مار رہے تھے۔

’’تم میں سے جن کے گھر قریب ہیں وہ جا سکتے ہیں۔‘‘ معلمہ نے کہا۔ ’’تم میں سے جن کو سہاروں کی ضرورت ہے وہ آخری گھنٹی ہونے تک یہیں انتظار کریں۔ ایک دُوسرے کے بازو پر اِس طرح ضربیں مت لگاؤ! کل سکول بند ہوگا۔‘‘

ہم خُوش ہو گئے۔ نچلی منزل کے مرکزی دروازے پر کچھ طالب علم دربان حلمی آفندی کو اپنی آستینیں اُوپر چڑھا چڑھا کر آئیوڈین کے نشان دِکھا رہے تھے۔

میں جیسے ہی سکول سے نکل کر سڑک پر پہنچا میں نے گھر کی سمت دوڑ لگا دی۔ ایک تانگے نے کارابیٹ قصاب کی دُکان کے سامنے کی روِش بند کر رکھی تھی۔ میں حیاری کپڑے اور صالح پُھولوں والے کی دُکانوں کے پاس سے بھاگتا ہوا نکلا۔ ہمارے دربان اعظم آفندی نے مجھے اندر جانے دیا۔

’’تم اِتنی جلد گھر کیسے آ گئے؟‘‘ وہ بولا۔

’’اُنھوں نے ہمیں ٹیکے لگائے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’پھر سکول سے ہماری چھٹی کر دی۔‘‘

’’تمھارا بھائی کہاں ہے؟ کیا تم اکیلے آئے ہو؟‘‘

’’میں ریل کی پٹڑی پار کر کے آیا ہوں۔ کل سکول کی چھٹی ہے۔‘‘

’’تمھاری ماں گھر پر موجود نہیں ہے۔‘‘ وہ بولا۔ ’’تم اپنی نانی کے ہاں کیوں نہیں چلے جاتے؟‘‘

’’میں بیمار ہوں۔‘‘ میں بولا۔ ’’میں اپنے ہی گھر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے جانے دو۔‘‘

اُس نے دِیوار گیر کھونٹی سے چابی اُتاری اور ہم لفٹ میں سوار ہو گئے۔ لفٹ کے اُوپری منزل پر پہنچنے تک لفٹ اُس کی سگریٹ کے دھوئیں سے بھر گئی جس سے میری آنکھوں میں جلن ہونے لگی۔ اُس نے مجھے اپارٹمنٹ میں چھوڑا۔

’’روشنیوں سے چھیڑ چھاڑ مت کرنا۔‘‘ وہ جاتے ہوئے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔

اگرچہ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا لیکن میں پھر بھی پُکارا۔ ’’کوئی ہے گھر میں؟‘‘ میں گھر پر ہوں، میں گھر پر ہوں! میں نے بستہ پھینکا، اپنے بھائی کی میز کا دراز کھولا اور فلم کی اُن ٹکٹوں کو دیکھنے لگا جو اُس نے ہمیشہ مجھ سے چھپائی تھیں۔ اِس کے بعد میں اپنی تراشے چپکانے والی کتاب میں منہمک ہو گیا جس میں مَیں نے فٹ بال کے کھیل کے اخباری تراشے چسپاں کر کے اُن کے گرداگرد پنسل سے حاشیے لگا رکھے تھے۔ تبھی میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سُنی۔ مجھے قدموں کی چاپ سے پتا چل گیا کہ وہ امّی نہیں ابا جان ہیں۔ میں نے احتیاط

سے اپنے بھائی کی ٹکٹوں اور چپکے ہوئے اخباری تراشوں کی کتابوں کو دھیان سے رکھا تا کہ وہ یہ نہ دیکھ سکیں کہ میں نے اُن کی ترتیب خراب کر دی ہے۔

ابا جان اپنی خواب گاہ میں گئے، کپڑوں کی الماری کھولی اور اُس کے اندر دیکھنے لگے۔

”اوہ، تم گھر پر ہو؟“

”نہیں، میں پیرس میں ہوں۔“ میں نے اُس انداز میں کہا جس میں ہم سکول میں کہتے تھے۔

”کیا تم آج سکول نہیں گئے؟“

”آج ٹیکے لگنے کا دِن تھا۔“

”تمھارا بھائی کہاں ہے؟ خیر، ٹھیک ہے۔ تم اپنے کمرے میں جا کر ٹِک کر بیٹھو۔ میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔“

میں نے اُن کے حکم کی تعمیل کی۔ میں کھڑکی کے شیشے سے سر ٹکا کر باہر دیکھنے لگا۔ اُن کی کھٹ پٹ سے لگ رہا تھا کہ وہ نشست گاہ کی کپڑوں کی الماری سے سُوٹ کیس نکال رہے ہیں۔ وہ واپس اپنے کمرے میں گئے۔ اُنھوں نے الماری سے اپنی سپورٹس جیکٹ اور ٹراؤزر نکالا۔ مدہم آوازوں سے میں نے اُنھیں ہینگروں کی آوازوں کے طور پر شناخت کیا۔ اُنھوں نے اپنی قمیص اور جُرابیں رکھنے والے دراز کھولے۔ میں نے اُن تمام چیزوں کے سُوٹ کیس میں رکھنے کی آوازیں سُنیں۔ وہ غسل خانے میں گئے اور باہر نکلے۔ اُنھوں نے اپنا سُوٹ کیس بند کیا اور اُس کی کُنڈیاں پُوری احتیاط سے باہم جوڑ دیں۔ وہ میرے پاس کمرے میں آ گئے۔

”تم اب یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”کھڑکی سے باہر دیکھ رہا ہوں۔“

”اِدھر آؤ۔“ وہ بولے۔

اُنھوں نے اُٹھا کر مجھے اپنی گود میں بٹھایا اور ہم باہر دیکھنے لگے۔ ہمارے اور دُوسری سمت کے اپارٹمنٹوں کے درمیان لگے سرو کے درختوں کے بلند سِروں کے ہلکی ہلکی ہَوا سے جُھومنے سے پرے کی عمارتیں جُھولے لیتی لگ رہی تھیں۔ مجھے اپنے والد کے بدن کی خُوش بو اچھی لگ رہی تھی۔

”میں دُور جا رہا ہوں۔“ وہ بولے اور میرا بوسہ لیا۔ ”اپنی ماں کو کچھ مت بتانا۔ میں بعد میں خُود اُسے بتاؤں گا۔“

”ہوائی جہاز سے؟“

”ہاں۔“ وہ بولے۔ ”پیرس۔ کسی سے کوئی بات مت کرنا۔“ اُنھوں نے اڑھائی لیرا کا بڑا نوٹ نکال کر مجھے دیا۔ ”اِس کا کسی سے بالکل بھی ذکر مت کرنا۔“ اُنھوں نے اضافہ کیا اور دوبارہ میرا بوسہ لیا۔ ”اور یہ بھی کہ میں گھر آیا تھا......“

میں نے پیسے فوراً جیب میں ڈال لیے۔ جب اُنھوں نے مجھے اپنی گود سے اُتار کر اپنا سوٹ کیس اُٹھایا تو میں بولا۔ ”نہ جائیں، ابا جان۔“

اُنھوں نے ایک بار پھر میرا بوسہ لیا اور چلے گئے۔

میں اُنھیں کھڑکی سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ اللّٰہ دین کی دُکان کی طرف جا رہے تھے۔ پھر اُنھوں نے پاس سے گزرتی ہوئی ایک ٹیکسی روکی۔ کار میں جھک کر بیٹھنے سے پہلے اُنھوں نے مُڑ کر اپارٹمنٹ کی طرف دیکھا اور میری سمت ہاتھ ہلا دیا۔ میں نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا اور وہ چلے گئے۔

میں خالی سڑک تکتا رہا۔ پھر وہاں سے ایک بندہ اور پھر ماشکی اپنے پانی ڈھونے والے گھوڑے کو کھینچتا ہوا گزرا۔ میں نے گھنٹی بجا کر اعظم کو بُلایا۔

”کیا گھنٹی تم نے بجائی تھی؟“ اُس نے آ کر پُوچھا۔ ”گھنٹی سے مت کھیلو۔“

”یہ اڑھائی لیرے لے جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”اللّٰہ دین کی دُکان پر جاؤ اور میرے لیے فرنچ مِنٹ ببل گم لے کر آؤ۔ اور ہاں، پچاس کروس کی بھان لانا مت بُھولنا۔“

”کیا یہ پیسے تمھارے والد نے تمھیں دیے ہیں؟“ اُس نے دریافت کیا۔ ”تمھاری ماں ناراض تو نہیں ہوگی یا ہوگی؟“

میں نے جواب نہیں دیا۔ میں کھڑکی سے اُسے دُکان پر جاتا دیکھتا رہا۔ وہ چند منٹ بعد پلٹا تو اُسے راستے میں پار کے اپارٹمنٹ کا دربان مل گیا۔ وہ دونوں آپس میں گپیں ہانکنے لگے۔

واپس آ کر اُس نے مجھے بھان دی۔ میں نے گم کھولی: مارشل فیوزی کیکمیکس کی تین، اتاترک کی ایک اور لینڈبرگ، لیونارڈو داونسی، سلطان سلیمان، چرچل کی ایک ایک اور نمبر ۲۱ والی گریٹا گاربو کی ایک اَور تصویر نکلی جو میرے بھائی کے پاس نہیں تھی۔ اب میرے پاس کل ۱۸۳ تصاویر ہو گئی تھیں۔ لیکن اب بھی سلسلہ مکمل کرنے کے لیے میرے پاس ۲۶ تصاویر کم تھیں۔

مجھے پہلی بار لنڈبرگ کا ۹۱ نمبر والا فوٹو پہلی بار اچھا لگا تھا، جو اُس جہاز کے سامنے کھینچا گیا تھا جس پر اُس نے اٹلانٹک پار کیا تھا۔ میں نے کسی کے دروازہ کھولنے کی آواز سُنی۔ امّی! میں نے جلدی سے گم پر سے اُتار کر گرائے ہوئے کاغذوں کو اُٹھا کر دُور پھینک دیا۔

”ہمیں ٹیکے لگ گئے ہیں۔ میں ذرا جلد گھر آ گیا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کو پتا ہے معیادی بخار، چیچک اور خسرے کے ٹیکے لگے ہیں۔“

”تمھارا بھائی کہاں ہے؟“

”اُس کی جماعت کو ابھی تک ٹیکے نہیں لگے۔“ میں نے کہا۔ ”اُنھوں نے ہمیں گھر بھیج دیا۔ میں تو خود قطار سے آگے نکل گیا تھا۔“

’’کیا درد ہو رہا ہے؟‘‘

میں کچھ نہیں بولا۔

جلد ہی بھائی بھی گھر آ گیا۔ اُسے درد ہو رہا تھا اور وہ تیوریاں چڑھا کر بستر پر دائیں کروٹ یُوں لیٹ گیا جیسے سو رہا ہو۔ جب وہ اُٹھا تو اندھیرا قریب قریب چھا چکا تھا۔ ’’ماں، واقعی بہت درد ہو رہا ہے۔‘‘ اُس نے کہا۔

’’تمھیں رات تک بخار چڑھ جائے گا۔‘‘ ماں نے کپڑے استری کرتے ہوئے نشست گاہ سے جواب دیا۔ ’’علی، کیا تمھیں بھی درد ہو رہا ہے۔ سکون سے لیٹ جاؤ۔‘‘

ہم آرام سے بے حرکت لیٹ گئے۔ قیلولے کے بعد بھائی اُٹھ کھڑا ہوا اور اخبار سے کھیلوں والا صفحہ پڑھتے ہوئے مجھے بتانے لگا کہ میری وجہ سے ہم کل چار گول ہوتے نہیں دیکھ سکے۔

’’اگر ہم وہاں سے نہ آتے تو شاید وہ ایک بھی گول نہ کر پاتے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’کیا؟‘‘

ایک بار پھر نیند لینے کے بعد بھائی نے اتاترک کی چار اور تین دیگر لوگوں کی تصاویر کے بدلے مجھے مارشل فیوزی کیکمیکس کی چھے تصاویر کی پیش کش کی۔ میرے پاس گریٹا گاربو کی ایک تصویر پہلے سے موجود تھی۔

میں نے انکار کر دیا۔

’’اُوپر یا نیچے کھیلو گے؟‘‘ میرے انکار پر اُس نے پُوچھا۔

’’ٹھیک ہے، کھیل لیتے ہیں۔‘‘

کھیل کچھ یُوں تھا کہ آپ معروف ہستیوں کی تصاویر کی ایک گڈی کو اپنی مٹھی میں بند کر لیتے اور پُوچھتے۔ ’’اُوپر یا نیچے؟‘‘ اگر مقابل کہتا۔ ’’نیچے۔‘‘ تو گڈی سے سب سے نچلی تصویر نکالی جاتی۔ فرض کیا کہ مثلاً سب سے نچلی تصویر ۷۸ نمبر، ریٹا ہے ورتھ، نکلتی ہے اور سب سے اُوپر والی تصویر ۱۸ نمبر، دانتے، ہوتی ہے۔ اِس طرح سب سے نچلی تصویر کا نمبر بڑا ہونے کی وجہ سے مقابل جیت جائے گا اور آپ کو اُسے وہ تصویر دینا پڑتی جو آپ کو سب سے کم پسند ہوتی۔ کھیل کے دوران ہمارے درمیان مارشل فیوزی کیکمیکس کی تصاویر کا تبادلہ رات تک چلتا رہا۔ رات کے کھانے کے وقت ماں بولی۔ ’’تم میں سے کوئی ایک چھت پر جا کر دیکھے، شاید تمھارے ابا گھر آ رہے ہوں۔‘‘

ہم دونوں اُوپر چلے گئے۔ میرے والد نہیں آ رہے تھے۔ میرے چچا تمباکو نوشی کر رہے تھے ہم ریڈیو پر خبریں سنتے اور اخبار سے کھیلوں کا صفحہ پڑھنے لگے۔ جب دادی اور چچا رات کا کھانا کھانے بیٹھے تو ہم نچلی منزل پر لوٹ آئے۔

’’تم لوگ کہاں تھے؟‘‘ اَمّی نے پُوچھا۔ ’’تم نے اُوپر کچھ کھایا ہے یا نہیں؟ بہتر ہے کہ اب تمھیں دال کا شوربہ دے دوں تاکہ تم اپنے ابا کے آنے تک تھوڑا تھوڑا کھاتے رہو۔‘‘

"توس نہیں ہے؟" بھائی نے پُوچھا۔

ہمارے چُپ چاپ شوربہ کھانے کے دوران ماں ہمیں دیکھتی رہی۔ میں جانتا تھا کہ اُن کے کان لفٹ کی آواز کی سمت اِس طرح لگے ہوئے ہیں کہ وہ ہم سے نظریں ہٹائے بغیر ہی اپنا سر گھما لیتی تھیں۔ جب ہم ختم کر چکے تو اُنھوں نے پیالے دیکھ کر پُوچھا۔ "اَور چاہیے؟" مجھے ٹھنڈ بڑھ جانے سے پہلے پہلے اَور چاہیے تھا لیکن وہ کھڑکی کے پاس جا کر نشانتاشی چوک پر نظر ڈالتے ہوئے خاموشی سے نیچے گھورنے لگیں۔ وہ میز کی طرف پلٹیں اور اپنا شوربہ کھانے لگیں۔ میں اور بھائی گزرے ہوئے کل کے کھیل کے بارے میں باتیں کرنے لگے کہ وہ اچانک بولیں۔ "شش، کیا لفٹ میں کوئی ہے؟"

ہم غور سے سننے لگے۔ لفٹ میں کوئی نہیں تھا۔ ایک ریل گاڑی گزری تو میز اور جگ میں موجود پانی ہولے ہولے مرتعش ہونے لگے۔ جب ہم اپنے سنگترے کھا رہے تھے تو ہم نے واقعی لفٹ کی آواز سنی جو ہمارے قریب آتے آتے ہمارے پاس سے گزر کر دادی والی سے بالائی منزل کو چلی گئی۔ "وہ اُوپر چلی گئی ہے۔" امّی بولیں۔

کھانا کھانے کے بعد وہ بولیں۔ "اپنی اپنی رکابیاں باورچی خانے میں رکھ آؤ لیکن اپنے ابا کی رکابی پڑی رہنے دینا۔" ہم نے میز صاف کی۔ ہمارے ابا کی خالی رکابی میز پر دھری رہی۔

امّی پولیس سٹیشن والی کھڑکی کی طرف گئیں اور باہر تکنے لگیں۔ اچانک ہی کسی فیصلے پر پہنچ کر اُنھوں نے میرے والد کی رکابی، چاقو، کانٹا اور چمچ سمیٹا اور باورچی خانے میں لے گئیں۔ اُنھوں نے برتن نہیں دھوئے۔

"میں اُوپر تمھاری دادی کے پاس جا رہی ہوں۔" وہ بولیں۔ "آپس میں لڑنا مت۔"

بھائی اور میں نے "اُوپر اور نیچے" کا دور شروع کر دیا۔

"اُوپر۔" میں پرے دیکھتے ہوئے بولا۔

اُس نے اپنی گڈی میں سے مجھے سب سے اُوپر والی تصویر دِکھائی۔ "دُنیا کا معروف ترین پہلوان 'یوسف دِحن' نمبر ۳۴۔" وہ بولا۔ پھر اُس نے گڈی کی تہہ کو دیکھا۔ "اتاترک، نمبر ۵۰۔" اُس نے کہا۔ "تم ہار گئے۔ اب مجھے تصویر دو۔"

ہم جتنی دیر کھیلتے رہے وہ جیتتا رہا۔ جلد ہی اُس نے مجھ سے ۱۹ نمبر والا مارشل فیوزی کیکمیکس اور اتاترک کی دو تصویریں جیت لیں۔

"میں کھیل چھوڑتا ہوں۔" میں نے ناراضی سے کہا۔ "میں اُوپر امّی کے پاس جا رہا ہوں۔"

"وہ پاگل ہو جائیں گی۔"

"تم یہاں اکیلے رہنے سے خوف کھا رہے ہو ہیجوزے!"

ہمیشہ کی طرح دادی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ رات کا کھانا ختم کر چکے تھے۔ باورچن بیکر (Bekir) برتن

دھو رہی تھی۔ دادی اور چچا آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ اَمّی کھڑکی سے لگ کر کھڑی نشا تناشی چوک کی سمت دیکھ رہی تھیں۔

”اِدھر آؤ۔“ وہ اپنی نظریں کھڑکی سے ہٹائے بغیر بولیں۔ میں تیزی سے کھڑکی اور اَمّی کے درمیان خالی جگہ میں گھس گیا۔ یُوں لگتا تھا جیسے وہ جگہ خاص طور پر میرے ہی لیے خالی رکھی گئی تھی۔ میں نے اپنا جسم اُن کے بدن سے چپکایا تو مجھے اچھا لگا۔ میں بھی باہر نشا تناشی چوک کو تکنے لگا۔ اَمّی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے لگیں۔

”مجھے پتا ہے کہ تمھارے ابا گھر آئے تھے اور تم نے اُنھیں کمرے میں دیکھا تھا۔“ اُنھوں نے سرگوشی کی۔

”جی۔“

”میرے پیارے بیٹے، کیا اُنھوں نے تمھیں بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اُنھوں نے مجھے اڑھائی لیرے کا نوٹ دیا تھا۔“

ہمارے نیچے سڑک پر دُکانوں کے اندھیرے تھڑے، کاروں کی بتّیاں، اپنی معمول کی جگہ سے ٹریفک پولیس والے کی غیر موجودگی، بھیگے ہوئے سنگریزے، درختوں سے لٹکے ہوئے اشتہاری کاغذ؛ سب کے سب تنہا اور اُداس لگ رہے تھے۔ بارش شروع ہوئی تب بھی اَمّی میرے بالوں میں دھیرے دھیرے اُنگلیاں پھیر رہی تھیں۔

میں نے محسوس کیا کہ چچا اور دادی کے درمیان رکھا سدا چلتے رہنے والا ریڈیو بند پڑا تھا۔ جس سے میں خوف زدہ ہو گیا۔

”میری پیاری بیٹی، وہیں مت کھڑی رہو۔“ کچھ دیر بعد دادی بولیں۔ ”براہِ مہربانی، یہاں آ کر بیٹھ جاؤ۔“

اِسی دوران بھائی بھی اُوپر آ چکا تھا۔

”تم دونوں باورچی خانے میں جاؤ۔“ چچا نے کہا۔ ”بیکر۔“ وہ پکارے۔ ”اِنھیں گیند بنا دو تا کہ یہ بڑے کمرے میں فٹ بال کھیل لیں۔“

بیکر باورچی خانے میں برتن دھو چکی تھی۔ ”بیٹھو۔“ وہ بولی۔ وہ دادی کے کمرے کی ڈیوڑھی کے چھوٹے چھوٹے شیشوں سے اُتارے ہوئے اخباروں کو توڑ مروڑ کر گیند بنانے لگی۔ ”کیسی ہے؟“ جب گیند اُس کی مٹھی جتنی بڑی بن گئی تو اُس نے پُوچھا۔

”تھوڑی سی اَور بڑی۔“ بھائی بولا۔

بیکر نے گولے کے گرد اخبار کے چند اَور ٹکڑے لپیٹ کر اُسے موٹا کر دیا۔ اگرچہ دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا

لیکن میں نے دیکھ ہی لیا کہ امّی، دادی اور چچا کے پاس بیٹھی تھیں۔ ہیکر نے دراز سے سُتلی لے کر اخباری گیند کے گرد اگرد مضبوطی سے لپیٹ کے اُسے بالکل گول کر دیا اور پھر گانٹھ باندھ دی۔ اخبار کے نکلے ہوئے کونوں کو ٹھیک طور پر بٹھانے کے لیے اُس نے گیند پر گیلا کپڑا پھیر دیا۔ بے اختیار ہو کر بھائی نے اُسے جھپٹ لیا۔

''اوے لڑکے، یہ تو پتھر کی طرح سخت ہے۔''

''اپنی اُنگلی یہاں رکھو۔'' ہیکر نے کہا۔

بھائی نے اُنگلی اُس جگہ رکھی جہاں سُتلی باندھی گئی تھی تو ہیکر نے آخری گانٹھ باندھ کر گیند مکمل کر دی۔ بھائی نے اُسے ہَوا میں اُچھالا اور ہم اُسے ٹھوکریں مارنے لگے۔

''باہر ڈیوڑھی میں جاؤ۔'' ہیکر بولی۔ ''تم یہاں ہر چیز توڑ ڈالو گے۔''

ہم بہت دیر تک جوش و خروش سے کھیلتے رہے۔ میں نے خود کو فینر باہچے (Fenerbahce) کا بائیں طرف کھیلنے والا کھلاڑی تصور کیا اور یہ کہ اُسی کی مانند اپنے ہر مخالف کو ڈاج کر سکتا ہوں۔ دیوار کے قریب سے گیند کو ٹھوکر مارتے ہوئے میں اپنے بھائی کے دُکھتے ہوئے بازو سے ٹکرا بیٹھا۔ اُس نے بھی میرے ایک لگائی لیکن مجھے ذرا بھی درد محسوس نہیں ہوا۔ ہم پسینے میں شرابور تھے اور گیند بکھرنے لگی تھی۔ جب میں اُس کے بازو پر گرا تو میں نے اُسے تین چار جڑ بھی دیں۔ وہ زمین پر گر کر چلّانے لگا۔ ''جب یہ ٹھیک ہو جائے گا تو میں تمھیں قتل کر دوں گا۔'' وہ اپنی جگہ پر پڑے پڑے بولا۔

میں نشست گاہ میں غوطہ لگا گیا۔ دادی، امّی اور چچا اپنی ہی سوچوں میں مستغرق تھے۔ دادی فون کی طرف گئیں اور کوئی نمبر گھمانے لگیں۔

''ہیلو پیارے۔'' اُنھوں نے وہی مدہم لہجہ اپنایا جو وہ میری ماں کو ''میری پیاری بیٹی'' کہتے ہوئے اپنایا کرتی تھیں۔ ''کیا یہ یشِلکوئے ایئر پورٹ ٹرمینل ہے؟ ہاں پیارے، ہم ایک مسافر کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں جو ابھی کسی جہاز سے یورپ گیا ہے۔'' اُنھوں نے میرے والد کا نام بتایا اور ٹیلی فون کی تار کو اپنی اُنگلی کے گرد لپیٹتے ہوئے انتظار کرنے لگیں۔ ''جا کر میرے لیے سگریٹ لاؤ۔'' اُنھوں نے میرے چچا سے کہا۔ جب وہ کمرے سے چلا گیا تو دادی نے ریسیور کو اپنے کان سے ذرا سا ہٹا لیا۔

''میری پیاری بیٹی، براہِ مہربانی۔'' وہ امّی سے بولیں۔ ''کیا تم جانتی ہو کہ کسی اَور عورت کا معاملہ ہے؟''

میں اپنی ماں کا جواب سن نہیں پایا۔ دادی نے اُس بارے میں یہی سمجھا جیسے اُنھوں نے کچھ بھی نہ کہا ہو۔ فون کی دُوسری طرف والے شخص نے کچھ کہا تو دادی نے طیش بھرے لہجے میں چچا سے، جو اپنے ہاتھ میں سگریٹ اور راکھ دانی پکڑے لوٹ آئے تھے، کہا۔ ''وہ مجھے جواب نہیں دے رہے ہیں۔''

چچا کے چہرے کے تاثرات سے امّی میری موجودگی سے آگاہ ہو کر چوکنّا ہو گئیں۔ اُنھوں نے مجھے بازو سے پکڑا اَور کھینچتی ہوئی بڑے کمرے میں لے گئیں۔ اُن کا ہاتھ میری گُدّی تک پھیلا ہوا تھا کہ وہ یہ تک محسوس

کر سکتی تھیں کہ میں پسینے میں کتنا بھیگا ہوا ہوں لیکن وہ مجھے سردی لگ جانے کے اندیشے سے بھی لاپروا لگ رہی تھیں۔

“امّی، میرے بازو میں درد ہو رہا ہے۔” بھائی بولا۔

“اب ہم نیچے جائیں گے اور میں تمھیں بستر پر لٹا دوں گی۔”

ہم تینوں خاموشی سے اپنی زمینی منزل پر آئے۔ بستر پر جانے سے قبل میں اپنے پاجامے ہی میں باورچی خانے میں جا کر پانی پینے کے بعد نشست گاہ کی طرف چلا گیا۔ امّی کھڑکی کے سامنے کھڑی تمباکو نوشی کر رہی تھیں۔

“ننگے پاؤں پھرنے سے تمھیں ٹھنڈ لگ جائے گی۔” وہ میرے قدموں کی چاپ سُن کر بولیں۔ “کیا تمھارا بھائی سو گیا؟”

“جی امّی، وہ سو گیا ہے۔ میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔” میں اپنے جسم کو امّی اور کھڑکی کے بیچ لانا چاہتا تھا۔ جب امّی نے میرے لیے مناسب جگہ بنا دی تو میں اُس میں گھس گیا۔ “ابّا جان پیرس گئے ہیں۔” میں بولا۔ “اور کیا آپ کو پتا ہے کہ وہ کون سا سوٹ کیس لے کر گئے ہیں؟”

وہ کچھ نہیں بولیں۔ رات کے سکوت میں ہم بارش برستی سڑک دیکھتے رہے۔

میری نانی کا گھر ششلی مسجد کے عین مقابل برقی ریل گاڑی کے آخری سٹیشن کے احاطے کے سامنے واقع تھا۔ آج کل تو ششلی چوک پر افراتفری کا سماں رہتا ہے؛ بڑی چھوٹی لاریوں کے اڈّوں، فحش بورڈوں سے ڈھکی اپارٹمنٹوں کی کئی منزلہ عمارتوں، دفاتر سے اَٹی بدنما لمبی لمبی عمارتوں اور سینڈوچ لے جانے والے فوجیوں کے جتھوں سے، جو کھانے پینے کی اشیاء پر چیونٹیوں کے غولوں کی مانند روشوں پر اُمڈ آتے ہیں۔ اُس زمانے میں وہ چوک کھلا ڈھلا، پُرسکون اور صاف ستھرا ہوا کرتا تھا۔ جس سے ہمارے گھر کا پیدل راستہ پندرہ منٹ کا تھا۔ تُوت اور لیموں کے درختوں تلے اپنی ماں کا ہاتھ تھام کر چلتے ہوئے لگتا تھا جیسے ہم شہر کے آخری سرے پر آ گئے ہوں۔

نانی کا پتھروں سے بنا ہوا چار منزلہ گھر، جس کی شکل ماچس کی ڈبیا جیسی تھی، غرب میں استنبول کے پُرانے شہر کے آخری سرے پر واقع تھا۔ اُس کی شرقی سمت میں تُوت کے باغات اور باسفورس سے پرے ایشیاء کی پہلی پہاڑیاں تھیں۔ اپنے خاوند کے چل بسنے اور تینوں بیٹیوں کی شادی کے بعد نانی گھر کے صرف ایک کمرے تک محدود ہو گئی تھیں۔ گھر زمینی منزل سے آخری منزل تک میزوں، الماریوں، لاتعداد پیانوؤں اور ٹُوٹے پھوٹے فرنیچر سے بھرا پڑا تھا۔ میری ایک خالہ؛ امّی کی بڑی بہن، اُن کے لیے کھانا تیار کرتیں اور اُسے اُن کے لیے اپنے گھر سے خُود لاتیں یا پھر ٹفن میں ڈرائیور کے ہاتھ بھجوا دیتیں۔ نانی دُوسرے کمروں میں بالکل نہیں جاتی تھیں، جو دھول کی گہری تہوں اور مکڑی کے ریشمی جالوں سے اَٹے پڑے تھے۔ وہ اُن کی صفائی

ستھرائی کی زحمت اُٹھانے کی کوشش تو نہیں کرتی تھیں البتہ اگر اُنھیں اپنے لیے بالائی منزل سے زمینی منزل تک کھانا لینے دو دو بار بھی جانا پڑتا تو وہ بلا سہارا بھی چلی جاتیں۔ اپنی ماں ہی کی طرح، جنھوں نے اپنی زندگی کے آخری برس لکڑی سے بنی ہوئی ایک وسیع و عریض حویلی میں تنہا بسر کی تھی، نانی بھی کسی دیکھ بھال کرنے یا گھر کا خیال رکھنے والی کو اجازت دیتیں نہ ہی کوئی خادمہ تنہائی کے دورے کے دوران اُن کے ہاتھوں پٹنے کے بعد دوبارہ کبھی اُس گھر میں داخل ہوتی۔

جب ہم وہاں پہنچے تو امّی نے دیر تک گھنٹی بجائی اور دروازے کو خوب زور زور سے پیٹا۔ بالآخر نانی نے دُوسری منزل کی مسجد کے سامنے والی زنگ آلود کھڑکی کے پٹ کھولے اور نیچے ہماری طرف گھور کر دیکھا۔ چُوں کہ اُن کی کم بصارت اُن کے لیے ناقابلِ اعتبار تھی اِس لیے اُنھوں نے ہمیں پکارنے اور اپنے ہاتھ ہلانے کے لیے کہا۔

”لڑکو، دروازے سے دُور ہٹ جاؤ تا کہ تمھاری نانی تمھیں دیکھ لیں۔“ امّی نے کہا۔ وہ بھی بلند آواز میں پکارتی اور ہاتھ ہلاتی ہوئیں ہمارے ساتھ روش کے وسط میں آ گئیں۔ ”ماں، یہ میں اور لڑکے ہیں۔ ہم لوگ ہیں۔ کیا آپ ہماری آواز سُن رہی ہیں؟“

اُن کے نرم مُسکراہٹ بھرے دمکتے چہرے سے ہمیں پتا چل گیا کہ اُنھوں نے ہمیں دیکھ اور پہچان لیا ہے۔ وہ جلدی سے واپس اندر اپنے کمرے میں گئیں، بڑی سی چابی نکالی جسے وہ ہمیشہ اپنے تکیے کے نیچے رکھتی تھیں، اُسے اخبار میں لپیٹا اور کھڑکی سے باہر ہماری طرف پھینک دیا۔ میں اور میری ماں اُسے فضا ہی میں تھام لینے کی کوشش میں آپس میں ٹکرا گئے۔

چُوں کہ بھائی کا بازو درد کر رہا تھا اِس لیے اُس نے چابی پکڑنے کی قطعاً کوشش نہیں کی۔ میں بھاگ کر روش کی طرف گیا اور اُسے اُٹھا کر امّی کو لا دیا۔ اُنھوں نے اُسے نہایت تگ و دَو سے تالے کے سوراخ میں داخل کیا۔ ہم سب نے مل کر بڑے دروازے پر اپنا زور ڈالا تو وہ کھل گیا۔ اندر اندھیرے کے ساتھ ساتھ کافی عرصے سے بند اور حُبسے ہونے کی ناگوار بُو کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ایسی بدبُو جس سے میرا کبھی کہیں پالا نہیں پڑا تھا۔ دروازے کے ساتھ دھرے کوٹ سٹینڈ پر نانا کا پشم دار کالر والا کوٹ ٹنگا تھا، لگتا تھا جیسے نانی نے اُسے چوروں کو ڈرا کر بھگانے کے لیے وہاں لٹکا رکھا ہے، اور اُس کی ایک سمت کی اُن کے بُوٹ بھی پڑے تھے جن سے مجھے ہمیشہ خوف آتا تھا۔

ہم نے دُور ہی سے اپنی نانی کو اندھیرے میں ڈوبی چوبی سیڑھی کے بالائی قدمچے پر کھڑے دیکھا جو سیدھی دو منزل اُوپر تک جاتی تھی۔ نقش و نگار والے دُھندلے شیشوں سے چھنتی روشنی میں وہ ہاتھ میں چھڑی تھامے ساکت و صامت کھڑی سایوں کا بھوت لگ رہی تھیں۔

چرچراتی ہوئی سیڑھی سے اُوپر چڑھتے ہوئے اُنھوں نے اپنی ماں سے کوئی بات نہیں کی۔[”کیسی ہو،

پیاری اَمّی؟‘‘ وہ ہر آمد کے دیگر موقعوں پر کہتی تھیں۔ ’’میں نے آپ کی کمی بہت محسوس کی، پیاری اَمّی۔‘‘ ’’موسم کافی سرد ہے، پیاری اَمّی!‘‘]۔ سیڑھی کے بالائی قدمچے پر میں نے نانی کے ہاتھ کا بوسہ لے کر اُسے اپنی پیشانی پر رکھا جو ہم تب کرتے تھے جب ہمیں اُن کی یا اُن کی کلائی پر اُبھرے ہوئے بڑے سے مسّے کو دیکھنے سے گریز کرنا ہوتا تھا۔ ایک بار پھر ہم اُن کے مُنھ میں بچ جانے والا واحد دانت، لمبی سی ٹھوڑی اور چہرے پر بال دیکھ کر دہشت زدہ ہو گئے تھے۔ اُن کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ہم اپنی ماں کے دائیں بائیں چپک کر بیٹھ گئے۔ نانی اپنی شب باشی کی لمبی سی عبا اور موٹی اُونی صدری میں اپنے بستر پر چڑھ گئیں جہاں وہ دِن کو بیشتر وقت گزارتی تھیں۔ ہماری سمت مُسکراتے ہوئے ایسی نظروں سے دیکھنے لگیں جو کہہ رہی تھیں۔ ’’ہاں تو اب میرا دِل بہلاؤ!‘‘

’’ماں، آپ کا چُولہا ٹھیک کام نہیں کر رہا۔‘‘ اَمّی بولیں۔ اُنھوں نے چمٹا اُٹھا کر چُولہے میں لکڑیاں دھریں۔

نانی کچھ دیر چُپ رہنے کے بعد بولیں۔ ’’اِسے چھوڑو۔ مجھے یہ بتاؤ کہ کیا خبریں ہیں؟ دُنیا میں کیا ہو رہا ہے؟‘‘

’’کچھ خاص نہیں۔‘‘

’’کیا تمھارے پاس مجھے بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے؟‘‘

ہمارے کچھ دیر خاموش رہنے پر نانی نے پُوچھا۔ ’’کیا تم نے کسی کو نہیں دیکھا؟‘‘

’’نہیں ماں، کسی کو نہیں۔‘‘ اَمّی نے کہا۔

’’اللّٰہ کے واسطے! کیا واقعی کوئی خبر نہیں ہے؟‘‘

وقفہ چھا گیا۔

’’نانی اماں۔‘‘ میں بولا۔ ’’ہمیں ٹیکے لگے ہیں۔‘‘

’’تمھیں؟‘‘ نانی نے اپنی نیلی آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ ’’درد ہوا تھا؟‘‘

’’میرا بازو سُوجا ہوا ہے۔‘‘ بھائی نے کہا۔

’’اوہ، میرے خُدایا!‘‘ نانی مُسکراتے ہوئے بولیں۔

ایک بار پھر طویل خاموشی چھا گئی۔ میں اور بھائی اُٹھ کر کھڑکی سے باہر دُور پہاڑ کی چوٹیوں، تُوت کے درختوں اور عقبی صحن میں مُرغیوں کا خالی ڈربہ دیکھنے لگے۔

’’مجھے سُنانے کے لیے تمھارے پاس کوئی کہانی نہیں ہے؟‘‘ نانی نے حیرت بھرے لہجے میں پُوچھا۔ ’’تم اپنی ساس کے ہاں بالائی منزل پر جاتی ہو۔ کیا وہاں کوئی نہیں آتا جاتا؟‘‘

’’کل سہ پہر دِل رُبا خاتون آئی تھی۔‘‘ اَمّی نے بتایا۔ ’’وہ بچّوں کی دادی کے ساتھ بِزیک[1] کھیلتی رہی۔‘‘

اِس پر نانی مسرور ہو کر بولیں کہ کیا ہم جانتے ہیں کہ وہ کیا کہتی ہے۔ ''وہ کہتی ہے کہ وہ محل میں پلی بڑھی ہے!''

بے شک ہم محل سے اُس کی مُراد سمجھ گئے تھے یعنی دولماباہچے (Dolmabahce) محل نہ کہ مغرب کے محلوں جیسا کوئی رنگا رنگ محل، جن کے بارے میں مَیں نے برسوں پہلے کہانیوں کی کتابوں اور اخباروں میں پڑھا تھا۔ میں بہت عرصے بعد نانی کی اِس بات میں پوشیدہ مفہوم کو سمجھ پایا کہ دِل رُبا خاتون ایک کیریے *(cariye)* تھی، سلطان کے حرم کی ایک کنیز، جس نے اپنی جوانی حرم میں گزاری اور بعد میں ایک کاروباری شخص سے شادی کر لی تھی۔ اُن کا نشانہ صرف دِل رُبا خاتون بلکہ میری دادی کی بھی توہین کرنا تھا جو دِل رُبا خاتون کی سہیلی تھیں۔ اِس کے بعد وہ اپنی باہمی دِلچسپی کے موضوع پر گفتگو کرنے لگیں جو ہمارے ننھیال آنے پر ہر بار زیرِ بحث آتا تھا: بیوگلو (Beyoglu) ضلع میں عبداللہ آفندی کے معروف اور مہنگے ترین ریستوران میں ہفتے میں ایک بار میری دادی تن تنہا دوپہر کا کھانا کھانے جاتیں اور لوٹ کر اُنھوں نے وہاں جو خوان کھائے ہوتے اُن سب میں کیڑے نکالتی تھیں۔ تیسرا باقاعدہ موضوع نانی کے اچانک سوال نے پیدا کر دیا۔ ''لڑکو، کیا تمھاری دادی تمھیں کھانے کو انگور رکھ دیتی ہیں؟''

ہم سے پہلے ہی ہماری ماں بول اُٹھیں اور جو اُنھوں نے کہا ہم نے بھی بہ یک زبان وہی دُہرا دیا۔

''نہیں، نانی اماں۔ وہ نہیں دیتی ہیں۔''

ہمیشہ کی طرح نانی نے بتایا کہ کیسے اُنھوں نے ایک باغ میں ایک بلی کو انگور پر پیشاب کرتے دیکھا تھا اور پھر اضافہ کیا کہ غالباً وہی انگور بعد میں بنا دھوئے کسی کھانے میں شامل کر کے کھلا دیا گیا ہوگا۔ اُنھوں نے مزید بتایا کہ اُنھوں نے نشانتاشی اور شِشلی کے سبزی فروشوں سے، جو اَب بھی انگور فروخت کر رہے تھے، جھگڑا کیا تھا اور اُنھیں رضامند کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ چیز فروخت کرنا بند کر دیں۔

''ماں۔'' اُمّی بولیں۔ ''لڑکے بے چین ہیں۔ یہ کھل کر بیٹھنا چاہتے ہیں۔ کیوں نہ میں اِنھیں بڑے کمرے کے پار والے کمرے کا تالا کھول دوں؟''

گھر کو چوروں کے گھس آنے سے بچانے کے لیے نانی ہر دروازے کو تالا لگا کر رکھتی تھیں۔ اُمّی نے بڑا سا سرد کمرہ کھولا جو ریل کی پٹڑیوں کا سا دِکھائی دیتا تھا۔ کچھ دیر تک ہم سب کھڑے سفید کپڑوں سے ڈھکی ہاتھ کرسیوں اور دِیوانوں، دُھول سے اَٹے زنگ آلود لیمپوں، زرد پڑے اخباروں کے ڈھیروں اور ایک کونے میں لڑکی کی آڑی کھڑی اکیلی سائیکل کے ہینڈل کی مُڑی ہوئی سلاخیں اور پھٹی ہوئی گدّی دیکھتے رہے۔ لیکن اِس بار اُنھوں نے دراز کھول کھول کر ہمیں اُس مسرت سے کوئی شے نکال کر نہیں دِکھائی جیسا وہ اپنی اچھی صحت کے ایام میں کیا کرتی تھیں۔ (''جب یہ میری ننھی سی پیاری بیٹی ہوا کرتی تھی تب تمھاری ماں یہ چپلیں پہنا کرتی تھی۔'' ''دیکھو، یہ تمھاری خالہ کے سکول کی فراکیں ہیں!'' ''کیا تم اپنی ماں کا اُس وقت کا وہ چھوٹا سا غلک

دیکھنا چاہو گے جب یہ میری ننھی سی پیاری بیٹی ہوا کرتی تھی۔")

"اگر زیادہ ٹھنڈ ہو جائے تو دُوسرے کمرے میں واپس چلے آنا۔" اُنھوں نے جاتے ہوے کہا۔

میں اور بھائی دوڑے دوڑے کھڑکی کی سمت گئے اور باہر سڑک کے پار والی مسجد اور چوک میں برقی ریل گاڑی کے ویران پڑے اسٹاپ کو دیکھنے لگے۔ پھر ہم نے اخباروں سے فٹ بال کے پُرانے کھیلوں کے احوال پڑھے۔ "میں بیزار ہو گیا ہوں۔" کچھ دیر کے بعد میں نے کہا۔ "کیا تم اُوپر یا نیچے کھیلنا چاہو گے؟"

"تمھارا دوبارہ ہارنے کا ارادہ ہے؟" بھائی اخبار سے سر اُٹھائے بغیر بولا۔ "میں اِس وقت پڑھ رہا ہوں۔"

گزشتہ شب کے کھیل کے بعد ہم صبح دوبارہ کھیلے اور بھائی مجھے مسلسل ہراتا رہا۔

"براہِ مہربانی۔"

"ایک شرط پر۔ اگر میں جیتوں تو تم مجھے دو تصویریں دو گے اور تم جیتتے ہو تو میں تمھیں ایک تصویر دوں گا۔"

"نہیں۔"

"تو میں نہیں کھیل رہا۔" بھائی بولا۔ "تم دیکھ رہے ہو کہ میں اخبار پڑھ رہا ہوں۔"

اُس نے بناوٹی انداز میں اخبار کو اُس سیاہ و سفید فلم کے جاسوس کے انداز میں تھام لیا جو ہم نے حال ہی میں آنجل تھیٹر میں دیکھی تھی۔ کچھ دیر کھڑکی سے باہر تکتے رہنے کے بعد میں نے بھائی کے وضع کردہ قواعد و ضوابط کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے اپنی اپنی جیبوں سے گڈیاں نکالیں اور کھیلنے بیٹھ گئے۔ آغاز میں مَیں جیتتا رہا لیکن پھر میں یکے بعد دیگرے سترہ تصویریں ہار بیٹھا۔

"میں ہمیشہ یُوں ہی ہار جاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم پہلے والی شرائط پر نہیں کھیلتے تو میں کھیل چھوڑ رہا ہوں۔"

بھائی نے جاسوس کی نقالی کرتے ہوے بولا۔ "میں بھی اخبار پڑھنے لگا ہوں۔"

میں کھڑکی کے پاس گیا اور احتیاط سے اپنی تصاویر شمار کرنے لگا۔ میرے پاس ۱۴۱ بچی تھیں۔ کل، ابّا جان کے جانے کے بعد، وہ ۱۸۳ تھیں! میں خُود کو اِتنا اُکتایا ہوا کیوں محسوس کر رہا ہوں؟ میں نے اُس کی شرائط مان لیں۔

مَیں نے شروع میں چند تصاویر جیتیں، پھر وہ مجھے ہرانے لگا۔ اپنے ڈھیر میں مجھ سے جیتی ہوئی تصاویر شامل کرتے ہوے اُس نے اپنے آپ کو مُسکرانے سے باز رکھنے کی کوشش کی کہ مبادا میں مشتعل نہ ہو جاؤں۔

"اگر تم چاہو تو ہم دُوسرے قواعد پر بھی کھیل سکتے ہیں۔" وہ تھوڑی دیر کے بعد بولا۔ "جو بھی جیتے گا اُسے ایک ہی تصویر ملے گی۔ اگر میں جیتوں گا تو اپنی مرضی کی تصویر لوں گا کیوں کہ میرے پاس کچھ ایسی تصاویر نہیں

ہیں جو تمھارے پاس ہیں اور تم اُنھیں کسی طور دینے کے لیے تیار نہیں ہو۔‘‘

میں نے یہ سوچتے ہوے کہ شروع میں تو میں ہی جیتوں گا اِس شرط کو تسلیم کرلیا۔ مجھے نہیں معلوم یہ کیوں کر ہوا: میں مسلسل تین بار ہار گیا اور اس کی وجہ جاننے سے پہلے ہی ۲۱ نمبر والی گریٹا گاربو کی دو اور ۷۸ نمبر والی شاہ فاروق کی ایک تصویر میرے بھائی کے پاس پہنچ چکی تھی، جنھیں میں ہارا تھا۔ میں اُن تمام کو فوری طور پر واپس جیتنا چاہتا تھا۔ پس میں نے تمام پتے اُوپر رکھ دیے تھے۔ اِس طرح میں تیزی دو ہی باریوں میں اپنی ۶۳ نمبر والی آئن سٹائن کی تصویر-- جو اُس کے پاس نہیں تھی-- ۳ نمبر والی رُومی کی تصویر، ۱۰۰ نمبر والی سارکس نذرین-- جو ممبو گم اینڈ کینڈی کمپنی کا بانی تھا-- اور کلیوپیٹرا کی تصویر نمبر ۵۱ ہار گیا تھا۔

میرا حلق خشک ہوگیا۔ اِس خوف سے کہ میں رونے نہ لگوں میں دوڑتا ہوا کھڑکی تک گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ پانچ منٹ قبل ہر شے کتنی حسین تھی! اپنے اسٹاپ کو پہنچتی ہوئی برقی ریل گاڑی، گرتے ہوے پتوں والے خزاں رسیدہ شاہ بلوط کے درختوں کے جھرمٹ میں گھری دُور واقع اپارٹمنٹوں والی عمارت، سنگریزوں پر لیٹا کاہلی سے کھجلی کرتا ہوا کتا۔ کاش! وقت ٹھیر بھی جائے۔ کاش! پانسے والے کھیل میں دوڑنے والے گھوڑنے کی مانند میں واپس پانچ منزلیں پیچھے لوٹ جاؤں تو میں اب دوبارہ کبھی اپنے بھائی کے ساتھ ’’اُوپر یا نیچے‘‘ نہیں کھیلوں گا۔

’’آؤ، ایک بار پھر کھیلیں۔‘‘ میں نے کھڑکی کے شیشے پر ٹکی پیشانی اُٹھائے بغیر کہا۔

’’میں نہیں کھیل رہا۔‘‘ وہ بولا۔ ’’تم رونے لگو گے‘‘

’’جیوات (Jewat)، میں حلف دیتا ہوں کہ میں نہیں روؤں گا۔‘‘ میں نے اُس کی طرف بڑھتے ہوے سنجیدگی سے کہا۔ ’’بس ہم ایمان داری سے کھیلیں گے جس طرح پہلے کھیلا کرتے تھے۔‘‘

’’میں اخبار پڑھ رہا ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ میں بولا۔ میں نے تصویروں کی اپنی کم پڑتی گڈی کو پھینٹا۔ ’’اُن ہی قواعد کے ساتھ جن کے ساتھ ہم نے ابھی کھیلا تھا۔ اُوپر یا نیچے؟‘‘

’’تب ٹھیک ہے لیکن رونے کی اجازت نہیں۔‘‘ وہ بولا۔ ’’اُوپر۔‘‘

’’میں جیت گیا اور اُس نے مجھے مارشل فیوزی کیکمیکس کی ایک تصویر دی جسے میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ ’’براہِ مہربانی، مجھے میری ۷۸ نمبر والی شاہ فاروق کی تصویر دے دو۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ اُس نے کہا۔ ’’یہ ہم نے طے نہیں کیا تھا۔‘‘

ہم دو بار اَور کھیلے اور دونوں بار میں ہار گیا۔ مجھے تیسری بار نہیں کھیلنا چاہیے۔ میں نے کانپتے ہوے ہاتھ سے اپنی ۴۹ نمبر والی نپولین کی تصویر اُس کے حوالے کر دی۔

’’میں کھیل چھوڑتا ہوں۔‘‘ وہ بولا۔

میں نے اُس منّت سماجت کی۔ ہم دو باریاں اَور کھیلے۔ جب میں ہارا تو میں نے اُس کی مطلوبہ تصویر دینے کی بجائے اپنی بچی ہوئی گڈی اُس کے ہاتھ پر دے ماری۔ نمبروں والے تمام پتے، ۲۸ نمبر والی مائی ڈیسٹاس (Mae Wests)، ۸۲ نمبر والی جُولز ورنیس، ۷ نمبر والی فاتح اعظم سلطان محمود اور ۷۰ نمبر والی ملکہ الزبتھ، ۴۱ نمبر والی صحافی سیلال سالک اور ۴۲ نمبر والی وولٹائرس کی تصویر، جن میں سے ہر ایک کے بارے میں مَیں نے سوچا، بمشکل چھپا کر رکھا اور پچھلے اڑھائی ماہ میں ایک ایک کر کے جمع کیا تھا، فضا میں تتلیوں کی مانند اُڑے اور بے بسی سے زمین پر گر گئے۔

کاش! میری کسی اَور مقام پر مکمل طور پر مختلف زندگی ہوتی۔ میں نانی کے کمرے میں گیا اور چُپ چاپ مُڑ کر چرچراتی ہوئی سیڑھیاں اُترتے ہوئے ہمارے ایک دُور کے عزیز کے بارے میں سوچنے لگا جو ایک انشورنس سیلز مین تھا اور اُس نے خودکشی کر لی تھی۔ میری دادی نے بتایا تھا کہ جو لوگ خودکشی کرتے ہیں اُنھیں ہمیشہ کے لیے پاتال کے ایک اندھیرے مقام میں ہمیشہ کے لیے قید کر دیا جاتا ہے اور وہ کبھی جنت میں نہیں جا سکتے۔ جب میں قریب قریب آخری قدمچوں پر پہنچا تو ٹھہر کر غور کرنے لگا۔ پھر میں پلٹا اور واپس سیڑھیاں چڑھ کر اپنی نانی کے کمرے کے ساتھ سب سے بالائی قدمچے پر بیٹھ گیا۔

"میری صحت تمھاری ساس جتنی اچھی نہیں ہے۔" میں نے نانی کو کہتے سُنا۔ "تم اپنے بچّوں کی دیکھ بھال اور انتظار کرو۔"

"لیکن ماں، میں آپ سے یہ پُوچھ رہی ہوں کہ میں بچّوں سمیت یہاں واپس آنا چاہتی ہوں۔" امّی نے کہا۔

"تم اِس گرد آلود، بُھوتوں کے بسیرے اور چور لٹیروں کی زد میں آئے ہوئے گھر میں نہیں رہ سکتیں۔" نانی نے کہا۔

"لیکن ماں، تمھیں یاد نہیں کہ ابا جان کی زندگی کے آخری برسوں میں، میری بہنوں کے بیاہ کے بعد، ہم تینوں اکٹھے یہاں کتنے خُوش و خرم رہا کرتے تھے!"

"میری پیاری مِی بزور، تم سارا دِن اپنے باپ کے پُرانے رسالے کھنگالتی رہتی تھیں۔" نانی بولیں۔

"میں بڑے چُولہے کو نچلی منزل پر دہکا دوں گی اور دو ہی دِنوں میں پُورا گھر گرم ہو جائے گا۔"

"میں نے شادی سے پہلے ہی تمھیں اُس کے بارے میں متنبہ کر دیا تھا۔" نانی بولیں۔

"خادمہ کی مدد سے گھر کی مکمل جھاڑ جھنکاڑ میں محض دو دِن لگیں گے۔"

"میں کسی چور اُچکی خادمہ کو گھر میں گھسنے کی اجازت نہیں دوں گی۔" نانی نے کہا۔ "اِس کے علاوہ تمھیں گھر کی صفائی اور مکڑی کے جالوں سے چھٹکارا پانے میں چھے ماہ لگیں گے۔ اِس دوران تمھارا خُودسر شوہر لوٹ چکا ہوگا۔"

”کیا یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟“ امّی نے پُوچھا۔

”میری نہایت می بزور، اگر تم اور بچے بھی یہاں آ کر رہنے لگو تو ہم دونوں گزارہ کیسے کریں گی؟“

”لیکن ماں، میں آپ سے کتنی ہی بار کہہ چکی ہوں کہ حکومت کے بے دخل کرنے سے قبل ہی بیبیک (Bebek) والی جائیداد فروخت کر دیں۔“

”میں خود لینڈ رجسٹرار کے دفتر جانا، دستخط کرنا اور اُن کریہہ لوگوں کو اپنی تصویر دینا نہیں چاہتی۔“

”لیکن ماں، ہم نے آپ کے پاس وکیل صرف اِسی لیے تو بھیجا تھا کہ آپ کو اِس جھنجھٹ میں نہ پڑنا پڑے۔“ میری ماں کی آواز بلند ہو گئی۔

”مجھے اُس وکیل پر ذرا بھی اعتبار نہیں آیا تھا، بالکل بھی نہیں۔“ نانی نے کہا۔ ”اُس کے چہرے ہی سے لگتا تھا کہ وہ ایک دھوکے باز شخص ہے۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں کہ وہ واقعی وکیل بھی تھا۔ اور ہاں، مجھ سے اُونچی آواز میں بات مت کرو۔“

”ٹھیک ہے، اب میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی۔“ امّی بولیں۔ اُس نے پکارا۔ ”بچو، تیار ہو جاؤ۔ جلدی کرو۔ ہم چل رہے ہیں۔“

”ٹھیرو، تم کہاں جا رہے ہو؟“ نانی نے پُوچھا۔ ”ہم نے ابھی باتیں تو کی ہی نہیں ہیں۔“

”آپ کو ہماری ضرورت نہیں ہے۔“ امّی نے سرگوشی کی۔

”یہ لو، بچوں کے لیے کچھ مٹھائی خرید لینا۔“

”اِنھیں دوپہر کے کھانے سے قبل کسی شے کی ضرورت نہیں ہے۔“ امّی بولیں اور میرے پیچھے پیچھے بڑے ہال کے پار والے کمرے کی طرف چلنے لگیں۔ ”یہ تصویریں کس نے بکھیری ہیں۔ اِنھیں فوراً اُٹھاؤ۔ تم اِس کی مدد کرو۔“ اُنھوں نے بھائی سے کہا۔

ہم خاموشی سے معروف ہستیوں کی تصویریں اُٹھانے لگے تو امّی پُرانے دراز کھول کر اپنے بچپن کے لباس دیکھنے لگی: اُن کا رقص والا لباس، فرشتوں والا لباس اور دراز کے اندر رکھی ہوئی ہر شے۔ پیڈل والی سلائی مشین کے ڈھانچے تلے سے دُھول میرے نتھنوں میں گھس گئی جس سے میری آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

جب ہم حجرے میں اپنے ہاتھ دھو رہے تھے تو نانی نے نرم اور لجاجت بھری آواز میں کہا۔ ”می بزور، تم اپنی نہایت پسندیدہ چائے دانی کیوں نہیں لے لیتیں؟ تم اِس کی حق دار ہو۔ میرے نانا -- جو نہایت عمدہ انسان تھے -- جب وہ دمشق کے گورنر تھے تو اِسے میری ماں کے لیے لائے تھے۔ یہ اصل چینی کی ہے۔ براہِ مہربانی، اِسے لے لو۔“

”پیاری ماں، مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہیے۔“ امّی بولیں۔ ”اِسے واپس الماری میں رکھ دیں۔ کہیں آپ اِسے توڑ نہ بیٹھیں۔ بچو، آؤ، اپنی نانی کے ہاتھ پر بوسہ دو۔“

”لیکن نہایت ہی پیاری می بڑور، اپنی بے کس ماں سے ناراض ہونے کے بارے میں سوچنا بھی مت۔“ نانی ہمارے بوسوں کے لیے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولیں۔ ”براہِ مہربانی، میں تمھاری منت کرتی ہوں۔ یہاں آنا جانا ترک کر کے مجھے تنہا مت چھوڑنا۔“

ہم سرعت سے سیڑھیاں اُترے اور تینوں نے مل کر آہنی دروازہ کھولا۔ تیز دھوپ سے ہماری آنکھیں چندھیا گئیں اور ہمارے پھیپھڑے تازہ ہَوا سے بھر گئے۔

”دیکھ لو کہ تم نے دروازہ ٹھیک سے بند کر دیا ہے۔“ بالائی منزل سے نانی پکاریں۔ ”می بڑور، اِسی ہفتے ایک بار پھر آ کر رہنا، ٹھیک ہے؟“

ہم اپنی ماں کے ساتھ خاموشی سے چل پڑے۔ برقی ریل گاڑی کے چلنے تک ہم چُپ چاپ بیٹھے دُوسرے مسافروں کی کھنگاریں سنتے رہے۔ جیسے ہی گاڑی چلی تو میں اور بھائی یہ بہانہ تراش کر کہ ہم کنڈکٹر کو دیکھنا چاہتے ہیں نشستوں کی اگلی قطار پر چلے گئے اور ”اُوپر یا نیچے“ کھیلنے لگے۔ میں نے اپنی گنوائی ہوئی چند تصاویر واپس جیت لیں۔ میں نے گڈی کو اُوپر کیا اور تیزی سے ہارنے لگا۔ عثمان بے کے اسٹاپ پر بھائی نے گڈی چھینٹی۔ ”اگر میں جیتا تو تمھاری ساری گڈی میری اگر ہارا تو تم اپنی مرضی سے پندرہ تصویریں لے لینا۔“

ہم کھیلنے لگے۔ میں نے دو تصویریں چھپاتے ہوئے ساری گڈی اُس کے حوالے کر دی۔ میں پچھلی قطار پر جا کر ماں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں رویا نہیں۔ بس اپنی ماں کی مانند افسردگی سے اندر ہی اندر گریہ کرتے ہوئے رفتار پکڑتی ہوئی گاڑی کی کھڑکی سے باہر تیزی سے گزرتے اور غائب ہوتے لوگوں اور درختوں کو تکنے لگا-- یورپ سے برآمدی کپڑوں کے رنگا رنگ تھانوں سے بھری ہوئی درزیوں کی بہ کثرت دُکانیں، ایک ہی جیسی کھڑکیوں والی مٹھائی کے دُکانوں کے دھوپ سے اُڑے رنگوں اور بارشوں سے چیتھڑے بنے تنبو، الماریوں میں نفاست سے سجی ڈبل روٹیوں والی بیکریاں، تان فلم تھیٹر کی اندھیری ڈیوڑھی، جہاں ہم نے قدیم رُوم کی فلمیں دیکھی تھیں جن میں دیویوں سے زیادہ حسین وجمیل کنیزوں کی بھرمار ہوتی تھی، سینما کے سامنے والی سڑک جہاں بے گھر بچے مزاحیہ کتب بیچتے تھے، نوکیلی مونچھوں اور تیز دھار قینچیوں والا حجام جس سے مجھے ہمیشہ خوف آتا تھا اور ایک نیم عریاں مقامی شخص جو ہمیشہ حجام کی دُکان کے دروازے سے لگا کھڑا رہتا تھا۔

ہم ہاربیے (Harbiye) کے اسٹاپ پر گاڑی سے اُترے۔ گھر لوٹتے ہوئے بھائی کے چہرے کی آسودہ مُسکراہٹ نے مجھے پاگل کر دیا۔ میں نے جیب سے لنڈبرگ کی چھپائی ہوئی تصویر نکالی۔

اُس نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا۔ ”نمبر ۹۱۔ لنڈبرگ“۔ اُس نے استعجاب سے پڑھا۔ ”اُس نے جہاز کے ذریعے بحرِ اٹلانٹک پار کیا تھا! یہ تمھیں کہاں سے ملی؟“

”میں نے کل ٹیکہ نہیں لگوایا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”میں سکول سے جلد لوٹ آیا تھا اور ابا جان کے جانے سے پہلے اُن سے ملا تھا۔ اُنھوں نے مجھے یہ خرید کر دی تھی۔“

”اِس کا مطلب ہے کہ اِس میں میرا آدھا حصہ ہے۔“ وہ بولا۔ ”اِس کے علاوہ پچھلی باری ہم نے تمھاری تمام تصویروں کے لیے کھیلی تھی۔“ اُس نے میرے ہاتھ سے تصویر چھیننے کی کوشش کی لیکن وہ اتنا پھرتیلا ثابت نہیں ہوا۔ اُس نے میری کلائی پکڑ کر مروڑ ڈالی۔ میں نے اُس کی ٹانگ پر ٹانگ ماری۔ ہم لڑنے لگے۔

”بند کرو!“ ماں چلّائی۔ ”تم دونوں جھگڑنا بند کرو! ہم سڑک کے بیچوں بیچ ہیں۔“

ہم نے لڑنا بند کیا۔ سُوٹ اور ٹائی پہنے ایک مرد اور شان دار ہَیٹ والی ایک عورت قریب سے گزرے۔ میں پریشان ہو گیا کہ ہم لوگوں کے سامنے جھگڑے تھے۔ میرا بھائی دو قدم آگے بڑھا اور لڑکھڑا کر گھٹنوں کے بَل گر گیا۔ ”بہت درد ہو رہا ہے۔“

”اُٹھو۔“ اُمّی نے ناراضی کا اظہار کیا۔ ”فوراً اُٹھو۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔“

بھائی اُٹھا اور جنگ پر مبنی فلم کے زخمی ہیرو کی مانند لنگڑاتے ہوئے چلنے لگا۔ میں پریشان ہو گیا کہ وہ واقعی زخمی نہ ہو گیا ہو لیکن میں اُسے اِس حالت میں دیکھ کر مسرور بھی تھا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی سے چلنے کے بعد وہ بولا۔ ”گھر پہنچ کر تم سے اِس کا بدلہ لوں گا۔“ وہ اُمّی کی طرف مُڑا اور کہنے لگا۔ ”اُمّی، علی نے ٹیکہ نہیں لگوایا۔“

”اُمّی، میں نے لگوایا ہے۔“

”ہُش۔“ وہ چیخیں۔

ہم اپنے گھر کے سامنے پہنچ گئے تھے۔ سڑک پار کرنے سے قبل ہم مکّہ سے آنے والی گاڑی کے گزر جانے کا انتظار کرنے لگے۔ اُس کے فوراً بعد بیشِکتاش (Beshiktash) بس کے بعد ایک ٹرک اور پھر ایک ہلکے بنفشی رنگ کی ڈی سوٹو (De Soto) گزری۔ تبھی میری نظر کھڑکی سے باہر سڑک پر جھانکتے اپنے چچا پر پڑی۔ اُنھوں نے ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ وہ آتی جاتی کاروں کو دیکھ رہے تھے۔ میں کچھ دیر اُنھیں طیش بھری نگاہوں سے گھورتا رہا۔

سڑک کافی دیر سے خالی ہو چکی تھی۔ جب میں اپنی ماں کی سمت یہ دیکھنے کے لیے گھوما کہ وہ ہمارے ہاتھ تھام کر ہمیں سڑک کے پار کیوں نہیں لے جا رہی ہیں تو میں نے اُنھیں خاموشی سے آنسو بہاتے دیکھا۔

☆☆☆☆

---

[۱] bezique: تاش کا ایک کھیل۔

[۲] parsley: اجمود۔ سلاد جیسی پتوں والی ایک خُوش بُو دار سبزی جو سالن کے اُوپر سجاوٹ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اُسے علیحدہ سے کچا بھی کھایا جا سکتا ہے۔

ازابیل آلیندے

لاطینی امریکن ادب سے ترجمہ: خالد فرہاد دھاریوال

مینڈک کامُنہ

جنوب میں یہ وقت بے حد کٹھن تھا۔ یہاں اس دیس کے جنوب کی بات نہیں ہو رہی بلکہ یہ دُنیا کے جنوبی حصے کی بات ہو رہی ہے، جہاں موسم کا چکر اُلٹ جاتا ہے اور بڑے دن کا تیوہار سبھی مُلکوں کی طرح سردیوں میں نہیں آتا، بلکہ غیر مہذب اور جنگلی علاقوں کی طرح سال کے بیچ میں آتا ہے۔ یہاں کا کچھ حصہ پتھریلا اور برفیلا ہے؛ دُوسری طرف انتہا تک پھیلے ہوئے میدان ہیں جو ٹیرا ڈیل فیوگو کی طرف جزیروں کی مالا میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہاں برف سے ڈھکی چوٹیاں دُور اُفق کو بھی ڈھانک لیتی ہیں اور چاروں طرف جیسے وقت کے آغاز سے موجود ایک گہری خاموشی ہوتی ہے۔ اس گہرے سناٹے کو بیچ بیچ میں سمندر کی طرف کھسکتے، سرکتے برفانی تودے ہی توڑتے ہیں۔ یہ ایک کٹھور جگہ ہے جہاں تگڑے، کھردرے لوگ رہتے ہیں۔

چونکہ صدی کی شروعات میں یہاں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جسے انگریز لوگ واپس لے جا سکیں اس لیے انہوں نے سرکار سے یہاں بھیڑیں پالنے کی منظوری لے لی اور کچھ ہی برسوں میں جانور تعداد میں اتنے زیادہ ہو گئے کہ دُور سے وہ زمین پر اُمنڈ آنے والے تیرتے ہوئے بادلوں جیسے لگتے تھے۔ وہ ساری گھاس چر گئے اور یہاں کی قدیم تہذیبوں کی سبھی عبادت گاہوں کو انہوں نے روند ڈالا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں ہرمیلنڈا اپنے عجیب و غریب کھیل تماشوں کے ساتھ رہتی تھی۔

اس بنجر میدان میں ‘بھیڑپال لمٹیڈ’ کا صدر دفتر کسی بھولی بسری عمارت سا اُگا ہوا تھا۔ وہ عمارت چاروں اطراف ایک بے تکے لان سے گھری ہوئی تھی، جسے منتظم کی بیوی قدرت کی مار سے بچانے میں لگی رہتی تھی۔ وہ عورت برطانوی سامراج کے دُور دراز کے علاقے میں زندگی گزارنے کی تلخ حقیقت سے سمجھوتہ نہیں کر پائی تھی اور اس نے کبھی کبھار ضیافت پر جانے کے موقعوں پر اپنے خاوند کے ساتھ سج دھج کر جانا جاری رکھا۔ اس کا خاوند پرانے رسم و رواج کے دائرے میں قید ایک مغموم ساتھی تھا۔ ہسپانوی زبان بولنے والے مقامی گڈریے چھاؤنی کی بیرکوں میں رہتے تھے۔ کانٹے دار جھاڑیوں اور جنگلی گلابوں کی باڑ انہیں ان کے انگریز مالکوں سے الگ رکھتی تھی۔ جنگلی گلابوں کی باڑ لگانا گھاس کے کُھلے میدانوں کی وسعت کو محدود کرنے کا ایک بیکار عمل تھا تا کہ غیر مُلکیوں کو وہاں انگلینڈ کے کومل دیہات کا بھرم ہو۔

اداروں کے دربانوں کی نگرانی میں سارے کارکن بڑی تکلیف میں رہتے تھے۔ ٹھٹھرنے والی سردی میں انہیں مہینوں تک گرم شوربہ بھی نصیب نہیں ہوتا تھا۔ وہ اتنا ہی نظر انداز جیون گذارتے تھے جتنی ان کی بھیڑیں۔ شام کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی گٹار اٹھالیتا اور فضا میں رنجیدہ گیت تیرنے لگتے۔ پیار کے وہ اتنے محتاج ہو گئے تھے کہ وہ اپنی بھیڑوں، یہاں تک کہ ساحل سے پکڑی گئی سیل مچھلیوں کو بھی گلے لگا کر ان کے ساتھ سو جاتے تھے، حالاں کہ باورچی ان کے کھانے میں شورہ چھڑکتا تھا تا کہ ان کی جسمانی حدت اوران کے جوش و جذبے کی آگ ٹھنڈی ہو جائے۔ سیل مچھلیوں کے بڑے پستان انہیں دودھ پلانے والی ماں کی یاد دلاتے اور اگر وہ زندہ، گرم اور دھڑکتی سیل مچھلی کی کھال اتار لیتے تو محبت سے محروم شخص اپنی آنکھیں بند کر کے ایسا تصور کر سکتا تھا کہ اس نے کسی جل پری کو آغوش میں لے لیا تھا۔ اتنی رکاوٹوں کے باوجود کارکن اپنے مالکوں سے زیادہ مزے کرتے تھے، اور اس کا سہرا ہرمیلنڈا کے ناجائز کھیل تماشوں کے سر ہے۔

ہرمیلنڈا اس پورے علاقے میں اکیلی چھوکری تھی، اگر ہم اس انگریز عورت کو چھوڑ دیں جو خرگوشوں کا شکار کرنے کے لئے اپنی بندوق اٹھائے گلابوں کی باڑ کو پار کر کے اس علاقے میں گھومتی رہتی تھی۔ ایسے میں بھی آدمیوں کو اس انگریز عورت کے ٹوپی سے ڈھکے سر کی محض ایک جھلک دکھتی تھی اور دُھول کا غبار اور خرگوشوں کا پیچھا کر رہے بھونکتے ہوئے شکاری کتے ہی نظر آتے تھے۔ دوسری طرف ہرمیلنڈا ایک ایسی دوشیزہ تھی جسے وہ جی بھر کر نہار سکتے تھے، ایک ایسی لڑکی جس کی رگوں میں جوانی کا گرم خون بہتا تھا اور جو موج مستی میں دلچسپی لیتی تھی۔ وہ کارکنوں کی دلجوئی کا کام کرتی تھی، ساتھ ہی چار پیسے بھی کما لیتی۔ اسے عام طور پر سبھی آدمی اچھے لگتے تھے جبکہ کچھ آدمیوں میں اس کی خاص دلچسپی تھی۔ ان کارکنوں اور چرواہوں کے درمیان اس کا درجہ کسی مہارانی جیسا تھا۔ اسے ان کے کام اور چاہت کی چاشنی سے پیار تھا۔ ان کی کھردری آواز، بڑھی ہوئی داڑھی والے ان کے گال، ان کے جھگڑالو لیکن مخلصانہ رویے، اسے ان سب سے پیار تھا۔ وہ اپنے گاہکوں کی خطا پذیر طاقت اور نزاکت سے واقف تھی لیکن اس نے کبھی بھی ان کمزوریوں کا فائدہ نہیں اٹھایا تھا؛ اس کے ٹھیک اُلٹ وہ ان دونوں ہی چیزوں سے متاثر تھی۔ لطافت کے یہ دستیاب عناصر اس کے ہیجان انگیز رویے کو نرم بناتے تھے۔ اکثر رات کے وقت وہ کسی ضرورت مند کارکن کی پھٹی قمیص سلائی کر رہی ہوتی یا کسی بیمار چرواہے کے لئے کھانا بنا رہی ہوتی یا دور کہیں رہتی کسی مزدور کی محبوبہ کے لئے محبت نامہ لکھ رہی ہوتی۔

چونے والی ٹین کی چھت کے نیچے ہرمیلنڈا نے ایک اون بھرا گدا بچھا رکھا تھا جس کے سہارے وہ چار پیسے کما لیتی تھی۔ جب تیز ہوا چلتی تو وہ ٹین کی چھت سارنگی اور شہنائی جیسے سازوں کی ملی جلی آواز نکالتے ہوئے بجنے لگتی۔

ہرمیلنڈا گداز جسم والی لڑکی تھی جس کی جلد بے داغ تھی؛ وہ دل کھول کر ہنستی تھی اور اس میں غضب کا تحمل تھا۔ کوئی بھیڑ یا کھال اتاری گئی سیل مچھلی کارکنوں کو اتنا لطف نہیں دے سکتی تھی۔ ہم آغوشی کے لمحات میں بھی وہ

ایک سرگرم اور زندہ دل دوست کی طرح پیش آتی تھی۔ کسی گھوڑے جیسی اس کی گٹھی ہوئی جانگھوں اور سڈول چھاتیوں کی خبر چھ سو کلومیٹر میں پھیلے اس پورے جنگلی خطے میں مشہور ہو چکی تھی، اور دُور دراز سے عشاق میلوں کا سفر کر کے اس کے ساتھ وقت گذارنے کے لئے یہاں آتے تھے۔ جمعے کے دِن دُور دُور سے گھڑ سوار اتنے اشتیاق سے وہاں پہنچتے کہ ان کے گھوڑوں کے دہن سے جھاگ نکل رہا ہوتا۔ انگریز مالکوں نے وہاں شراب پینے پر پابندی لگا رکھی تھی لیکن ہرمیلنڈا نے غیر قانونی طریقے سے شراب بنانے کا طریقہ ڈھونڈ لیا تھا۔ یہ شراب اس کے مہمانوں کے ولولے اور جوش کو تو بڑھا دیتی تھی مگر ان کے جگر کا بیڑا غرق کر دیتی تھی۔ اسی کی مدد سے رات کو دِل لگی کے وقت لالٹینیں بھی جلائی جاتی تھیں۔ پینے پلانے کے تیسرے دور کے بعد شرطیں لگنی شروع ہو جاتی تھیں، جب آدمیوں کے لئے اپنے حواس قابو کر پانا یا ٹھیک سے کچھ بھی سوچ پانا ناممکن ہو جاتا تھا۔

ہرمیلنڈا نے بنا کسی کو دھوکا دیئے منافع کمانے کی ایک پکی ترکیب بنا رکھی تھی۔ تاش اور پانسے کے کھیلوں کے علاوہ سبھی اشخاص کئی دیگر کھیلوں پر بھی اپنے ہاتھ آزما سکتے تھے۔ ان کھیلوں میں جیتنے والوں کو انعام کے طور پر خود ہرمیلنڈا کا ساتھ ملتا تھا۔ ہار جانے والے آدمی اپنے روپے پیسے ہرمیلنڈا کو سونپ دیتے۔ حالانکہ جیتے ہوئے آدمیوں کو بھی یہی کرنا پڑتا تھا مگر انہیں ہرمیلنڈا کے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے اپنا من بہلانے کا حق مل جاتا تھا۔ وقت کی پابندی ہرمیلنڈا کی خواہش کی وجہ سے نہیں تھی۔ دراصل وہ اپنے کام کاج میں اتنا مصروف تھی کہ اس کے لئے ہر کسی کو الگ سے زیادہ وقت دے پانا ممکن نہیں تھا۔ 'اندھا مرغا' نامی کھیل میں کھلاڑیوں کو اپنی پتلونیں اتار دینی ہوتی تھیں، حالانکہ وہ اپنی جیکٹ ٹوپیاں اور بھیڑ کی کھال سے بنے جوتے پہنے رکھ سکتے تھے کیونکہ انٹارکٹکا کی کپکپی طاری کر دینے والی ٹھنڈی ہوا سے بچنا ضروری تھا۔ ہرمیلنڈا سبھی آدمیوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیتی اور پھر پکڑم پکڑائی کا کھیل شروع ہو جاتا۔ کبھی کبھی اس پکڑ دھکڑ سے ہونے والا شور اس حد تک بڑھ جاتا کہ وہ رات کی خاموشی کو چیرتا ہوا آرام سے بیٹھے اس انگریز میاں بیوی کے کانوں میں بھی جا پڑتا، جو سونے سے پہلے سری لنکا سے آئی اپنی آخری چائے پی رہے ہوتے۔ حالانکہ دونوں میاں بیوی مزدوروں کا یہ شہوانی ہلاگلا سننے کے بعد بھی ایسا ظاہر کرتے جیسے وہ شور میدانی علاقے میں چلنے والی تیز ہوا کی سائیں سائیں کا ہو۔ جو پہلا شخص آنکھوں پر پٹی بندھے ہونے کے باوجود ہرمیلنڈا کو پکڑ لیتا، وہ خود کو خوش قسمت سمجھتا اور اسے اپنی آغوش میں لے کر کسی جیتتے ہوئے مرغے کی طرح ککڑوکوں کرنے لگتا۔

جھولے والا کھیل بھی اُن کا بے حد پسندیدہ تھا۔ ہرمیلنڈا رسیوں سے چھت سے لٹکے ایک تختے پر بیٹھ جاتی۔ آدمیوں کی بھوکی نگاہوں کے درمیان ہنستی ہوئی وہ اپنی ٹانگوں کو اس قدر پھیلا لیتی کہ وہاں موجود سبھی لوگوں کو یہ پتہ لگ جاتا کہ اس نے اپنے پیلے لہنگے کے نیچے کچھ نہیں پہن رکھا۔ سبھی کھلاڑی ایک قطار بنا لیتے۔ انہیں ہرمیلنڈا کو حاصل کرنے کا صرف ایک موقع ملتا۔ ان میں سے جو بھی کامیاب ہوتا وہ خود کو اس حسینہ کی رانوں کے بیچ دبا ہوا پاتا۔ جھولے جھولتے ہوئے ہی ہرمیلنڈا اسے اپنے لہنگے کے گھیرے میں لے کر ہوا میں

اٹھا لیتی۔ لیکن اس آنند کی سرخوشی محض چند آدمیوں کو ہی ملتی؛ کئی کھلاڑی اپنے ساتھیوں کی بلہ بازی کے بیچ ہار کر فرش پر لڑھک جاتے۔

'مینڈک کا مُنہ' نامی کھیل میں تو کوئی بھی آدمی اپنے پورے مہینے کی تنخواہ صرف پندرہ منٹوں میں ہار سکتا تھا۔ ہرمیلنڈا چاک سے فرش پر ایک لکیر کھینچ دیتی اور چار قدم دُور ایک دائرہ بنا دیتی۔ اس دائرے میں وہ اپنے گھٹنے پھیلا کر پیٹھ کے بل لیٹ جاتی۔ لالٹینوں کی روشنی میں اس کی ٹانگوں کا رنگ سنہرا لگ رہا ہوتا۔ پھر اس کے جسم کا نیم اندھیرا بد قسمت کھلاڑیوں کو کسی کھلے پھل سا دکھنے لگتا۔ یہ کسی پُرسکون مینڈک کے مُنہ جیسا بھی لگتا، جبکہ کمرے کی ہوا مستی سے بوجھل اور گرم ہو جاتی۔ کھلاڑی چاک سے کھینچی گئی لکیر کے پیچھے کھڑے ہو کر باری باری اپنے سکے حدف کی طرف پھینکتے۔ ان آدمیوں میں سے کچھ تو ماہر نشانہ باز تھے جو پوری رفتار سے دوڑ رہے کسی ڈرے ہوئے جانور کو اپنے مشاق ہاتھوں سے اس کی دو ٹانگوں کے بیچ پتھر مار کر اسی پل وہیں کا وہیں روک سکتے تھے۔ لیکن ہرمیلنڈا کو جُل دینے والا ایک طریقہ آتا تھا۔ وہ اپنے جسم کو بڑی چالاکی سے ادھر اُدھر سرکاتی رہتی تھی۔ ٹھیک آخری وقت ایسے پھسلتی کہ سکہ نشانہ چوک جاتا۔ جو سکے دائرے کے درمیان گرتے وہ اس کے ہو جاتے۔

اگر کسی خوش قسمت آدمی کا نشانہ بہشت کے دروزے پر لگ جاتا تو اس کے ہاتھ جیسے کسی شہنشاہ کا خزانہ لگ جاتا۔ جیتا ہوا کھلاڑی پردے کے پیچھے ترنگ میں ہرمیلنڈا کے ساتھ دو گھنٹے بتا سکتا تھا۔ جن مٹھی بھر لوگوں کو یہ موقع ملا تھا وہ بتایا کرتے تھے کہ ہرمیلنڈا اہم بستری کے قدیم خُفیہ راز جانتی تھی۔ وہ اس کام کے دوران کسی آدمی کو موت کے کنارے تک لے جا کر اسے ایک آزمودہ کار اور عقلمند شخص کے رُوپ میں واپس لوٹا لاتی تھی۔

یہ سب کُچھ تب تک ویسے ہی چلتا رہا جب تک ایک دِن پیبلو نام کا شخص وہاں نہیں آ گیا۔ چند سکوں کے عوض صرف کچھ ہی لوگوں نے کامل سرخوشی کی ان چند ساعتوں کا لُطف اٹھایا تھا، حالانکہ کئی دیگر لوگوں نے اپنی پوری دولت لٹانے کے بعد جا کر وہ سُکھ بھوگا تھا۔ حالانکہ تب تک ہرمیلنڈا نے بھی اچھی خاصی رقم اکٹھی کر لی تھی، مگر یہ کام چھوڑ کر عام زندگی جینے کا خیال اسے کبھی نہیں آیا۔ اصل میں ہرمیلنڈا کو اپنے کام میں بہت مزا آتا تھا اور اپنے گاہکوں کو فرحت دینے میں اسے فخر محسوس ہوتا تھا۔

پیبلو نام کا یہ آدمی دیکھنے میں دبلا پتلا تھا۔ اس کی ہڈیاں کسی چڑیا جیسی تھیں اور اس کے ہاتھ بچوں کی طرح تھے۔ لیکن اس کی جسمانی ساخت اس کے پُختہ عزم کے بالکل برعکس تھی۔ بھرے پُرے انگوں والی ہنس مُکھ ہرمیلنڈا کے سامنے وہ کسی چڑچڑے مرغے جیسا لگتا تھا، مگر اس کا مذاق اڑانے والے اس کو شدید مشتعل کرتے۔ غصہ دلانے پر وہ کسی زہریلے اژدہے کی طرح پھنکارنے لگتا، لیکن وہاں جھگڑا نہیں بڑھا کیونکہ ہرمیلنڈا نے یہ اصول بنا رکھا تھا کہ اس کی چھت کے نیچے کوئی لڑائی جھگڑا نہیں کرے گا۔

جب اس کا وقار قائم ہو گیا تو پیبلو بھی شانت ہو گیا۔ اس کا گمبھیر چہرہ پُرعزم دِکھنے لگا۔ وہ بہت کم بولتا تھا۔

اس کے بولنے سے یہ پتہ چلتا تھا کہ وہ یوروپی نسل کا تھا۔ دراصل پولیس والوں کو جھانسا دے کر وہ سپین سے نکل بھاگا تھا اور اب وہ انڈیز کے پہاڑی سلسلے کے تنگ دروں سے ہو کر ممنوعہ اشیاء کی تجارت کرتا تھا۔ وہ ایک بدمزاج، جھگڑالو اور تنہا آدمی کے رُوپ میں جانا جاتا تھا جو موسم، بھیڑوں اور انگریزوں کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اس کا کوئی پکا ٹھکانہ نہیں تھا اور نہ وہ کسی سے پیار کرتا تھا، نہ ہی اس پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری تھی۔ لیکن جوانی کی لگام اس کے ہاتھوں میں ڈھیلی پڑ رہی تھی اور اس کی ہڈیوں میں کھا جانے والا اکیلا پن گھسنے لگا تھا۔ کبھی کبھی جب اس برفیلے پردیس میں صبح کے سمے اس کی نیند کھلتی تو اسے اپنے انگ انگ میں درد محسوس ہوتا۔ یہ درد مسلسل گھڑ سواری کی وجہ سے پٹھوں کے اکڑ جانے کے سبب ہونے والا درد نہیں تھا، بلکہ یہ تو جیون میں دُکھ اور پہلو تہی کی مار جھیلتے رہنے کی وجہ سے ہونے والا درد تھا۔ اصل میں وہ اپنی تنہائی سے تھک چکا تھا، مگر اسے لگتا تھا کہ وہ گھریلو زندگی کے لئے نہیں بنا تھا۔

وہ جنوب کی طرف اس لئے آیا تھا کیونکہ اس نے اُڑتی سی یہ خبر سنی تھی کہ دُنیا کے آخری کونے میں دُور کہیں بیابان میں ایک نوجوان حسینہ رہتی تھی جو ہوا کے بہاؤ کی سمت بدل سکتی تھی، اور وہ اس سندری کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ لمبے فاصلے اور راستوں کے خطروں نے اس کے ارادے کو کمزور نہیں کیا اور آخر کار جب وہ ہرمیلنڈا کے مے خانے پر پہنچا اور اسے قریب سے دیکھا تو وہ اسی پل اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ وہ دونوں ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے اور اتنا طویل سفر کر کے آنے کے بعد ہرمیلنڈا کو حاصل کئے بغیر اس کا جیون بےمعنی ہو جائے گا۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھ کر ہرمیلنڈا کی چالوں کا جائزہ لیتا رہا اور اپنے امکانات کو شمار کرتا رہا۔

پیبلو کی آنتیں جیسے دھات کی تھیں۔ ہرمیلنڈا کے یہاں بنی شراب کے کئی گلاس پینے کے بعد بھی اس کے ہوش وحواس پوری طرح قائم تھے۔ اسے باقی سبھی کھیل بے حد بچکانہ لگے اور اس نے ان میں کوئی دلچسپی نہیں دکھائی۔ لیکن ڈھلتی ہوئی شام کے وقت آخر وہ ساعت آ پہنچی جس کا سب کو شدت سے انتظار تھا، مینڈک کے مُنہ کا کھیل شروع ہونے والا تھا۔ شراب کو بھول کر پیبلو بھی چاک سے کھینچی گئی لکیر اور دائرے کے پاس کھڑے آدمیوں کی بھیڑ میں شامل ہو گیا۔ دائرے میں پیٹھ کے بل لیٹی ہرمیلنڈا اسے کسی جنگلی شیرنی کی طرح حسین لگ رہی تھی۔ اس کے اندر کا شکاری جاگنے لگا اور اپنے طویل سفر کے دوران اس نے اکیلے پن کا جو درد سہا تھا، اب وہ ایک میٹھی خواہش میں بدل گیا۔ اس کی نگاہیں ہرمیلنڈا کے ان تلووں، گھٹنوں، پٹھوں اور سنہری ٹانگوں کا نظارہ کرتی رہیں جو لہنگے سے باہر قہر ڈھا رہی تھیں۔ وہ جان گیا کہ اسے یہ سب حاصل کرنے کا صرف ایک موقع ملے گا۔

پیبلو مقررہ جگہ پر پہنچا اور اپنے پیر زمین پر جما کر اس نے نشانہ لیا۔ وہ کوئی کھیل نہیں، اس کی ذات کا امتحان تھا۔ چاقو جیسی اپنی تیز نگاہوں سے اس نے ہرمیلنڈا کو مسحور کر دیا جس کی وجہ سے وہ حسینہ ہلنا سرکنا بھول

گئی۔ یا شاید بات یہ نہیں تھی ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آدمیوں کی اس بھیڑ میں سے شاید ہرمیلنڈا نے ہی پیبلو کو اپنے ساتھ کے لئے چنا ہو۔ جو بھی رہا ہو پیبلو نے ایک لمبی سانس لی اور اپنا پورا دھیان مرتکز کر کے اس نے حدف کی طرف سکہ اچھال دیا۔ سکے نے نصف چاند کا راستہ پکڑا اور بھیڑ کے سامنے ہی سیدھا نشانے پر جا لگا۔ اس کارنامے کو تحسین اور رشک بھری سیٹیوں سے سراہا گیا۔ بنجارہ لاپرواہی سے تین قدم آگے بڑھا اور اس نے ہرمیلنڈا کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ دو گھنٹوں کی مدت میں وہ یہ ثابت کرنے کے لئے تیار لگ رہا تھا کہ ہرمیلنڈا اس کے بنا نہیں رہ سکتی۔ وہ اسے لگ بھگ کھینچتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔ بند دروازے کے باہر کھڑے آدمیوں کی بھیڑ شراب پیتی رہی اور دو گھنٹے کا وقت بیتنے کا انتظار کرتی رہی، مگر پیبلو اور ہرمیلنڈا دو گھنٹے گذر جانے کے بعد بھی باہر نہیں آئے۔ تین گھنٹے گذرے، پھر چار اور آخر پوری رات بیت گئی۔ سویرا ہوا۔ کام پر جانے کی گھنٹی بجنے لگی لیکن دروازہ نہیں کھلا۔

دونوں عاشق دوپہر کے وقت کمرے سے باہر آئے۔ بغیر دائیں بائیں جھانکے پیبلو سیدھا اپنے گھوڑے کی طرف باہر چلا گیا۔ اس نے جلدی سے ہرمیلنڈا کے لئے ایک دُوسرے گھوڑے کا اور ان کا سامان اٹھانے کے لئے ایک خچر کا بندوبست کیا۔ ہرمیلنڈا نے گھڑ سواری کرنے والی پوشاک پہنی ہوئی تھی اور اس کے پاس روپیوں اور سکوں سے بھرا ایک تھیلا تھا جو اس نے کمر سے باندھ رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک نئی طرح کی خوشی سے چمک رہی تھیں اور اس کی شہوانی چال میں سکون کی تھرکن تھی۔ سنجیدگی سے دونوں نے اپنا سامان خچر کی پیٹھ پر لاد کر باندھا۔ پھر وہ اپنے گھوڑوں پر بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔ چلتے چلتے ہرمیلنڈا نے اپنے اداس مداحوں کی طرف ہلکا سا ہاتھ ہلایا، اور پھر ایک بار بھی پیچھے دیکھے بغیر وہ پیبلو کے ساتھ دُور تک پھیلے اس بنجر میدان کی طرف چلی گئی۔ وہ کبھی واپس نہیں آئی۔

ہرمیلنڈا کی رخصتی سے پیدا ہوئی مایوسی اور اداسی مزدوروں پر اس قدر حاوی ہو گئی کہ ان کا دھیان بٹانے کے لئے بھیڑ پال لمٹیڈ کمپنی کے منتظمین کو جھولے لگوانے پڑے۔ انگریز مالکوں نے وہاں کارکنوں کے لئے تیراندازی اور نیزہ بازی کے مقابلے شروع کروائے تا کہ وہ لوگ وہاں نشانہ بازی کی مشق کر سکیں۔

یہاں تک کہ مالکوں نے مٹی سے بنا کھلے مُنہ والا ایک مینڈک بھی لندن سے درآمد کیا تا کہ سبھی کارکن لوگ سکے اچھالنے کے ہُنر میں ماہر ہو سکیں، لیکن یہ سبھی چیزیں منتظر پڑی رہیں۔ آخرکار یہ سبھی کھلونے انگریز منتظم کے مکان کے احاطے میں ڈال دیئے گئے جہاں آج بھی شام کا اندھیرا ہونے پر انگریز لوگ اپنی اُکتاہٹ دُور کرنے کے لئے ان سے کھیلتے ہیں۔

☆☆☆☆

سینٹ جان اروائن

آئرش زبان سے ترجمہ: محمد اسلم

تدفین

اگر چہ لڑکی کے گھر سے جنازہ اٹھنے کا وقت اڑھائی بجے کا تھا، اس میں شرکت کرنے والے کافی دیر سے گرجا جانے والی گلی کی نکڑ پر جمع ہو کر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ لڑکی کا گھر اس گلی کے سامنے تھا اور یوں جنازے کا سفر چند ثانیوں کا تھا۔ یہ مجمع ہمسایوں، آس پاس کی آبادیوں، اور پہاڑیوں کے لوگوں اور کھاڑی کے ان مچھیروں پر مشتمل تھا جہاں لڑکی ڈوبی تھی۔ وہاں آنے والا ہر شخص پہلے تو حادثے کی اندوہناکی کی بات کرتا اور پھر یہ بات قصبے کے مسائل کی طرف گھوم جاتی۔

جان ماہنی نے جو بیلیشانو جانے والے سڑک کی طرف سے آ رہا تھا، جیمز اوہارا کو آواز لگائی، ”کیسے ہو جیمز؟“

تیز طرار، دبلے پتلے جیمز اوہارا نے ماہنی کی طرف مڑ کر دیکھا ”گذر رہی ہے۔ سر ڈھکا ہے“ جواب ملا“ تم کیسے ہو؟“

”آہ! برا نہیں۔ خدایا! لڑکی کا سوچ کر بہت دکھ ہوتا ہے“

”سچ کہتے ہو۔ میں اسے تب سے جانتا ہوں جب وہ اتنی بڑی تھی“ یہ کہتے ہوئے وہ اپنے ہاتھ گھٹنوں تک لایا۔ ”اور پھر ہوشیار بھی۔ اتنی ہوشیار کہ تمہارے ہر سوال کا جواب تھا اس کے پاس“ ”بولتے ہوئے اس نے نظر اٹھائی اور جان میکلرگ کو آتا دیکھا“ جان یہ تم ہو؟“ اس نے کہا۔

بڑے گول چہرے اور چھوٹی چھوٹی چمکتی آنکھوں والا میکلرگ، منہ سے دھواں چھوڑتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

”واقعی بہت دکھ کی بات ہے“ اس نے اوہارا کی بات کا جواب دیا۔

”میں نے تمہیں میلے کی منڈی میں دیکھا تھا“۔ ماہنی نے کہا ”لیکن تمہاری نظر مجھ پر نہیں پڑی۔ جانور اچھے پیسوں میں بکے؟“

”ہاں ٹھیک ہی رہا۔ زیادہ بھی مل سکتے تھے اور اب کم بھی“

''تمہارے پاس ایک چھوٹا بچھڑا تھا۔ بک گیا؟''

''نہیں۔ مول کم لگا۔۔۔۔''

''اوہارا نے اس کے بازو کو چھوا اور کہا'' جنازے پر آتے ہو۔ میں نے ٹھیک سمجھا نا؟''

میکلر گ نے سڑک پار گھر کی طرف نظر دوڑائی جہاں متوفی لڑکی کا جنازہ رکھا تھا۔ ''خیر'' اس نے کہا'' میں تو یہاں بچی کی مغفرت کی دعا کے لیے آیا تھا۔ خدا اس کی روح کو سکون بخشے! '' تینوں نے اپنے ہیٹ سروں سے اٹھائے'' جنازہ کتنے بجے اٹھے گا؟'' اس نے پوچھا۔

''بات تو اڑھائی بجے کی ہو رہی تھی'' ماہنی نے جواب دیا'' لیکن میرا خیال ہے دیر ہو جائے گی۔ یقیناً، ابھی تو ڈاک بلفاسٹ بھی نہیں پہنچی ہو گی اور ڈیری سے بھی کچھ دوستوں کا انتظار ہے۔ ان کے پہنچنے تک تین تو بج ہی جائیں گے''

''لگتا کچھ ایسا ہی ہے'' جیمز اوہارا نے کہا اور پھر اس نے میکلر گ کی طرف مڑ کر کہا ''تمہیں وہ بچھڑا چاہیے''

میکلر گ نے تگوڑے تمباکو کی لمبی گٹھی کا ایک ٹکڑا دانت سے کاٹا، اسے کچھ دیر چبایا اور پھر اس کا پیلا رس سڑک کنارے تھوکتے ہوئے کہا'' ہو سکتا ہے اس بار بھی قیمت تمہارے اندازے سے کم اور میرے حساب سے زیادہ ہو؟'[

ماہنی بولا'' میں نے خود اسے سمندر میں جانے سے پہلے دیکھا۔ وہ کیسے ہنس رہی تھی اور خوش گپیاں کر رہی تھی! خدایا ہم سب کو ایسی موت سے بچانا''

''اور اس کی نعش ڈھونڈنے میں کتنا وقت لگا!''

''ہاں''

''میکلر گ چھوٹے بچھڑے کی قیمت تمہارے حساب سے پانچ پونڈ ہے؟'' جیمز اوہارا نے پوچھا

''ہاں! بلکہ اس سے کچھ اوپر''

''وہ انہیں ڈوبنے والی جگہ سے ملی'' ماہنی نے ایک داستان گو کی طرح، پرانی کہانی سنانے کے انداز میں بات جاری رکھی، ''میں تو کہتا ہوں نعش کا مل جانا ہی بڑی بات ہے''۔

''ہاں''

''وہ اونچے ہیٹ اور لمبے کوٹ والا کون ہے؟'' جیسے ہی فراک کوٹ پہنے ایک شخص نے دروازے پر دستک دی، ماہنی کے ساتھ کھڑے ایک شخص نے پوچھا۔

''میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا'' ماہنی نے جواب دی۔ ''میرا خیال ہے کوئی نووارد ہے۔ جیمز تم اسے جانتے ہو؟''

’’نہیں‘‘ اوہارا نے جواب دیا۔ ’’شائد ٹرین سے آیا ہے۔ ڈاک بھی آ گئی ہے۔

ادھر سے پیٹرک میگرا تھ بھی ڈاک کی گاڑی کے ساتھ آ رہا ہے‘‘

’’لگتا ہے تم صحیح ہو‘‘ ماہنی نے اپنی کہانی جاری رکھی ’’تم نے ڈیری کے اخبار میں اس کی خبر پڑھی۔ کافی بڑی خبر تھی۔ اور پوسٹ آفس میں تو اس کی لکھی ایک نظم بھی لگی تھی‘‘

’’ہاں میں نے پڑھی ہے۔ مکمل اور خوبصورت ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنی اچھی شاعری بھی کرتی تھی‘‘

’’آہ! اور سرکاری ملازمت میں تھی۔‘‘

’’اخبار میں لکھا تھا کہ وہ ایک بہت قابل لڑکی تھی اور اس نے ڈیری کے سکول میں بہت زیادہ انعامات جیتے۔ لازماً اس کی تربیت پر کافی خرچہ آیا ہوگا‘‘

’’ہاں وہ تو ہے لیکن انہیں اس بات کا کوئی افسوس نہیں‘‘

’’ہاں اور اس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ بچوں کو اتنی اونچائی پر نہیں لے جانا چاہیے‘‘

دروازے تک آئے دو نوجوانوں کو، جن میں سے ایک نے قیمتی پھولوں کا ہار اٹھا رکھا تھا، فوراً ہی گھر میں بلا لیا گیا۔

’’یا خدا! اس ہار کو دیکھو‘‘ جان ماہنی بولا ’’کافی قیمتی ہوگا۔‘‘

’’ہاں اور یہ دو نوجوان وائی۔ ایم۔ سی۔ اے۔ سے آئے ہیں۔ لڑکی ان میں سے ایک کے ساتھ بیاہی جانی تھی۔ تمہیں نہیں معلوم؟‘‘

’’نا۔ اور اس کا نام کیا ہے؟‘‘

’’میرا خیال ہے اس کا نام میک کریکن ہے‘‘

’’اس لڑکے کا؟‘‘

’’ہاں۔ اس کے لیے یہ صدمہ نا قابلِ برداشت ہوگا!۔ جان میکلرگ بچھڑے کے چھ پاؤنڈ دس شلنگ لو گے‘‘

’’ہاں۔ شاید۔‘‘

’’میرا خیال ہے کچھ کیتھولک بھی پھول بھیجنے پر رضامند ہوں گے۔‘‘ جان ماہنی نے کہا ’’صحیح ہے۔ موت کے معاملے میں منافقت ٹھیک نہیں تو کیا جیمز تم مجھے اس رقم کی پیشکش کرو گے؟‘‘

اوہارا گروپ سے کچھ دور آیا اور پھر تمباکو کے رس کی پچکاری چھوڑتے ہوئے بولا ’’دراصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ آیا تم یہ رقم قبول کرو گے؟‘‘

جہاں تک میرا تعلق ہے میں تمہیں پانچ پونڈ سے زیادہ نہیں دے سکتا۔‘‘

”نہیں میں یہ رقم نہیں لوں گا۔ ایسی آفر کا کوئی فائدہ نہیں“

”بہت بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا ہے“ اوہارا نے مجمع کی طرف دیکھ کر کہا ”میرا خیال ہے کافی بڑا جنازہ ہوگا“

”ہاں لیکن میں نے اس سے زیادہ بڑے جنازے دیکھے ہیں۔ جیسے ڈاکٹر کوچرین کا جنازہ۔ تمہیں یاد ہے؟ وہ ڈیڑھ گنا تھا“

”ہاں واقعی۔ تقریباً ایک میل لمبا!“

گھر کا دروازہ کھلا اور چند لوگ اندر گئے

”جنازہ اٹھنے والا ہے“ ماتھی نے کہا۔

”آہ! خدا اس کا حامی ہو۔ اس کا سفر شروع ہونے والا ہے۔ اب وہ قیامت تک سوئے گی!“

”واقعی۔ واقعی!

دروازہ آہستہ سے کھلا اور کچھ لوگ زرد رنگ کا تابوت اپنے کندھوں پر اٹھائے باہر آئے۔ گاؤں کی سڑک پر مکمل سکوت چھا گیا۔ تمام مردوں نے سروں پر سے ہیٹ اٹھائے کیتھولکس نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور مرحومہ کی روح کو ایصالِ ثواب کے لیے دعا کی۔ ادھر اُدھر کھڑی عورتیں اپنی شالوں سے منہ ڈھانپ کر رو پڑیں۔ تابوت اٹھائے لوگ سڑک سے نکل کر گرجے جانے والی گلی پر ہو لیے۔ پیچھے رہ جانے والے آہستہ آہستہ قبر کی طرف چلے۔ اس وقت گرجے کی گھنٹی دھیمے انداز میں بج رہی تھی اور میت والے گھر سے ایک عورت کے رونے اور گریہ زاری کی آواز آ رہی تھی۔

”میں تمہیں چھوٹے بچھڑے کے چھ پاؤنڈ دوں گا“ اوہارا نے کہا تب تابوت ان کے پاس سے گذر رہا تھا۔

”آہ خدا اس کی مغفرت کرے“ میکلرگ، سر اور سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے، بڑبڑایا۔ ”میں چھ پاؤنڈ دس شلنگ سے کم نہیں لوں گا“۔

”میں چھ پاؤنڈ سے زیادہ نہیں دے سکتا“

”اس قیمت پر نہیں ملے گا۔ چھ پاؤنڈ دس شلنگ میں ہی ملے گا۔“

”تمہارے ساتھ سودے بازی کرنا مشکل ہے“

”ایسا نہیں۔ جانور جوانی میں مرے یا بوڑھا ہو کر، اچھا نہیں!“

”تو تم اپنی قیمت سے نہیں ہٹو گے؟“

”نہیں!“

”جنازہ قبرستان پہنچ چکا ہے۔ میلونی کے شراب خانے پر آ جانا۔ وہاں بات کریں گے“

☆☆☆☆

فروغ فرخ زاد

منظوم ترجمہ: پرتو روہیلہ

تو آفتاب بن کے چھا گیا

ذرا یہ دیکھ تو
کہ میرا دردِ دل پگھل کے بہہ رہا ہے کس طرح
کہ سرکش و سیاہ سایہ میرے جسم کا
اسیرِ آفتاب ہو گیا ہے کس طرح
ذرا یہ دیکھ تو

تمام زندگی مری تباہ ہو کے رہ گئی
مگر شرارِ آرزو مجھے اٹھائے اپنے دوش پر
لیے چلے ہے اَوج پر
بلندیوں کے جال کی طرف، عظیم رفعتوں کی موج پر
یہ دیکھ تو کہ میرا آسمان کیسا جگمگا اٹھا ہے
نور نور ہو گیا

تو آیا تھا تو کتنی دور سے
سلطنتِ عطر سے، سرزمینِ نور سے
یہ کیا غضب کیا، بٹھا دیا مجھے
عاج کی بلور کی، بادلوں کی ناؤ پر
تو میری جان اب ذرا تو لے کے چل مجھے
شعر کے دیارِ رنگ، شور کے پڑاؤ پر

تو پُرستارہ راستوں پہ لے چلا مجھے
ستاروں سے بلند تر بنا دیا مجھے
ذرا یہ دیکھ تو
میں پھٹ رہی ہوں شوق کے ابال سے
اور اب ستارے چن رہی ہوں میں
سادہ لوح سرخ مچھلیوں کے تال سے

اس سے پہلے کتنی دور تھی مری زمیں
آسماں کے غرفہ ہائے نیل سے
پر اب تری صدا
دوبارہ سن رہی ہوں میں
فرشتوں کے پرِ سفید کی صدا
ذرا یہ سوچ تو کہاں پہنچ گئی ہوں میں
پہنچ گئی ہوں تا بہ کہکشاں
یہ کہکشاں ہے جاوداں و بے کراں
اور اب کہ ان بلندیوں پہ آ گئے ہیں ہم
مجھے ڈبو دے تو شراب میں
لپیٹ دے پیار کی طناب میں
طویل رات کے نصاب میں
شباب کے جنون میں
جنون کے شباب میں
مگر مجھے تو چھوڑ کر نہ جا
مجھے تو ان ستاروں سے جدا نہ کر

ذرا یہ دیکھ تو کہ شمعِ شب

پگھل کے بہہ رہی ہے کس طرح
مری سیاہ آنکھوں کی صراحیاں
تیری گرم گرم لوریوں کے سحر سے
لبالب ہوگئی میں اب شرابِ خواب سے
نظر تو کر تو میری کائناتِ عشق پر
مرے جہانِ شعر پر
تو آفتاب بن کے چھا گیا
تو آفتاب بن کے چھا گیا

(دیوانِ: تولدی دیگر، عنوان نظم: آفتاب می شود)

وہ کس کے ساتھ ہے

یہ خواب ہے یہ خواب ہے
مخمور ہے وہ نیند سے
گرم گرم ریت پر
تیز چلچلاتی دھوپ میں

اپنی نیم باز آنکھ کی
حزنیہ نگاہ سے
اک جوئبار دیکھتا ہے وہ
میری بھیگی زلف سے
گرتی اپنے جسم پر

اور اس کے جسم کی بوئے دِل فزا و آشنا
بس گئی ہے میرے جسم میں

میں شکستہ دل یہ دیکھتی ہوں اب

کہ آسمان جھک گیا ہے اس کے جسم پر
اور اس کے ہاتھ نے، نرم نرم ریت پر
سیپیوں کے درمیاں، اک سپید بے نشاں
لکیر جیسے کھینچ دی

اسی سے پیار ہے مجھے، اسی کی مجھ کو چاہ ہے
دانہ چاہتا ہے جیسے نور کو
کھیت جیسے چاہے باد کو
ناؤ جیسے چاہے موج کو
باز جیسے چاہے اوج کو
اسی کی مجھ کو چاہ ہے، اسی سے پیار ہے مجھے

اپنی نیم باز آنکھ سے
میں شکستہ دل یہ سوچتی ہوں اب
کاش میرے بازوؤں کے درمیاں
میرے پیار کی گرفت میں
عین اُس سکوت میں، ساتھ اُس خلوص کے
میرے گیسوؤں کے سائے میں
اُسی گھڑی کہ جب مرا جوان و تشنہ تن بدن
تھا جذب کر رہا تجھے
لطیف بارشوں کے درمیان
ہو جاتا تو فنا۔ ہو جاتا تو فنا

تا کہ کوئی جسم دوسرا
آنے والے وقت کے ہجوم میں
رنگ و بو سے تیرے جسم کے

بہرہ ور نہ ہو سکے، باخبر نہ ہو سکے
تا کہ کوئی دوسری، آشنا تری
نیچے تیرے جسم کے
مخمور ہو کے پیار سے کروٹیں نہ لے سکے
تیرے دل کی دھڑکنیں نہ سن سکے
تیرے دل کا راستہ نہ دیکھ لے

اپنی نیم باز آنکھ سے
خستہ دل یہ دیکھتی ہوں میں
کہ موج آب کی طرح
دور ہوتا جا رہا ہے تو، میرے کنارِ زار سے
اور افق پہ نور کی لکیر بن کے کھو گیا ہے تو

کون کس طرح سے عشق کو
بندِ جاوداں میں لے سکے
کیسے بوسوں کن لبوں سے پیار کو اسیر کر سکے
کس گھڑی میں کن شبوں میں اس کو قید کر سکے

میں کہ مٹتی جا رہی ہوں اب
وقت کی طرح
فصل کی طرح
اک شکستہ آشیانے کی طرح
چھتوں پڑی پگھلتی برف کی طرح
یہ سوچتی ہوں، وہ بھی عاقبت اسی طرح
ہجوم سایہ ہائے تار میں
ایک کہنہ و حقیر سائے کی طرح

ہو جائے گا فنا۔ ہو جائے گا فنا

کن پروں سے اڑ کے جا سکے کوئی
دور عشق اور وقت کے زوال سے
اور کیسے آنسوؤں سے وقت کی
تیز وتند آنکھ پر اک دبیز پردہ ڈال دے

اور کس طرح سے کیسے عشق کو
بازوؤں کے زور سے
بندِ جاوداں میں باندھ لے

یہ خواب ہے، یہ خواب ہے
مخمور ہے وہ نیند سے
گرم گرم ریت پر
تیز چلچلاتی دھوپ میں

(دیوانِ: اسیر/عنوان نظم: با کدام است)

بعد مرنے کے

موت بھی آجائے گی اک دن ضرور
جب کھلی ہو گی گلستاں میں بہار
سردیوں کی خوں جماتی برف میں
یا خزاں کے پُر سکوت آہنگ میں
موت آنی ہے وہ آئے گی ضرور
میٹھے اور کڑوے دنوں میں ایک دن
عام سے بے نام و بے مصرف سے دن
آج اور کل کی طرح کے ایک دن

اور دھواں ہو جائیں گی آنکھیں مری
سرد مرمر ہوں گے میرے سرخ گال
اور اٹھا لے جائے گی باغوں میں نیند
میں وہاں ساکت پڑی رہ جاؤں گی
کیسے بے حس ہیں بیاضِ شعر پر
سحرِ شعری سے معرّیٰ میرے ہاتھ
یاد آتے ہیں مجھے وہ دن کہ جب
شعلہ زن تھے حدّتِ قلبی سے ہاتھ
خاک اب کہتی ہے آ جا میرے پاس
لوگ یکجا ہیں کہ کر دیں مجھ کو دفن
عین ممکن ہے جو عاشق تھے مرے
شب کو میری قبر پر رکھیں وہ پھول
اور مری تیرہ شبی کے سارے راز
بعد میرے وہ بھی کھو جائیں کہیں
اور کتابوں، کاغذوں میں یک بیک
نا شناس آنکھیں پناہیں ڈھونڈ لیں
بعد میرے کمرے میں آئے کوئی
یاد کو میری لگائے جان سے
آئنے میں پائے گا وہ میرا عکس
یا مری تصویر، کنگھی اور بال
چھوڑ کر ان سب کو میں باہر چلی
جو بچا ہے وہ فنا ہو جائے گا
کشتیوں کے بادبانوں کی طرح
روح بھی میری کہیں کھو جائے گی

بھاگتے ہیں روز و ہفتہ ماہ و سال
اور مجھے آتا ہے ہر دم یہ خیال
خط کا میرے کرتے کرتے انتظار
تیری آنکھیں خود ہی پتھرا جائیں گی
بھینچ لے گی جب زمیں میرا بدن
وہ بھی آخر خاک ہی ہو جائے گا
تیرے دل کی دھڑکنوں سے دور پھر
خاک میں جزوِ زمیں ہو جائے گا
اور پھر باران و باد و آفتاب
نام بھی دھو دیں گے لوحِ سنگ سے
بے نشاں ہو جائے گی پھر میری قبر
اور میں آزاد نام و ننگ سے

(دیوانِ: عصیاں/عنوان نظم: بعد ہا)

آرزو

ایک ندّی کے کنارے میں کاش
سبزہ و کاہ کی خوشبو ہوتی
تو جب اس راہ سے گزرا کرتا
میں ترے جسم کو چوما کرتی
کاش چرواہے کی بنسی کی طرح
دل کی آواز سنایا کرتی
اور جھولے میں ہوا کے بیٹھی
تیرے دروازے سے گزرا کرتی

کاش میں صورتِ خورشیدِ بہار
تیرے دروازے پہ چمکا کرتی
اوٹ سے ریشمیں پردوں کی ترے
رنگ تری آنکھوں کا دیکھا کرتی

بزمِ روشن میں تری کاش کہ میں
خندۂ جامِ شرابی ہوتی
درد آمیز صدائے شب میں
سستی و مستیِ خوابی ہوتی

تیرے چہرے سے ہنسی سے تیری
شیشۂ دل مرا جگمگ کرتا
اور پھر صبحِ بدن پر میرے
ہاتھ تو پیار سے پھیرا کرتا

اور پھر برگِ خزاں کی صورت
چاند بھی رقص کو دیکھا کرتا
اور باغیچے کے اندر تیرے
شور اک ولولہ پیدا کرتا

بن کے میں یاد کسی عورت کی
تیرے سینے میں سمٹتی جاتی
اپنی زیبائی پہ ہو کر حیراں
میں تری آنکھوں کو دیکھا کرتی

کاش اے عمر کی دیوی تو نے
غنچۂ درد کو توڑا ہوتا
اور مرے شعر کے کاشانے میں
شعلۂ راز کو دیکھا ہوتا

(دیوانِ: دیوار/عنوان نظم: آرزو)

اے ستارو

اے ستارو کہ آسماں پر سے
تم مسلسل اشارے کرتے ہو
ابر سے بھی بلند ہوتے ہوئے
دیکھتے ہو ہماری دنیا کو
میں یہاں رات کی خموشی میں
ریزہ کرتی ہوں اُس کی تحریریں
تم ذرا سی مدد کرو میری
میں بھی دامن ستاروں سے بھر لوں
ایسے دل سے نہ ہو وفا جس میں
بے کرانہ فریب بہتر ہے
ایسے خود بین آشناؤں سے
زیرکانہ روش ہی بہتر ہے
اے ستارو، یہ کیا سبب کہ مجھے
خواہشِ نغمہ و طرب نہ رہی
اے ستارو یہ کیا سبب کہ اُسے
مجھ سے الفت مری طلب نہ رہی
جامِ مے سرنگوں ہے، میں تنہا
پڑھ رہی ہوں اب اس کی تحریریں
چاہتی ہوں کہ مجھ کو مل جائیں
اُس کی الفت کی ساری تصویریں
اے ستارو تمھیں پتا ہوگا
کیسے مکّار ہیں زمیں والے

کتنے تارے ڈبوئے ہیں، ایسے
بے وفا بے اعتبار لوگوں نے
نوک پاپوش پر ہے یہ دنیا
پر مجھے اس کا پیار حاصل ہو
مجھ پہ لعنت ہے میں جو آئندہ
اب کسی دوسرے سے پیار کروں
اے ستارو کہ آنسوؤں کی طرح
دامنِ شب میں چھپ کے بیٹھے ہو
اور افلاک کے دریچوں سے
اپنی دنیا ہمیں دکھاتے ہو
جا چکا ہے وہ پر یہ دل میرا
اس کی فرقت میں اب بھی جلتا ہے
اے ستارو مجھے یہ بتلا دو
عاشقِ جاوداں کہاں ہوگا

(دیوان: اسیر/عنوان نظم: ستارہا)

آغاز محبت

تیری آنکھوں کے آسماں سے اب
ڈھل رہے ہیں ستارے شعروں میں
اور خموشی سفید کاغذ کی
کاشت کرتے ہے ہاتھ پر انگار
میرے اشعار تب گرفتہ ہیں
شرمگیں آرزو کی تندی سے
اور بھی کچھ جلا دیا آخر
بے کراں تشنگی کی آتش نے

کیوں نہ ہو ابتدائے الفت ہے
گرچہ انجام کی خبر ناپید
مجھ کو انجام کی نہیں پروا
بس یہ الفت ہی میرا حاصل ہے
اس سیاہی سے میں نہیں ڈرتی
ہیرے برساتی ہے نمی شب کی
رات ساری گزر بھی جائے اگر
اُس کے پھولوں کی باس رہتی ہے
کاش میں تجھ میں یوں سما جاؤں
لوگ ڈھونڈیں مرا نشاں نہ ملے
روح سوزان و آہِ گرم مری
میرے نغموں میں ہر جگہ گونجے
کاش میں اس کھلے دریچے سے
اپنے خوابوں کے نرم ریشم میں
روشنی کے سبک پروں اڑ کر
سرحدِ خاک سے گزر جاؤں
زندگی سے، مجھے ہے کیا درکار
میں سما جاؤں تجھ میں تو مجھ میں
زندگی گر ہزار بار ملے
تو ہر اک بار میں یہی مانگوں
موج زن مجھ میں ہے جو اک دریا
اس کو پوشیدہ کس طرح رکھوں
بے کراں ہو اگر توانائی
تب کہیں دل کا حال بتلاؤں

تجھ سے لبریز ہوں، یہ چاہتی ہوں
دشت و صحرا میں دوڑتی جاؤں
سر کو ٹکراؤں کوہساروں سے
موجِ دریا سے جا لپٹ جاؤں
تجھ سے لبریز ہوں یہ خواہش ہے
ریت کی طرح سے بکھر جاؤں
تیرے پیروں تلے رکھوں سر کو
تیری پرچھائیں سے چمٹ جاؤں
کیوں نہ ہو ابتدائے الفت ہے
اور انجام کی خبر ناپید
مجھ کو انجام کی نہیں پروا
کہ یہ الفت ہی میرا حاصل ہے
(دیوانِ: اسیر/عنوان نظم: از دوست داشتن)

اعتراف

سعی ناکام کر رہی ہوں میں
حال دل تجھ پہ آشکار نہ ہو
ناز سے جب پلک جھکاتی ہوں
دل کی بے تابیاں چھپاتی ہوں
دل گرفتارِ خواہشِ جاں سوز
چارہ جوئی مری خدا سے ہے
پارسا بن کے سامنے تیرے
زہد و توبہ کی بات کرتی ہوں

پر خدا را نہ سچ سمجھ لینا
میرا دل تو زباں کے ساتھ نہیں
میں نے جو کچھ کہا وہ جھوٹ تھا سب
خواہشِ دل میں کیسے بتلاؤں
اور تُو میرا ہم نوا ہوکر
میری باتوں پہ صاد کرتا ہے
گویا خواہش مری زباں تیری
مختلف دو جہان ہیں دونوں
تو نے شاید کبھی سنی ہو یہ بات
”نہ“ میں عورت کی ”ہاں“ ہے پوشیدہ
اپنی کمزوریاں چھپانے کو
اِن طریقوں سے مکر کرتی ہے
آہ میں بھی ہوں ایک عورت ہی
تیری چاہت میں مارتی پر و بال
تجھ پہ مرتی ہوں اے مرے ”معصوم“
دیکھتی ہوں میں تیرا خواب وِصال
(دیوانِ:دیوار/عنوان نظم:اعتراف)

☆☆☆☆

لیاقت رضوی

سندھی سے ترجمہ: شاہد حنائی

دوپہروں میں لپٹی بات

یہ کہانی آخری گولی کی نہیں ہے۔

جب بادلوں نے آسمان سے دوستی کی، وقت کی تقویم نے سال ۱۹۸۳ء کے ماہِ اگست کو جنم دیا۔ تب مَیں نے اپنے شہر کے لیے دُوسری طرح سے پریشان ہونا سیکھا۔ آنسو گیس جب میری آنکھوں کو زخمانے لگی تو مَیں نے قریب ہی واقع ہوٹل کی ماندے سے کندھے پہ رکھے رومال کو تر کر کے آنکھیں پونچھیں، (آمریت میں انسان دفاع کے نئے طریقے بھی دریافت کر لیتا ہے۔) لیکن اس سے پہلے کہ شہر میری آنکھوں کے سامنے صاف طور پر آموجود ہو، اِک اندھی گولی میری ران کا دایاں حصہ چیرتی ہوئی گزر گئی۔ جانے ران سے پار ہوئی بھی کہ نہیں! مَیں نے بے ہوش ہونے سے پہلے کسی بازو کے سہارے کو محسوس کیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تو روشنی کے ساتھ ایک شخص برف کا سفید بلاک اُٹھائے اندر داخل ہوا۔ مَیں نے آنکھیں کھولنا چاہیں، لیکن اس سے پہلے ہی رونے کی آواز میرے جسم پر گیلے کپڑوں کی طرح گرنے لگی۔ تب مجھے پتا چلا کہ اس اندھی گولی نے میری زندگی کا خاتمہ کر ڈالا ہے۔

برف دیکھ کر مَیں نے سمجھا کہ میری میت پر آنے والوں کو پانی پلانے کا بندوبست ہو رہا ہے، مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ آدمی، جس کی گردن جھکی ہوئی تھی، جس کی پشت پر وہ بلاک رو رہا تھا، وہ میری چارپائی کی طرف بڑھا اور پورے کا پورا بلاک میری چارپائی کے نیچے رکھ کر چلا گیا۔

اماں کے بین پرندوں کی مانند میرے کانوں سے ٹکرانے لگے اور بڑھتے ہوئے شور وغل میں مجھے محسوس ہوا کہ برف کی ٹھنڈک سے آہستہ آہستہ میری ہڈیاں چٹخنے لگی ہیں۔ مَیں نے کروٹ بدلنا چاہی لیکن برف نے میرے بدن کو جامد کر ڈالا تھا۔ اگرچہ میرے ہونٹ بند تھے، پھر بھی مَیں نے کہا: ''مجھے تپش کی ضرورت ہے۔'' مگر میری بات کسی نے بھی نہ سُنی، اماں نے بھی نہ سُنی۔

بابا اندر داخل ہوئے تو مَیں نے بنا حرکت کیے ہی دیکھ لیا کہ بابا کے گلے میں اَن روئی دہاڑیں مچل رہی تھیں۔ چند آنسو بابا کی آنکھوں سے نکل کر ان کی ملگجی ڈاڑھی میں سو رہے تھے۔

اگر مَیں اشک ہوتا تو شاید اس برف اور ان دہائیوں کی پناہ میں ہوتا۔

جب میرا جنازہ راستے پر پہنچا تو دُرود اور کلمے کے وِرد کے درمیان، لوگوں کے منہ سے اَن کہی باتیں سن کر مَیں پریشان ہو گیا۔ مجھے کسی بھی نوع کے کارنامے انجام دینے کا شوق قطعی نہیں تھا۔ میرا آخری سال کا نتیجہ آ چکا تھا۔ سوچا تھا کہ اب کوئی ڈھنگ کی ملازمت کر کے اماں اور بابا کی تکلیفیں اور دُکھ بانٹوں گا۔ میری قبیل کے نوجوان اپنے خواب افورڈ نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ بات مَیں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ لوگوں کی آنکھوں اور کندھوں نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ مَیں واقعی مر چکا ہوں اور مجھے بھی یہ یقین ہے کہ شہید لوٹ کر نہیں آتے، لیکن اب تو مَیں رو بھی نہیں سکتا۔

قبر میں اُتارے جانے تک مَیں خاموش ہوں اور غصّے میں ہوں۔ طیش اس بات کا نہیں ہے کہ مَیں مر چکا ہوں، تاؤ اس پر ہے کہ وہ سب میری موت کو بھی استعمال میں لانے کا سوچ رہے ہیں۔

لحد کا دہانہ ڈھانپے جانے سے قبل مَیں نے اس اندھی گولی کو ایک نام دینا چاہا، جس نے اِک جیون کی داستان تمام کر ڈالی تھی، مگر مَیں تیزی سے مٹی تلے دبنے لگا اور مَیں صرف اتنا سمجھ سکا ہوں کہ مٹی آدمی سے کبھی بھی بے زار نہیں ہوتی۔

قبر مکمل ہونے تک مجھے پتا ہی نہ چل سکا کہ میرے شہر پر کون سا موسم چھایا ہوا ہے۔

☆☆☆☆

ارشاد کاظمی

سندھی سے ترجمہ: فہیم شناس کاظمی

آئی بینک

انہیں خاص محلول میں رکھا گیا ہے
کہ وہ بھول سکیں
کہ انہوں نے کیا کیا دیکھا
کیا کیا کیا تھا
وہ کتنی دیر کھلی رہیں
اور کتنی دیر بند
انہوں نے کیسے خواب دیکھے
اور کسے چاہا
اور انہیں پھر سے سکھایا جا سکے
جاگنا، سونا
رونا، ہنسنا
دیکھنا۔ چاہنا اور خواب دیکھنا

☆☆☆☆

آثم ناتھنشاہی

سندھی سے ترجمہ: ابرار ابڑو

نظم

وہ جلدی میں
ایک لمبے
بہت لمبے
درخت پر چڑھ گیا ہے
مگر
نیچے کسی درخت سے واپس
اترنے کا
ہُنر اس کے پاس نہیں ہے
اب وہ پتوں میں
لٹک کر
خزاں کا انتظار کر رہا ہے

☆☆☆☆

وارث شاہ

پنجابی سے ترجمہ: رانا سعید دوشی

شکوہ کردن ملکی، پیش چوچک

ماں نے بھانپ کے ہیر کے شوخ دیدے، آگے باپ کے سب اظہار کیا
ٹوٹا قہر ناموس پہ مہر صاحب، بیٹی ہیر نے جگ میں خوار کیا

طعنے دیتے ہیں ایر، وغیر سارے، سارے دیس میں ننگ نظار کیا
رولی لاج سیال برادری کی، کیا پیار ، چرواہے کو یار کیا

میں نے ڈانٹا کہ ہوش کے ناخن لے، میرے ساتھ بھی چشم کو چار کیا
لعنت بھیج اب ایسے چرواہے پر، جس نے عزت کے ساتھ کھلوار کیا

ایسی بیٹی کو گڑھے میں گاڑ صاحب، دامن لاج کا جس نے تار تار کیا
چلتی کر گھر سے بے شرم بیٹی، جس نے رب کے آگے گنہگار کیا

دھائی، ایسی اولاد سے میں صاحب! والدین کو جس نے شرمسار کیا
وارث شاہ کی بات بھی دھیان سے سن، اللہ پاک نے تجھے سردار کیا

☆☆☆☆

بشریٰ ناز

پنجابی سے ترجمہ: زاہد مسعود

رنگین لفافے میں بند دلاسا

بند لفافے کے اندر
تازہ وعدوں سمیت
خوشبو میں نہایا اس کا خط
کمال فریب کاری کے ساتھ جب مجھے ملا
تو
میرے دل کے تاریک آسمان پر ستارے سے سج گئے
میں نے سوچا کہ
کوئی تو ہے
جو
جھوٹے الفاظ
پیار کا اظہار تو کرتا ہے
فریبی سہاروں کے ساتھ ہی سہی
رنگین گفتگو کے ساتھ ہی سہی

☆☆☆☆

حنیف باوا

پنجابی سے ترجمہ: عامر عبداللہ

میں اک پیڑ ہوں

میں اک پیڑ ہوں ویرانے کا
جس کے سبز اور پیلے پتے
تیز ہواؤں میں پت جھڑ کی
دھرتی پر ہیں پھیلے
میں اک پیڑ برہنہ ہوں
سوکھی جس کی شاخیں
سوکھے تن کے ساتھ کھڑا ہوں
دیکھ رہا ہوں
آگے پیچھے ----
دائیں بائیں ----
دیوانہ ہوں جیسے
ہے کیا کوئی ----؟
کیا ہے کوئی ----؟
جو مجھ لیکھوں کے مارے پر

نظریں پیار کی ڈالے
میرے من کی پیاس بجھائے
مجھ روہی کے پیڑ کو آ کر
پیار سے گلے لگائے
کیا بتلاؤں
کب سے میں بس
اُس اک بوند کو ترس رہا ہوں
جو میری پوروں میں اُترے
مجھ میں جیون بن کر دوڑے
پھر مجھ کو سرسبز کرے۔

☆☆☆☆

احمد دین طالب

پشتو سے ترجمہ: سلطان فریدی

ازل سے یہی اِک محبت نہ ہوتی
اگر ہوتی تو ساتھ فرقت نہ ہوتی

سیہ چشم نے کر دیا پارہ پارہ
دکھاتا میں دل، گر ندامت نہ ہوتی

میں جگراتا ہرگز نہ کرتا کبھی پھر
جو پہلو میں راحت کی عادت نہ ہوتی

میں ہجراں کی شدّت سے واقف نہ ہوتا
جو دیدارِ دلبر کی رغبت نہ ہوتی

میں کب سے شہیدانِ فرقت میں ہوتا
اجل تک کی مہلت عنایت نہ ہوتی

نہ ہوتا یہ طالبؔ کا جامہ بھی داغی
جو داغِ محبت کی تُہمت نہ ہوتی

☆☆☆☆

عارف تبسم

پشتو سے ترجمہ: سلطان فریدی

کشمکش

میرے دل اور میرے ذہن
کے درمیان
ایک عجیب سی کشمکش جاری ہے
میری محبت کے بارے میں میرا ذہن کہتا ہے
''یہ یک طرفہ ہے''
اور دل میرا جواب دیتا ہے
''نہیں! یہ ہرگز ایسی نہیں''

☆☆☆☆

پشتو تخلیق و ترجمہ: شاہدہ سردار

سُورا*

چمک رہی ہوں فطرت کے رخساروں پر شبنم کی طرح
ہاتھوں کی ریکھاؤں میں تنویر دکھائی دیتی ہوں
دنیا کی وحشت میں ندیا ہوں میں روشن رنگوں کی
محنت کی پیشانی پر بدقسمت بوند پسینے کی
حوا بن کر بانٹنے آئی آدم کی تنہائی کو
جنگ و جدل کے شعلوں میں مَیں امن کی فاختہ کہلائی
بابا کی عزت بن کر ناموس بنی میں بھائی کی
دونوں کے شملے کی عزت بن کر سولی چڑھ آئی
زیست کے اگلے موڑ پہ شوہر کی سنگت کو ساتھ لیے
بچوں کے روشن مستقبل کی مشعل کو ہاتھ لیے
ظلمت کی تاریک فضا میں مہروفا کا پاس لیے
’’سورا میں آئی ہے تو‘‘ بس سر پہ یہ اک بات لیے
غور کروں تو ماں ہوں میں جنت قدموں کے نیچے ہے
پر رسموں کے نوکیلے سنگریزوں سے لہولہان ہوں میں

---

* ’’سورا‘‘ پشتون قبیلوں کی ایک پرانی رسم ہے جس میں قتل کے بدلے میں قاتل کی بہن یا بیٹی سے مقتول کے خاندان کا کوئی شخص نکاح کرتا یعنی قتل کے بدلے میں لڑکی دی جاتی ہے۔

احساس کے ہر اک موڑ پہ عورت خود کو جلاتی آئی ہے
صدیوں سے عورت نے اس عزت میں ہی عظمت پائی ہے
دکھ سکھ میں ماں کی ساتھی ہوں، باپ اور بھائی کی عزت ہوں
پر ایک اندھے قانون کے ہاتھوں ظلم جہاں کے سہتی ہوں
جب قتل کرے برباد کرے، گھر دوجے کا بے حال کرے
تب جان کے لالے پڑ جائیں بھائی جو موت سے ڈر جائے
پھر عالم ہو تنہائی کا اور خوف ہو جگ ہنسائی کا
پھر عقل ٹھکانے آ جائے ہو فکر سبھی کی رہائی کا
بے بس ہو کر عزت غیرت سب کچھ ہی بھلانا پڑتا ہے
بیٹی بہن کو ’’سُورا‘‘ کی سولی پر لانا پڑتا ہے
کیا یہ انجام ہے عورت کا ’’سُورا‘‘ کے نام پہ جل جائے
کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے وہ ظالم لمحہ ٹل جائے
سُورا ہے نام جہالت کا رسوائی اور قیامت کا
یا سہمے گونگے ہونٹوں پر رقصاں کوئی حرف شکایت کا
کیا اس تہذیب کے لوگوں کا اس رسم پہ دل بھی نہیں جلتا
شرمندہ ہو کر سورج بھی جب وقت سے پہلے ڈھل جائے

☆☆☆☆

اللہ بشک بزدار

بلوچی سے ترجمہ: واحد بخش بزدار

کاروانِ مراد

محوِ خواب ہیں وطن زادے
تمام لوگ
سبھی زمانے
چُپ کے پنگھوڑے میں سو رہے ہیں
نہ کوئی لوری
نہ کوئی نغمۂ شیریں
نہ اُمید و نا امیدی کا کوئی احساس
نہ تذکرۂ غمِ دوراں
کاروانِ مراد سو گیا ہے کہیں
ئے کی نوا ماند پڑ گئی ہے
وطن محوِ خواب ہے یارو!
خردمندو!
قلم کارو!
یہ گراں خوابی تمہیں مبارک ہو
مگر مجھے کل نہ جانے
کس فرعون
کس قارون کے آگے سربسجود ہونا ہے

☆☆☆☆

منیر بادینی
بلوچی سے ترجمہ: اشرف شاد

ڈھول بتاشوں کا انجام

قتل کے عمل کو سرانجام دینے کے بعد وہ چُھپتے چھپاتے جھونپڑیوں کے قریب سے ندی میں اُتر گئے۔ پھر اُس سلسلہ کوہ کی جانب نکل گئے جوان کے سامنے دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اندھیری رات کے باعث پہاڑ نظروں سے اوجھل تھے لیکن جب انیس بیس دن کا چاند انگڑائی لینے لگا تو نظروں کے سامنے پہاڑوں کی چوٹیاں ابھرنے لگیں۔ انہی پہاڑوں کی چوٹیوں سے نکلتی روشنی کو نگاہوں میں جمائے وہ تھکے بغیر آگے بڑھتے رہے۔ اُن کے جسم پسینے سے شرابور تھے۔ لیکن وہ اُن سے بے پرواہ سورج نکلنے سے پہلے ایک ایسی محفوظ جگہ پہنچنا چاہتے تھے، جہاں تعاقب کرنے والے اُن کی دھول بھی نہ پا سکیں۔

اندھیری گھاٹی میں کافی دور جانے کے بعد نوجوان قاتل نے اپنے ساتھی بوڑھے قاتل سے سرگوشی کی، کوئی آواز سُنی تم نے؟ بوڑھا قاتل رُک گیا۔

”کیا ہُوا“ اُس نے نوجوان قاتل سے پوچھا اور کچھ سُننے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ دونوں اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔ دور کہیں ڈھول بتاشوں کی آواز آ رہی تھی۔ اگست کے مہینے کی آخری عشرے کی خنک رات تھی۔

سارا جہان خاموشی کی بانہوں میں سمٹ گیا تھا۔ صبح صادق سے پہلے چلنے والی ٹھنڈی ہوا دور دراز کی آوازوں کو گھیر گھار کر اپنے دامن میں سمیٹ کر لا رہی تھی۔ دونوں قاتل ڈھول بتاشوں کی آواز صاف سُن سکتے تھے۔ وہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ ۔ چاند کالے مہیب پہاڑوں کے پیچھے اُداس آنکھوں سے جھانک رہا تھا۔

نوجوان قاتل نے منہ میں نسوار رکھتے ہوئے کہا ”شاید کہیں شادی کی کوئی تقریب ہو“

”شاید“ اُس کے بوڑھے ساتھی نے اُس سے تپاک کرتے ہوئے کہا مگر پھر کچھ سوچ کے بولا ”ہم بہت

دور نکل آئے ہیں۔ آس پاس کوئی گاؤں یا آبادی تو نہیں کہ شادی ہو رہی ہو؟ ...... میں ان علاقوں سے بخوبی واقف ہوں۔ یہاں میں جوانی میں گلّہ بانی کیا کرتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مجھے بُری طرح پیاس لگی تھی۔ ڈھونڈنے پر بھی کوئی آبادی نہیں ملی ...... لیکن میں غلط بھی ہو سکتا ہوں۔ شاید ہم کسی آبادی کے قریب گذر رہے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے، ہم بہت دور نکل آئے ہوں“

پھر وہ آگے بڑھنے لگے۔ اب وہ ایک ڈھلوان میں چل رہے تھے۔ اُن کے پیچھے ایک پہاڑی سلسلہ پھیلا ہُوا تھا جبکہ سامنے ایک تاریک ڈھلوان اور اسی ڈھلوان کے آخری سرے سے ڈھول بتاشوں کی آواز آ رہی تھی۔ اب یہ آواز اونچی اور صاف صاف اُن کے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ دونوں قاتلوں کے قدم اُسی جانب اُٹھ رہے تھے۔

ڈُھول بتاشوں کی اُداس کرنے والی آواز پہاڑیوں اور ڈھلوانوں کے درمیان ایک جادوئی سماں باندھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے وہ فراموش کر چکے تھے کہ وہ ایک آدمی کو مار کر اُس کی لاش کھائی میں پھینک چکے ہیں۔ ڈُھول بتاشوں کی آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔ وہ دونوں رُک گئے۔ نوجوان ساتھی ایک بار پھر کہنے لگا۔

”چلیں وہاں پانی بھی پئیں گے۔ دو چاپی (بلوچی لوک رقص) بھی دیکھیں گے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ دوسرے ساتھی نے کہا ”کیونکہ پیاس سے میری جان نکلی جا رہی ہے اور میرے پاؤں سو سو من بھاری ہو رہے ہیں۔“

پھر وہ اندھیرے میں ڈھول بتاشوں کی آواز کی جانب چلنے لگے۔ گاؤں کے آثار ابھی شروع نہیں ہوئے تھے۔ کسان کے خمیدہ ہل کی طرح آدھا چاند بھی اپنے منزل کی جانب محوِ سفر تھا۔ بوڑھا ساتھی آدھے چاند کی جانب دیکھتے ہوئے اپنے نوجوان ساتھی سے کہنے لگا۔

”دیکھو چاند بھی جیسے کسی نے دو حصوں میں کاٹ دیا ہے“

”کیا مطلب“ نوجوان ساتھی نے پوچھا

”میرا مطلب ہے کہ جیسے تم نے حاصل کی گردن کے دو حصے کئے بالکل اسی طرح کسی نے چاند کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔“ نوجوان قاتل کچھ نہیں بولا۔ اُس نے اپنا دل بوجھل محسوس کیا۔ جیسے کسی نے اُس کی سانس روک لی ہو۔ اُس نے اپنے بوڑھے ساتھی سے کہا۔ ”چھوڑو اس بات کو، کوئی اور بات کرو“ بوڑھے کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ کھیلنے لگی جس کو اندھیرے میں اُس کا نوجوان ساتھی دیکھ نہیں سکا۔

جب وہ گاؤں کے قریب پہنچے تو اچانک رُک گئے کچھ توقف کے بعد خاموشی سے گاؤں میں داخل ہو گئے ۔

یہ خانہ بدوشوں کی جھونپڑیوں اور خیموں کا چھوٹا سا گاؤں ڈھلوان کے کنارے آباد تھا۔ شاید گاؤں میں خوشی کا کوئی موقع تھا۔ کچھ خانہ بدوش نوجوان میراثیوں کے ڈھول بتاشوں کی لے پر رقص کر رہے تھے۔ وہ اپنے حال میں مست نظر آ رہے تھے۔ حالآنکہ رات کافی بیت چکی تھی اور اب صبح کے آثار شروع ہونے والے تھے لیکن ان کے رقص کا جنون ختم نہیں ہوا تھا۔ جب انہوں نے دونوں نئے مہمانوں کو دیکھا تو ان کو خوش آمدید کہا، خاطر مدارات کی۔ حقہ پانی کے بعد وہ دونوں بھی رقص میں شامل ہو گئے۔ ڈھول اور بتاشوں کی آواز زمین اور آسمان کو ایک کیے ہوئے تھی۔ دونوں قاتل ڈھول کی تھاپ پر رقص کر رہے تھے۔ رقص میں بدمست وہ اپنے ماضی اور مستقبل سے بے خبر نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے جس آدمی کو قتل کیا تھا وہ یہاں سے بُہت دُور ایک خشک گھاٹی میں منوں مٹی تلے دبا ہوا تھا اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ اُسے کس نے مارا ہے۔ ڈھول بتاشوں کی ایک باری ختم ہوئی تو دوسری باری ایک عالمِ سرمستی میں اونچی ہو گئی۔ جیسے کسی پر جن اور بھوت کا سایہ پڑا ہوا اور وہ زور سے چیخ و پکار کر رہا ہو۔ یہ ایک کیسی رات تھی کہ جس میں ان دو قاتلوں کو رقص کرنا تھا۔ دُنیا و مافیا سے بے خبر ہونا تھا۔ گاؤں والے تعجب میں پڑ گئے تھے کہ ان دونوں مہمانوں کو خدا نے دو چاپی اور رقص کی کیسی صلاحیت عطا کی ہے کہ وہ تھکنا بھی نہیں جانتے تھے۔ نہایت ہی مہارت اور کمال کے ساتھ رقص میں مشغول تھے۔ آخر میں گاؤں کے لوگوں نے خود رقص کرنا چھوڑ دیا تھا بس اُن دونوں ساتھیوں کے رقص سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ایک نہایت ہی بڑے پتھر پر بیٹھے گاؤں کا سرپنچ بیٹھا سوچ رہا تھا کہ خُدا نے اُن دونوں کو رقص کرنے کی کیسی نایاب صلاحیت عطا کی ہے۔ بوڑھا اور نوجوان دونوں نے مراثیوں کو تھکا دیا لیکن خود رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ وہ مسلسل رقص کیے جا رہے تھے جیسے آج کی رات اُنہیں رقص کرتے ہوئے اپنی جان جان آفرین کے سُپرد کرنا ہو۔

جب رقص کرتے ہوئے وہ حال سے بے حال ہو گئے تو لہر کی آخری ڈھول کی تھاپ اور شہنائی کی آخری ساز بھی رُک گئی تو وہ دونوں بے دم ہو کر گر گئے اور لوگوں نے تالیاں بجا کے انہیں داد دی۔

پھر ڈھول بتاشوں کا ہنگامہ ختم ہو گیا اور گاؤں والے اپنی جھونپڑیوں اور خیموں کی جانب چلے گئے تو وہ دونوں گاؤں کے ایک کونے پہ بنے ایک جھونپڑی کے سامنے لیٹ گئے۔ پَو پھٹنے سے کچھ پہلے، نو جوان قاتل

بوڑھے قاتل کے بستر کے پاس آیا اور اُس سے پوچھا:

‘‘ہم نے حاصل کو کیوں مارا؟’’

‘‘اُس لئے کہ وہ سیاہ کار تھا’’

‘‘کون کہتا ہے’’ نوجوان نے عجیب وغریب لہجے میں پوچھا جیسے ڈھول بتاشوں اور رقص نے اُس کے اندر چھپے حقیقی انسان کو جگا دیا ہو۔

‘‘یہ کیا سوال ہوا، کہیں تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟’’ بوڑھے ساتھی نے پوچھا۔

‘‘میں پاگل نہیں ہوں لیکن تم نے مجھے کیوں ساتھ لیا تھا؟’’

‘‘اس لئے کہ حاصل ہم دونوں کے گھر سیاہ کاری کا مرتکب ہوا تھا۔ اُس کا انجام سوائے موت اور کیا ہو سکتا ہے۔’’

‘‘مجھے اس سوال کا صحیح جواب چاہئے ورنہ میں تمھیں ماردوں گا’’ اُس نے بوڑھے کے سامنے اپنا خنجر لہرا دیا۔ بوڑھا ساتھی حیرت میں پڑ گیا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اُس نے اٹھنا چاہا لیکن نوجوان نے اُس کو اُٹھنے نہیں دیا: ‘‘تم اُٹھ نہیں سکتے’’

‘‘بے حیا’’ بوڑھے نے کہا ‘‘میں تمھارا چاچا ہوں’ تمھاری بہن کے ساتھ سیاہ کار ہونے والے شخص کو مارنے میں تمھارا ساتھ دیا ہے۔ میرے ساتھ اس طرح کا سلوک کر رہے ہو، تمھیں شرم آنی چاہیے’’

نوجوان ساتھی نے اپنا خنجر ہوا میں لہراتے ہوئے کہا ‘‘میری بہن سیاہ کار نہیں تھی، یہ ایک الزام ہے جس کا مجھے بے حد افسوس ہے، میں تمھیں مار کے رہوں گا، تمھیں زندہ نہیں چھوڑوں گا’’

‘‘آخر تمھیں ہُوا کیا ہے؟’’

‘‘مجھے کچھ نہیں ہوا، لیکن تمھیں مرنا پڑے گا’ بوڑھا ساتھی اُس کی منّت سماجت کرتا رہا، دھونس دھمکی دیتا رہا لیکن اس سے پہلے کہ کسی اور کو خبر ہوتی نوجوان ساتھی کا خنجر اُس کے دل میں اُتر گیا۔ اس کے بعد نوجوان نے یہی خنجر اپنے سینے میں اُتار دیا۔

صبح ڈھول بتاشوں کی خوشیوں کے بعد گاؤں کے لوگوں نے اُن کے جنازے اُٹھائے۔ گاؤں والوں کے لئے اب بھی یہ ایک سربستہ راز تھا کہ ڈھول بتاشوں کا انجام اس طرح کیوں نکلا۔؟

☆☆☆☆

بلوچی تخلیق و ترجمہ: غنی پہوال

تحفہ

جب رستے میری آنکھوں میں
انگڑائیاں لے کر بیدار ہو رہے تھے
میں تیری آواز کا تعاقب کر رہا تھا
خواہشوں کے کارواں
مجھے پیڑ بنانے والی روشنی سے تکنے لگے
تو میں نے اپنا سایہ
اسکول سے لوٹے ہوئے بچے کے
گراں بار بستے کی طرح
زمین پر پھینک دیا
خیمے اُگتے رہے
اور خیموں نے سانپوں جیسی بل کھاتی
گلیوں کو جنم دینا شروع کیا
اچانک مجھے تیری آواز یاد آ گئی
مسافتیں میرے اندر رینگتی رہیں
اور میں باہر بھٹکتا رہا

جس وقت تیری آواز
میرے پسینوں سے بھیگ گئی
اور میں تیری آواز میں ہانپنے لگا
تو اپنے سائے کی تلاش میں واپس لوٹا
تو ہَوا خیمہ اور گلیاں، پیڑ اور سایہ
اپنے کسی دوست شہر کوٹھے میں بھیج چکی تھی

☆☆☆☆

سعید اختر
سرائیکی سے ترجمہ: خورشید ربانی

پریت

بن جا پریت کا تو پیغمبر
پریت کی ریت نبھا
جیسے جیسے رائج ہو گی
پریت کی سچی ریت
ہو جائے گی جیت

پھل

بیج کو بو کر
پانی ڈالا
رکھا پل پل دھیان
پودا نکلا
اکھوا پھوٹا
پھیلا پھولا درخت
ٹہنی ٹہنی بخت

☆☆☆☆

مخمور قلندری

سرائیکی سے ترجمہ: شہاب صفدر

ماما حقو

روز صدا آتی ہے اس کی
دن چڑھنے سے پہلے پہلے
چاہے ابر ہو چاہے کہرا
غربت سے دو ہتھوڑا نے
منڈی کے رخ چل پڑتا ہے
پھر بے چارہ
در در پھرتا مارا مارا
رزق تلاشتا رہ جاتا ہے
روتا ہنستا رہ جاتا ہے
ایک اک کنبہ اس کی راہ میں
رکھتا ہے گرم اپنا چولہا
ماما حقو
سبزی والا
بچوں کو جھڑ بیر کھلاتا

ہے بس ایک ہی تان لگاتا
آؤ سستی سبزی لے لو
روز کسی دیوار سے لگ کر
میں ہوں فکر میں غوطے کھاتا
جانے کتنے مامے حقو
بھوک سے بازی ہر جاتے ہیں
تان لگاتے مر جاتے ہیں

☆☆☆☆

سرائیکی تخلیق وترجمہ: ڈاکٹر گل عباس اعوان

تکمیل

عورتوں کی ایک عادت بڑی عجیب ہے، وہ یہ کہ جب کوئی دوسری عورت انکے سامنے اپنے بچوں کی شرارتوں کا ذکر کرنے بیٹھے، تو وہ اپنے بچوں میں دنیا جہان کی تمام شرارتیں بیان کرنے لگیں گی اور اگر وہی عورت اپنے بچے کی خوبیاں بیان کرنے لگے تو وہ اپنے بچوں سے وہ خوبیاں بھی منسلک کریں گی، جو ان کے باپ دادا میں بھی موجود نہیں ہوں گی۔

سانول کی ماں بھی اس کی اسی طرح تعریف کیا کرتی تھی، پر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، سانول کی تعریف کے علاوہ اسکی ماں کی بے بسی بھی نمایاں ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اب شبانہ کے چلے جانے کے بعد، سانول کو جھڑکا بھی کرتی تھی۔ وہ اکثر بے بسی سے کہتی، سانول! تمھیں کیا ہو جاتا ہے۔ شبانہ کو دیکھتے ہی تم اپنا آپ بھول جاتے ہو۔ مجھے تو بعض اوقات یوں لگتا ہے کہ اسے دیکھتے ہی تم مجنوں سے ہو جاتے ہو۔ پر پانچ سال کے سانول کو ماں کی باتوں کی کیا سمجھ آتی۔

وہ صرف یہی جانتا تھا کہ شبانہ اسکی خالہ زاد (مسات شبو) ہے جو محض اسکی وجہ سے اس گھر میں آتی ہے۔ اور اس کے ساتھ کھیلنا چاہتی ہے۔ لہذا، جب بھی شبانہ ان کے گھر آتی وہ سارے کام چھوڑ اس کے ساتھ سل سا جاتا تھا۔ جتنا وقت شبانہ (شبو) اس کے گھر رہتی، وہ اس کی ہر فرمائش پوری کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ اس کے ساتھ شاپو کھیلتا۔ گو کہ اسے ”گیٹے“ کھیلنے نہیں آتے، پھر بھی وہ اس کے ساتھ کھیلتا۔ وہ مشکل گیٹے ”گٹے“ کو ہاتھ کے نیچے سے گزار نہ سکتا اور ہار جاتا، پر سچ تو یہ ہے کہ اسے اس ہار میں بھی مزا آتا۔

شبانہ (شبو) ”رتے“ پر سے اُچھلتے ہوئے بہت خوشی محسوس کرتی، سانول اس کے جانے کے بعد، ایک ایک چیز کو سنبھال کر رکھتا۔ اور دوسرے دن شبانہ (شبو) کے آتے ہی، اس کے مانگنے یا پوچھنے سے قبل ہی وہ چیزیں لا ”حاضر“ کرتا۔ اس کے جانے پر، چیزیں سنبھال سنبھال کر رکھتے وقت، وہ یوں محسوس کرتا، جیسے شبانہ (شبو) اس کے گھر ہی رہ رہی ہو۔ اور وہ شبانہ (شبو) کو دنیا والوں سے چھپا کر، اپنے پاس رکھ رہا ہے۔

وقت گزر تا گیا۔ وقت نے کب کسی کے ساتھ وفا کی ہے۔ بیس سال بعد تو، رشتوں کی لغت ہی بدل جاتی ہے۔ بہتے دریاؤں کا پانی، سمندروں سے جا ملے، تو واپس نہیں لوٹتا۔ پر سانول کے دل کی دھڑکن شبانہ (شبو) کو دیکھتے ہی تیز ہو جایا کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ خیالات کی دنیا حقیقی دنیا سے زیادہ دلکش ہوا کرتی ہے۔ پر شبانہ (شبو) تو اس کے خیالات سے بھی زیادہ حسین تھی۔

جب کبھی شبانہ (شبو) کوئی میٹھی نمکین بنی ہوئی چیز پلیٹ میں ڈال، اس کے گھر دینے آتی تو اس کی خواہش ہوتی کہ وہ پلیٹ سانول کے ہاتھ میں تھمائے، اور سانول اس کے ہاتھ سے پلیٹ لے کر اس سے پوچھے مسات! (اری کزن) کیا لائی ہو۔ اور اس کے جواب دینے سے پہلے ہی سانول، اپنی ماں سے کہتا کہ اماں! ہم بھی برتن خالی نہیں بھیجیں گے۔ اماں! سویاں پکا دینا، میں خود خالہ کے گھر دینے جاؤں گا۔

جب سانول کی ماں گھر نہیں ہوتی تھی تو واقعی سانول پلیٹیں تھام لیتا، مگر شبانہ (شبو) کے ہاتھ سے پلیٹیں لیتا نہیں تھا۔ دونوں کافی دیر تک پلیٹیں تھامے کھڑے رہتے۔ محسوسات کی رو، برقی رو کی طرح پلیٹوں میں گزرتی ہوئی، ان کے جسموں میں سرایت کرتی رہتی۔ کچھ دیر بعد سانول پلیٹیں لے لیتا تو شبانہ (شبو) اپنے دوپٹے کے پلو، مروڑتی رہ جاتی۔ سانول ان ہونی کی دعائیں مانگتا ہمیشہ یہی کہتا کہ کاش وقت رک جائے۔ پر وقت نے تو گزرنا ہے، اور وقت کسی کے ساتھ وفا نہیں کرتا۔

سانول کی ماں، اس ساری صورتحال سے بخوبی واقف تھی۔ وہ سانول سے اکثر کہا کرتی کہ تمہارا خالو، ہمیں اچھا نہیں سمجھتا۔ وہ کبھی بھی شبانہ (شبو) کا رشتہ ہمیں نہیں دے گا۔ وہ اکثر سانول کو سمجھاتی کہ تمہارا خالو اکرم بہت لالچی شخص ہے، وہ شبانہ (شبو) کا رشتہ اپنے بھائی کے گھر کرنا چاہتا ہے تاکہ وٹے سٹے کی صورت میں دونوں بھائیوں کی زمینیں ان کے اپنے پاس رہیں۔

پھر، یوں ہوا کہ شبانہ (شبو) کا نکاح لالو کے ساتھ ہو گیا۔ سانول وقت کو نہ روک سکا اور نہ ہی اپنے دل کی دھڑکن کو۔ اس مرتبہ شبانہ (شبو) خود سویاں پکا کر، خالہ تاجو کے گھر آئی تو سانول نے آگے بڑھ کر پلیٹیں نہ تھامیں۔ محض شبانہ (شبو) کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہ گیا۔ شبانہ (شبو) کی آنکھیں، اسے اعتبار کے سارے پیغام دے رہی تھیں، مگر سانول کی آنکھوں کا سیلاب ہر چیز، بہائے لے جا رہا تھا۔ آج شبانہ (شبو) سے کسی نے نہیں کہا تھا کہ "برتن خالی نہیں جائیں گے۔"

شبو، خالی برتن تو لے آئی، مگر اس کی امیدوں کے برتن بھرے ہوئے تھے۔ شبانہ (شبو) اب بھی خالہ

کے گھر آتی تھی۔ کبھی کبھار سانول بھی گھر پہ ہوتا تھا، مگر اب وہ آگے بڑھ کر شبانہ (شبو) کے ہاتھ سے برتن نہیں لیتا تھا۔۔۔ پھر شبانہ (شبو) کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ آج وہ جان بوجھ کر اس وقت آئی، جب سانول گھر پہ تھا۔ گھر میں سب موجود تھے، مگر اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ وہ پلیٹیں لے کر سیدھی سانول کے پاس گئی۔ اور جاتے ہی کہا کہ سانول آ! میری جان بھی تمہاری ہے اور میرے سانس بھی۔ میری ایک ارداس ہے کہ میری امیدوں کے برتن کبھی خالی نہ ہونے دینا۔ یہی بات کہہ کر، وہ فوراً واپس چلی گئی۔

سانول، کو یوں لگا، جیسے وقت رک گیا ہو۔ پلیٹوں کے دوسرے سرے پہ شبانہ (شبو) کے ہاتھ ہوں۔ اور ایک برقی لہر، دونوں کے جسموں سے گزر رہی ہو۔ پھر وہ دن بھی آگیا، جب شبانہ (شبو) سسرال گھر جا پہنچی۔ اور ایک دن سانول بھی دلہا بن گیا، دلہن لے آیا۔ شبانہ (شبو) ایک مرتبہ سانول کی شادی کے بعد، ساگ پکا کر لے آئی، پر، جس وقت سانول کی بیوی "جندو" نے یہ کہ کر شبانہ (شبو) سے ساگ کا کٹورا لے لیا کہ اب برتن میرے ہاتھ دیا کرو، تو شبانہ (شبو) پھر کبھی کوئی چیز خود دینے نہ آئی۔ ہاں البتہ پندرہ سال بعد بھی، وہ کسی نہ کسی بہانے، کوئی نہ کوئی چیز، پکا کر سانول کے گھر بھجوا دیتی۔ اور سانول بھی اپنے بچوں کے ہاتھ کوئی نہ کوئی شے، بنوا کر بھجوا دیتا تھا۔

اب شبو (شبانہ) بن چکی تھی۔ اس کے تین بچے تھے۔ سانول بھی پچاس کے پیٹے میں تھا۔ شبو کے بال تو پہلے ہی چمکیلے تھے، مگر اب کھری چاندی کی طرح چمکتے تھے۔ زندگی خاموشی سے اپنے اپنے راستوں پر رواں دواں تھی کہ ایک دن ریسکیو 1122 کی گاڑی الارم بجاتی آ پہنچی۔ مائیک سے نوجوان آفیسر عنایت بلوچ کی آواز بلند ہو رہی تھی، وہ اعلان میں بار بار اپیل کر رہا تھا کہ خدا کے لیے، یہ بستی میرانی خالی کر دو۔ ایک عظیم سیلاب آ رہا ہے۔ آپ کے وہم و گمان سے بھی بڑا سیلاب آ رہا ہے۔ ایسا سیلاب آپ کے بزرگوں کے زمانے شاید 1916ء میں یا 1929ء میں آیا ہوگا۔ بستی خالی کر دو۔

نشیبی علاقے کے لوگ، صدیوں سے دریا کی دھمکیاں بھی سنتے آئے ہیں اور ان دھمکیوں کا مقابلہ بھی کرتے رہے ہیں۔ لہذا انہوں نے نوجوان آفیسر عنایت بلوچ کے اعلان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ البتہ جب 28 جولائی 2010ء کی رات سیلابی ریلہ لیہ کی حدود میں داخل ہوا تو یہاں کے لوگوں کو اس بات کا ضرور اندازہ ہوگیا کہ اب کی مرتبہ دریا کے تیور غضب ناک ہیں۔ اگست 2010ء کے پہلے ہی ہفتے بستی کی تقریباً 90 فیصد آبادی نقل مکانی کر گئی تھی۔ سانول کے گھر والے بھی لیہ شہر آ گئے، مگر سانول ابھی تک اپنے گھر

کے تھلے (چبوترے) پر ٹکا ہوا تھا۔

ایک صبح جب وہ اپنے تھلے پر بیٹھا ہوا تھا اور، اُس کی نگاہ مسلسل سامنے والے تھلے کا (چبوترے) کا طواف کر رہی تھی، یکدم اسے نظر آیا کہ اکرم، لالو، شبو اور ان کے گھر والے، اپنے چبوترے سے اتر کر، پانی میں اتر آئے ہیں۔ سانول نے مڑ کر اپنے گھر کی طرف نہ دیکھا۔ وہ دروازے کھلے چھوڑ، پانی میں اتر گیا۔ جب یہ لوگ گھر کے سامنے والی سڑک پر چڑھے تو، پانی گھٹنوں گھٹنوں اور کہیں کہیں کمر کے برابر تھا۔

میرانی قدیم کے اسکول سے پانی میں تیزی آنا شروع ہوگئی۔ اکرم لالو اور شبانہ کے ہاتھ میں ایک ایک بچہ تھا۔ سانول نے ان کے دوٹرنگ، سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ اکرم نے سب کو آواز دے کر کہا، سنبھلنا۔ دریا (کمے) اپنے جوبن پر ہے۔ “کما” بڑے دریا سے نکلنے والا ایک نالہ تھا، جو طغیانی کے دنوں میں بہہ نکلتا اور آج کما دریا، بن ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ سب لوگوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ لیے۔ سانول اور شبو ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ شبو، نے سانول کے چولے کا پلو، پکڑ لیا۔

اس لمحے بوڑھے اکرم کا پاؤں پھسلا تو شبو کے بیٹے کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ بچے نے چلا کر کہا اماں! غیر تیراک شبو نے ایک مرتبہ مڑ کر سانول کو دیکھا اور بچے کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔ سانول نے بھی ٹرنگ پھینکے اور اس نے بھی شبو کے پیچھے چھلانگ لگا دی۔

بچے کو تو فوراً بچا لیا گیا، مگر سہ پہر تک شبو اور سانول کی لاشیں نہ ملیں۔ شام کے وقت ریسکیو 1122 کی ٹیم نے دونوں لاشوں کو اس حالت میں نکالا، کہ سانول نے شبو کو کمر میں ہاتھ ڈال کر یوں اٹھایا رکھا تھا، جیسے دولہا، دلہن کو کجاوے سے اتارتا ہے۔ شبو کی بھی دونوں باہیں سانول کے گلے میں تھیں، جیسے وہ، سیج پر سکون نیند سو رہی ہو۔

ساری بستی میں باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کچھ نے کہا کہ ماں تو ماں ہوتی ہے۔ اس نے تو ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر، جان قربان کر دی مگر سانول نے تو، خودکشی کی، کچھ کا کہنا تھا کہ دونوں نے خودکشی کی، پر سانول کی بیوی کا کہنا تھا کہ سانول نے خودکشی نہیں کی، بلکہ اس نے تو اپنی ذات کو ڈھونڈ لیا ہے اور آج تو اس کی تکمیل ہوئی ہے۔

☆☆☆☆

پروفیسر عبدالرزاق صابر

براہوئی سے ترجمہ: مان منصور

پالش کرنے والا بچہ

کم تر و ناتواں مرے کاندھے
ان پہ بارِ گراں حیاتی کا
اپنے ہم عمر دیکھتا ہوں میں
جن کو فرصت نہیں ہے بازی سے
سخت گرمی ہو دن کی، یا سردی
ایک فٹ پاتھ پر بسیرا ہے
چلتے لوگوں کو دیکھتا ہوں میں
ان کے پاؤں میں میرے مدِ نظر
خوش میں ہوتا ہوں دیکھ کر جوتے
جو کسی پاؤں میں پرانے ہوں
یہ مری عمر اور مشقت کو
سب ہی دیکھیں مگر نہیں پُرسش
باپ کا سایہ کتنا اچھا ہے
شرط یہ ہے کہ وہ نہ ہو بیمار

کاش ہوتا میں یکسر و تنہا
اپنے لقمے کی فکر سے آزاد
پانچ افراد کو کھلاتا ہوں
اچھے کھانے کو جو ترستے ہیں
صبح سے شام تک کی محنت کو
سب کے سب بے بسی سے کھاتے ہیں
جب کبھی سوچنے میں لگتا ہوں
محوِ حیرت ہوں زندگانی پر
کیا اسی واسطے ہوا پیدا
صبح اٹھوں اور آ کے دیکھ لوں میں
اپنا چہرہ کسی کے جوتوں میں

☆☆☆☆

امیر الملک مینگل

براہوئی سے ترجمہ: مان منصور

قطرہ

سمندر کی موجیں بپھرے ہوئے اونٹ کی طرح ساحل پر چڑھ کر دوڑتیں لیکن ساحل کی نرم وملائم ریت سے ٹکرا کر اپنا غصہ فراموش کر لیتیں۔ ساحل پر موجود نرم ریت گویا ان موجوں کا غصہ جذب کر رہی تھی اور موجیں شانت ہو کر سمندر کی جانب مڑ جاتیں۔ ایک روز انہی موجوں میں سے ایک قطرہ الگ ہو گیا۔ ششدر و حیران، یہ اس کی زندگی میں ایک بہت بڑی ساعت تھی۔ اپنی زندگی میں وہ پہلی بار سمندر سے الگ ہوا تھا۔ اپنا وجود اسے عجیب محسوس ہونے لگا۔ آج سے قبل تو وہ خود سمندر ہی تھا۔

ساحل کی ریت نے اسے خوش آمدید کہا اور وہ ریت کی اس محبت سے بہت متاثر ہوا۔ یہاں اسے بہت سکون اور آرام میسر تھا۔ اپنے ازل سے بے نیاز۔ وہ چاہتا تھا کہ قیامت تک وہ یہیں رہے۔ لیکن جب سمندر کی موجیں خاموش ہو گئیں اور سورج طلوع ہوا۔ اسے ایسے محسوس ہوا کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے جس کے باعث سورج غیض وغضب سے اسے دیکھ رہا ہے۔ ریت اسے نہیں جچتی۔ سورج کی تمازت سے یہی نرم ریت اتنی گرم ہو گئی کہ ننھا قطرہ اس کی تپش برداشت نہیں کر سکا اور قطرے سے بھاپ کی شکل اختیار کر گیا۔ اس کا ہلکا سا وجود اب ہوا کے رحم وکرم پر تھا اور اوپر اٹھتا گیا۔ اس کی زندگی کا یہ دوسرا بڑا واقعہ تھا جو زمین سے اوپر آ کر خلا میں معلق ہو گیا۔ سمندر اور ریت دونوں اس سے پیچھے رہ گئے۔ آج وہ ایک قطرہ نہیں رہا تھا اس کی ہستی ختم ہو چکی تھی اب وہ بھاپ بن چکا تھا۔ اور ہوا کے دوش پر سوار کبھی مشرق کو جاتا تو کبھی مغرب کو۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی منزل کہاں ہے۔ ہوا کے تھپیڑے سہتے ہوئے وہ ایک بڑے طوفان میں سما گیا تھا۔ وہ بادلوں کا حصہ بنتے ہوئے پھر سے ایک قطرہ بن گیا اور بارش کی صحبت میں ایک بار پھر زمین کی جانب لڑھک گیا۔ وہ اس تیزی سے نیچے آ رہا تھا کہ اب نہ سمندر اسے پہنچ پا رہا تھا نہ ہی زمین۔ وہ زمین کی جانب آ رہا تھا گویا ہوا اس سے ناراض اور بادل اس سے گریزاں تھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ واپس ریت کی نرم وملائم گود میں جا گرے گا مگر وہ

حیران ہوا کہ اس بار اس کی جگہ ریت نہیں بلکہ ریت سے بھی ملائم اور نازک جگہ اسے ملی۔ وہ ایک پھول پہ جا گرا۔ جہاں اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ کسی خوبرو دوشیزہ کے خوبصورت عارض پر ایک آنسو ہے۔ اسے دفعتاً خیال آیا کہ میں کیا ہوں؟ کہاں سے آیا؟ میری منزل کہاں ہے؟ وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ وہ ریت کی رفاقت اور سورج کی تمازت کو یکسر فراموش کر گیا۔ ہوا کی بے رخی بھی وہ بھول چکا تھا۔ اب پھول نہیں رہا تھا اور وہ مسرت سے چور تھا۔ آخر کیوں نہ ہو اب اس کی مشقت کا ثمر مل چکا تھا۔

لیکن یہ خوشیاں اور مسرتیں فقط لمحہ بھر کی تھیں۔ سورج ایک بار پھر اپنی غضب ناک تمازت لیے طلوع ہوا۔ پھول نے سر اوپر اٹھایا اور اس کی پتیاں لرزنے لگیں۔ وہ قطرے سے الگ نہیں ہونا چاہتا تھا مگر کوئی کچھ نہیں کر سکا۔ وہ قطرہ جو اس کی خوشیوں کا سبب بن کر آیا تھا اب اس سے الگ ہو رہا تھا۔ وہ پھر ایک بھاپ بنا اور ہوا کے دوش پر سوار ہو کر اپنی منزل سے بے خبر بے سمت راہی کی طرح رواں دواں تھا۔

اس بار ہوا اسے ایک سرد علاقے میں لے گئی جہاں بادل بھی منجمد تھے۔ قطرہ ان کی صحبت سے رنگتے ہوئے جم گیا اور بھاپ سے برف بن چکا تھا۔ اس کا رنگ الہڑ دوشیزہ کے سفید دانتوں کی طرح سفید ہو گیا۔ اب وہ خود نازک پیکر میں ڈھل چکا تھا۔ گویا ہاتھ لگاتے ہی ختم ہو۔

ہوا پر اس کا بوجھ پھر گراں ثابت ہوا اور وہ بلندی سے پستی کی جانب آیا۔ مگر اس بار نہ وہ پھول کی پتی پہ گرا نہ ہی ریت کے سینے پہ۔ ایک پتھر نے اس بار اسے سینے سے لگایا۔ نرم و نازک برف کے قالب میں ڈھلے قطرہ کو ایک سخت پیکر پتھر نصیب ہوا تھا۔ وہ بہت ناامید ہو گیا اس کی ساری خوشیاں غارت ہو گئیں۔ وہ یہاں سے راہِ فرار کی سوچ رہا تھا مگر وہ لاچار و بے بس تھا۔ اب اس کی مدد کے لیے پھول آ سکتا تھا نہ ہی ہوا۔ اب وہ سورج کا انتظار کرنے لگا۔ وہ سورج جو قطرے کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ آج وہی سورج اسے اس اذیت سے نجات دلا سکتا تھا۔ بالآخر سورج طلوع ہوا۔ چار جانب فضا گرم ہو گئی منجمد قطرہ پگھل کے اصل روپ میں آ گیا۔ بھاپ بن کر ہوا سے بغل گیر ہوتے ہوئے وہ جنوب کے بادلوں میں جا کے گم ہو گیا۔ پھر قطرہ بنا اور نیچے اپنی منزل کی جانب سفر شروع کیا۔ زمین، پھول، ریت، پتھر سب کہاں چلے گئے یہ سب کیا تھا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پایا۔ کیونکہ وہ سمندر میں گر چکا تھا اور خود سمندر بن چکا تھا۔ یہی اس کی منزل تھی جبکہ اس نے کبھی ریت کو اپنی منزل جانا تھا تو کبھی پھول کی پتی کو۔

☆☆☆☆

پروفیسر ارشد علی

کوجری سے ترجمہ: غلام سرور رانا

ماں

تُو تو کہتی تھی
چھت پر کوا بول رہا ہے
تمہارا باپ شہر سے آئے گا
تمہارے لیے میٹھی چیزیں لائے گا
پر ماں
اب دیکھ لو
ہمارا باپ تو کوئی نہیں آیا
چھت پر بیٹھا کوا
میرے ہاتھ سے
روٹی لے کر بھاگ گیا

☆☆☆☆

پروفیسر ارشد علی

گوجری سے ترجمہ: غلام سرور رانا

جادوگر

ایک جادوگر نے
رستہ بھولی ہوئی
ایک لڑکی سے کہا
لڑکی میری بات مان لو
نہیں تو تجھے بندر بنا دوں گا
پھر اُس لڑکی نے جادوگر کی بات مان لی
اور اُس کے اشاروں پر
بندر کی طرح ناچنے لگ پڑی

☆☆☆☆

ہندکو تخلیق و ترجمہ: محمد حنیف

جنگل میں

کبھی ہم *اُکلوں چنیں اور کبھی بھیڑیں چرائیں
کبھی ہم ایک دوسرے کو کنکر ماریں
کبھی ہم روٹھنے کی اداکاری کریں
کبھی ہم چرتی ہوئی بکریوں کا دودھ پئیں
کبھی ریت چھانیں
کبھی ہم کسی اونچی پہاڑی پر بیٹھ کر
درختوں سے باتیں کریں (اپنا اپنا غم غلط کرنے کے لئے)
کبھی کسی اونچی چٹان پر بیٹھ کر
ہم ایک دوسرے کو اپنے اپنے خواب سنائیں
کبھی ‘‘قینچی’’ گائیں
بھیڑوں، بکریوں اور درختوں کی باتیں کر کر کے
ہم وقت گزاریں
کبھی ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر کھائیوں میں سے گزریں
کبھی ہم کسی ویران ٹھارے میں بیٹھ کر
سارا سارا دن گپیں لگاتے رہیں

---

* ایک جنگلی پھل سنبل کی شکل کا

اور اپنی جیبوں سے سوکھی روٹیاں نکال کر کھائیں۔
اور جب بارش ہو تو بھاگ کر کسی چٹان کی پناہ لیں
کبھی بھیڑوں کے بچوں کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر دوڑیں
ہنستے کھیلتے ہوئے اپنی عمریں گزاریں
جنگل میں رہ کر
ہم یوں ماحول سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کریں

☆☆☆☆

HASHIM
USMAN

سخن کے باب میں کچھ اہتمام چاہیے ہے (حمد و نعت)

تیرا جمالِ رُخ مرے فن کی اساس ہے (غزلیات)

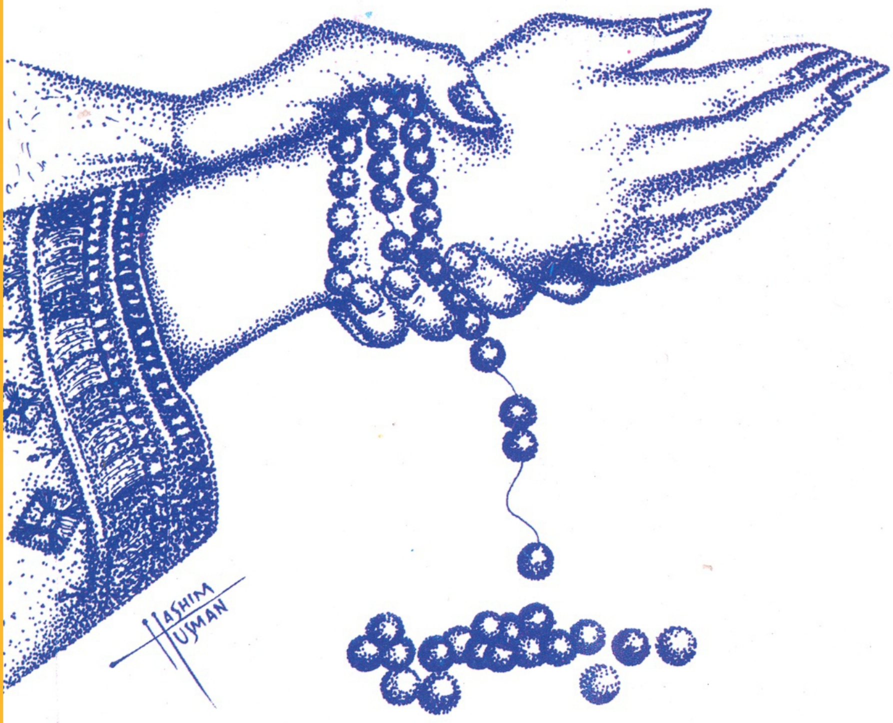
HASHIM USMAN

اک فسانہ ترے عنوان میں رکھا ہوا ہے (افسانے)

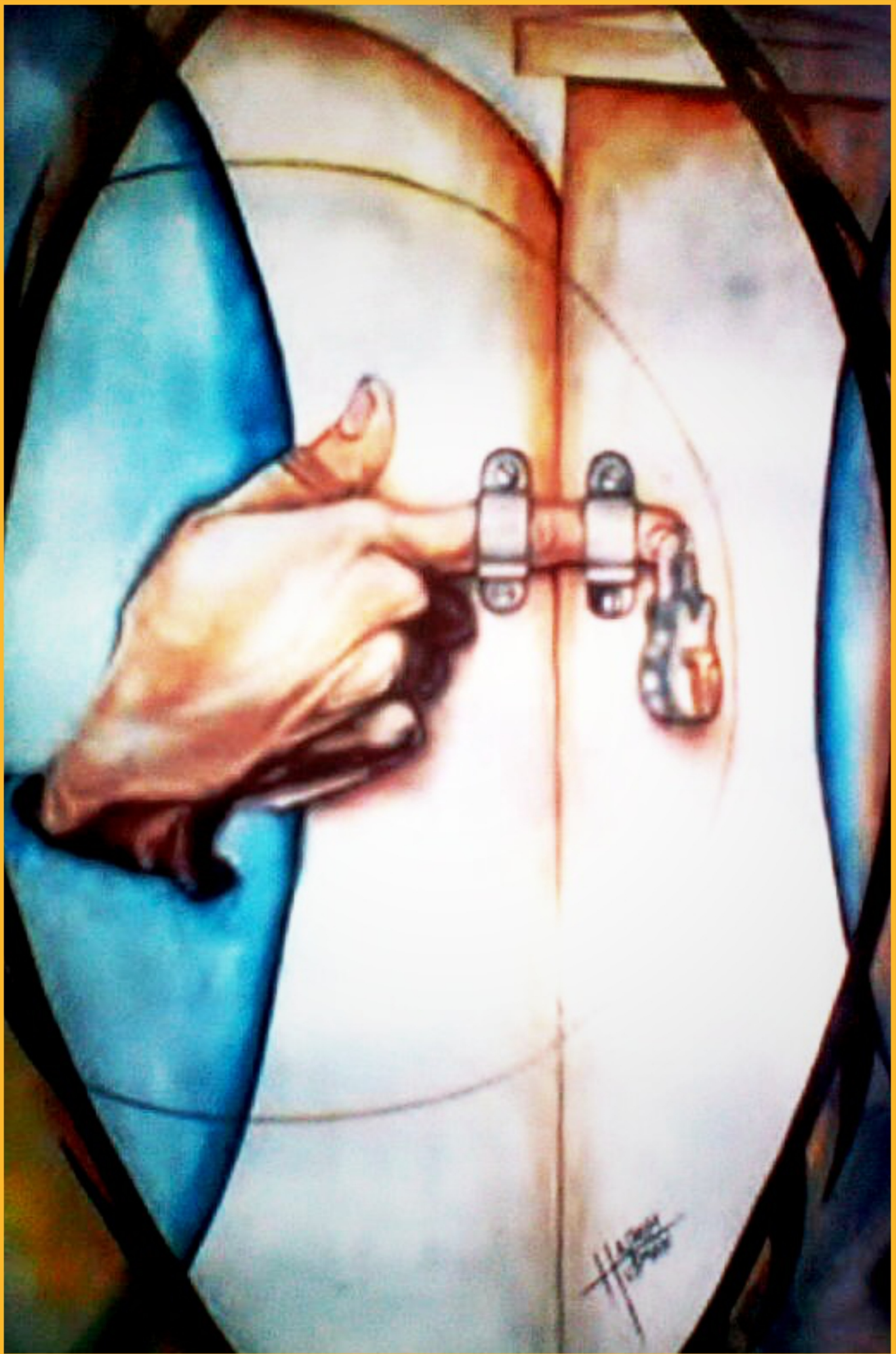

میں سرگزشتِ سفر آپ ہی سناؤں گا (خودنوشت/خاکے)

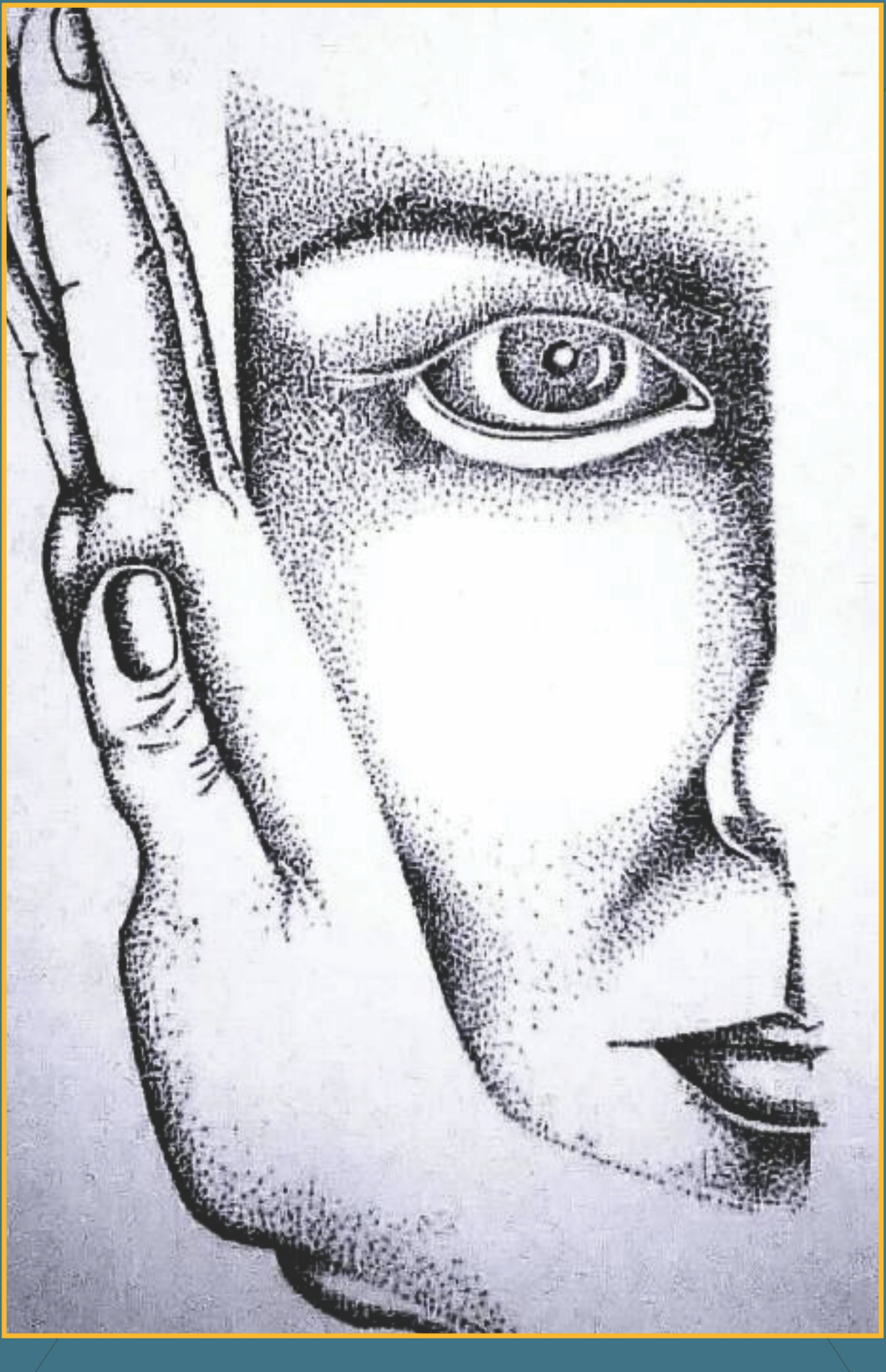

زبانِ کلک و صریرِ خامہ میں بولتا ہوں (تحقیق و تنقید)

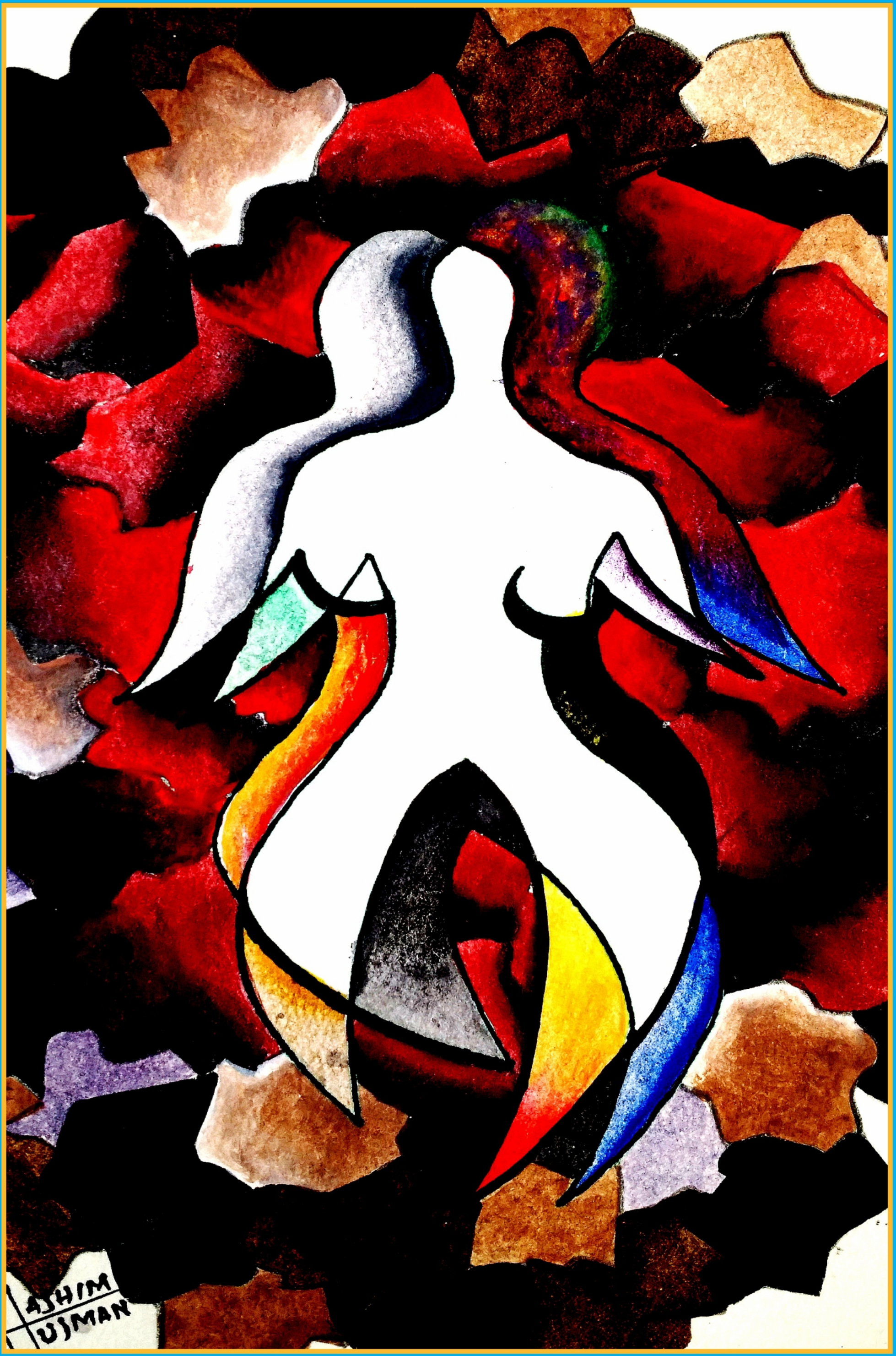

ہمیں کچھ اور ہی قصہ سنایا جا چکا ہے (عالمی ادب)

ستاروں سے بلندتر بنادیا مجھے (خصوصی گوشہ: فروغ فرخ زاد)

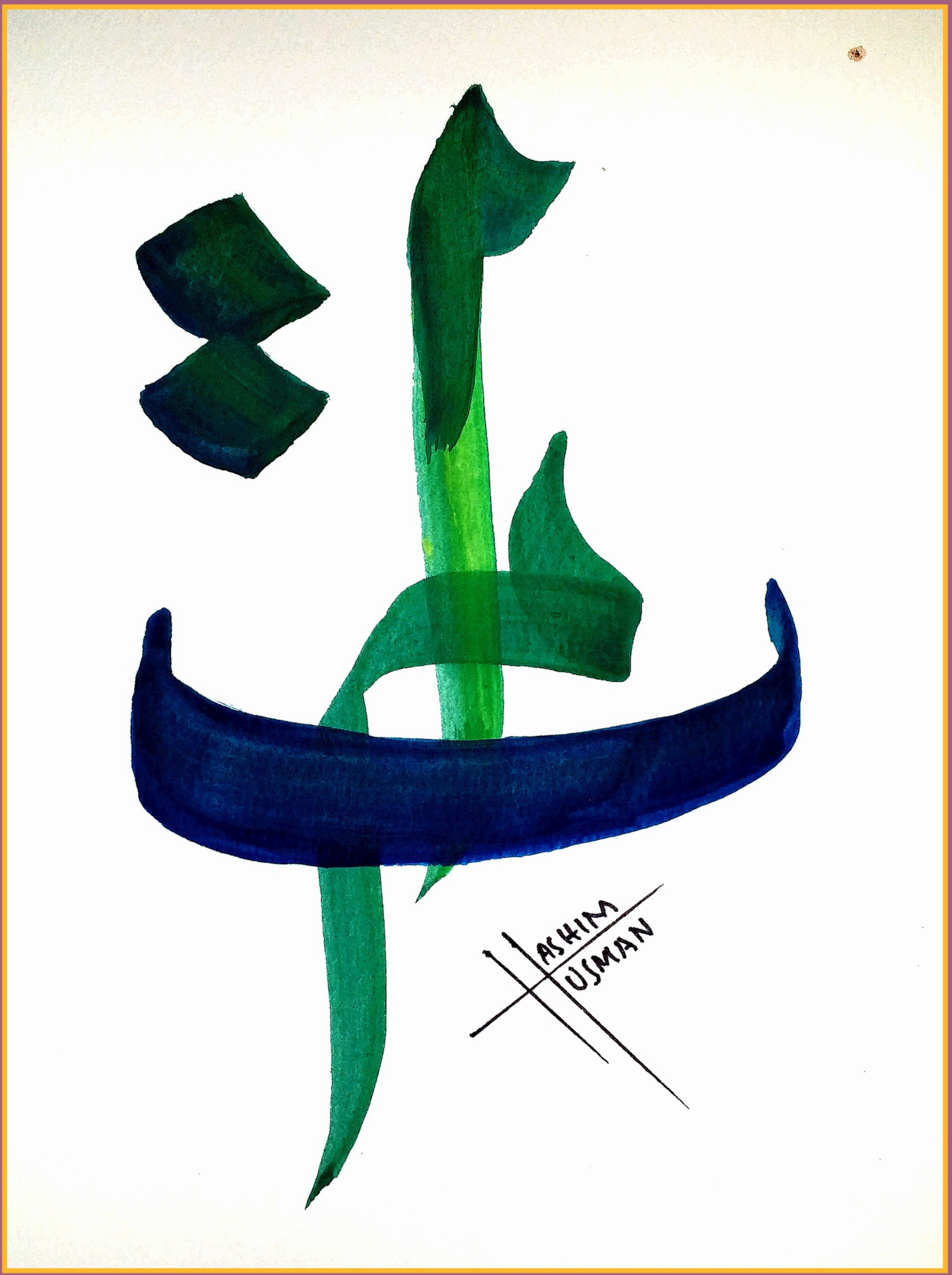
HASHIM
USMAN

کوئی سنانے کو میں داستاں بنا لوں گا (پاکستانی زبانوں کے تراجم)

Quarterly **Adabiyaat** Islamabad
April to June 2015
ISSN: 2077-0642

انتخاب پاکستانی ادب کے سلسلے کی تازہ کتابیں

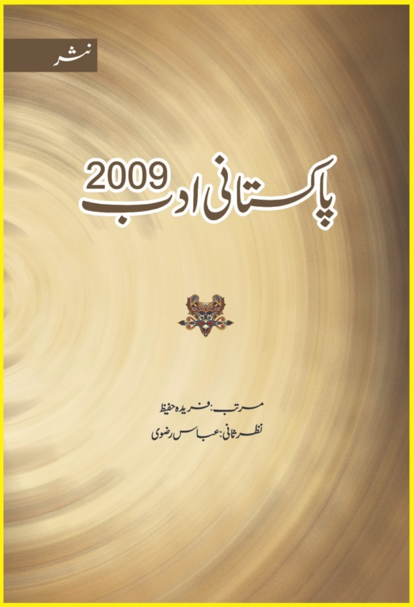

نثر

پاکستانی ادب 2009

مرتب: فریدہ حفیظ
نظرِ ثانی: عباس رضوی

شاعری

پاکستانی ادب 2009

مرتب: افتخار یوسف
نظرِ ثانی: ڈاکٹر انور سدید

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS
Patras Bukhari Road, H-8/1
Islamabad, Pakistan
Phone: +92-51-9269721, 9269714
Website: www.pal.gov.pk -email: adabiyaat@pal.gov.pk